

۱۹۷۰ء کے منتخب افسانے

مرتب
ناصر زیدی

ناشر: مکتبہ میریولائیبریہ، لاہور ۲

حق اشاعت دائمی بحق مکتبہ مریہ لاہور بمطبعہ

ناشر: بشیر احمد چودھری ڈائریکٹر مکتبہ مریہ لاہور

طابع: پاکستان ٹائٹلز پریس لاہور

بار اول: ۱۹۷۲ء

ترتیب

۷	ناصر دیدی	سید حسبات	۰
۹	عصمت چغتائی	اللہ کا فضل	۱ -
۲۲	احمد ندیم قاسمی	لادنس آف تیلیبیا	۲ -
۱۴۲	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	منہکار	۳ -
۵۵	استقرار حسین	وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے	۴ -
۳۹	جیلانی بانو	بہار کا آخری گلاب	۵ -
۱۵۸	نصیر انور	سواد	۶ -
۱۶۸	مسعود مفتی	واپسی	۷ -
۶۵	الطاف فاطمہ	نیون سائنسز	۸ -
۱۹۱	حکیم غریب	حجشتی	۹ -
۷۷	مسعود اشعر	آنکھوں پر دھندل ہاتھ	۱۰ -
۲۲۳	رفیعہ فصیح احمد	بڑیاں	۱۱

۹۲	نویز یا نغم	دریپ	- ۱۲
۲۴۲	پروین سرور	سراب	- ۱۳
۲۹۲	سی-ایل-کادش	اُس بازار سے	- ۱۴
۲۶۶	لطیف کاشمیری	رسل جو	- ۱۵
۱۱۵	نگہت مرزا	ما تم یک شہر آوند	- ۱۶
۱۳۱	مشرف احمد	رشتہ	- ۱۷
۲۷۷	نگہت لغاری	مس عاصمہ حبیب	- ۱۸

سیدھی بات!

لیجئے ۱۹۷۷ء کے منتخب انشافوں کے ساتھ پھر حاضر ہوں۔ سال پہلے انشافوں کے انتخاب کی روایت کسی بہت بڑی ادبی افادیت کی حامل ہو یا نہ ہو، میرے لئے ایک گونا گونا بخش ضرور ہے۔

جب میں ادب کے خوش ذوق قارئین کے لئے اردو کی نثری ستھری اور نثری ہوتی گمانیاں چنتا ہوں تو میری باطنی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے میں سے کوئی بہت اہم خدمت انجام دی ہے۔

جی ہاں! انسانے کا انتخاب میرے نزدیک بڑی اہم خدمت ہے۔ میں نے قاری کی رہنمائی کی اور اپنی جگہ سلفین ہو گیا ہوں۔ اب اگر وسائل کی دشواریوں کی بنا پر میں نے اپنے اس انتخاب کا حلقہ محدود رکھ لیا ہے تو قصور میرا نہیں ہے۔ اگر آپ کو میرے ذوقی انتخاب پر اعتراض ہے تو یہ ایک طرف الزام ہے اور ظاہر ہے کہ ہر قاری

کو یہ الزام عائد کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ میں اُن سے یہ حق چھیننے والا کون ؟ رہا
 انسانے کے ارتقائی مراحل اور اس کی مابین خامیوں کا مسئلہ تو اس کا ذمہ دار
 انسانہ نگار ہے۔ تاہم ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قیام پاکستان کے
 بعد اس ربع صدی سے کچھ کم عرصہ میں اردو کے انسانی ادب نے جتنا سفر طے
 کیا ہے وہ کوئی نصف صدی کا قصہ ہے۔ اس دور میں ہم نے نئے لکھنے والوں کی
 ایک فوجی ظفر صبح کو قلم ہاتھ میں لئے انسانے کے مورچے پر نبرد آزما دیکھا ہے اور
 یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر لکھنے والے نے حسب استطاعت بڑا تیر مارا ہے، لیکن میں
 نے انسانی 'غیر جانبداری' سے آپ کے سامنے یہ مجموعہ پیش کیا ہے اور نئے پراؤں کی
 جاندار تخلیقات کو حتی الوسع نظر انداز نہیں کیا۔ عدل کی میزان آپ کے ہاتھ میں ہے
 نامشک کے اور میرے حق میں کلمہ خیر کہئے یا میری بے ذوقی کا اور ناروئے ع
 بہر پہلو سوسو تسلیم تم ہے

ناصر زیدی

دیر ماہنامہ ادب لطیف۔

۱۵- سرکلر روڈ - لاہور

فون ۵۲۰۰۹

اللہ کا فضل

”میں خدا کا واسطہ بتائیے کیا کروں؟ سکیں نہیں نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔
”بھئی میری تو یہی رائے ہے کہ فرحت کو طلاق دلوادیں۔“

”ہے ہے طلاق۔“ وہ لرز اٹھیں؛ آج تک خاندان میں طلاق نہیں ہوئی۔
پھر دوسری بیٹی رضیہ چھاتی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ تاک کٹ جائے گی۔ پھر اسے کون
بوجھ لے گا۔ ایسی پیاری بیٹیاں ہیں، لیکن بر نہیں جھڑتے۔ ”بر کے معنی صرف تند
قبول صورت فوجان ہی نہیں؛ بر کے لئے لازمی ہے کہ وہ بھاری تنخواہ پانا
ہو اور اچھے کھاتے پیتے خاندان کا ہو۔ کچھ آگے پیچھے کام آئے۔ دیکھ مر
ذات کی کمی نہیں۔“ بڑی بیٹی کے لئے کنوئیں میں بانس ڈالنے تب کہیں جا
لڑکا کھڑا۔ لڑکا ماشاء اللہ سے ساٹھ سینٹ کا ہے، ایک بیوی اور چار
لڑکیاں ہیں پر میٹا نہیں۔ بیٹے کے لئے فرحت سے شادی کی تھی سو اس
کے نصیب پر ہنسنے لگے۔ چھ سال چل رہا ہے۔ بیٹا چھوڑ بیٹی ہی نصیبوں جلی ہو جاتی۔

پہل تو لگنا، لیکن وہاں بھولے کو دن بھی نہ چڑھے۔ کتے تعویذ گنڈے کئے، اجیری خواجہ نے بھی سیکند کھیا کی نہ سنی۔

”اے بھئی تعویذ گنڈوں کے پھیر میں نہ پڑیے۔ اچھے ڈاکٹر کو دکھائیے۔“
 ”ڈاکٹر سے ڈاکٹر دکھائے۔ سب موتے ہی کتنے ہیں لڑکی میں عیب نہیں۔
 بس بہن اللہ کا فضل ہے۔ ہوا ہوا نہ ہوا تو اس میں کسی کا کیا دخل؟“
 شاید امداد مایاں ہی میں کچھ عیب ہو گیا ہو۔

”نہیں بہن مردقات میں کہاں عیب ہوتا ہے۔ لوگ اکسار ہے ہیں کہ
 تیسری شادی کر دو۔ انھیں کیا کمی ہے لڑکیوں کی۔۔۔ اچھے اچھے لوگ بیٹیاں
 تھال میں سجا کے دینے کو تیار ہیں۔“

فرحت بھے ایک دن سینا میں ملی تھی۔ اچھی چکنی چٹری رس ملائی رکھی ہوئی
 ہے۔ گودا چٹانگ، بہنتی ہوئی صورت، بھرا بھرا جسم، اماں کو بائیں کا گھر گھڑنے کا غم
 کھائے جاتا ہے۔ لیکن خود فرحت کے دل پر کچھ اثر نہیں، مشکل سے بائیں تینس
 کا سن ہو گا۔ ابھی تھوڑے ہی دن سے ان لوگوں سے میل جول بڑھ گیا تھا، بس روڈ
 پران کے چار کمروں کا فلیٹ ہے۔ بڑی آن بان سے سجا ہوا۔ پہلی جوی کمار میں
 اپنے اماں باوا کے ساتھ رہتی ہیں۔ یہ فلیٹ خاص طور پر فرحت کے لئے لیا ہے
 لیکن اس کے نام نہیں کرتے۔

”غارت کیجئے امداد مایاں کو۔۔۔ فرحت کو ہزاروں لڑکے مل جائیں گے۔“
 مجھے اندر کا خیال آیا کہ ان دنوں میرے ساتھ ہی رہتا تھا۔۔۔ ”سامے پارچ سو
 لٹے ہیں۔ ترقی ہو جائے گی۔“ اس دن سینا میں فرحت کی نظرس بار بار فور پر ٹپٹ

رہی تھیں۔ سیکینہ بہن بھی بڑی مہربان نظر آرہی تھیں۔ میں نے ان سے ذکر کیا تو کھل گئیں۔

”اے ہے ایسا ہو جائے تو کیا کہنے ہیں! ماشاء اللہ کیا چاند سورج کی جوڑی رہے گی۔“

”آپ طلاق دلا دیجئے بس آگے میرا ذمہ!“ میں نے وعدہ کیا۔
مگر انور بدک گیا۔

”بھئی میں اس پکڑ میں نہ پڑوں گا!“
”کیوں بے وقوف اتنی اچھی لڑکی ہے!“
”لڑکی کہاں؟ کسی کی بیوی ہے!“
”طلاق کے بعد...“

”مگر بڑھیا بڑی کاٹیاں ہے۔“

”ارے بے چاری بہت سیدھی ہیں۔“

”بڑی چلتی پرزہ ہے۔ مجھے تو اس میں سے بارگود کی بُرائی ہے!“

مگر انور بے چارے کی ایک نہ چلی۔ ادھر سے سیکینہ بہن ادھر سے میں نے دے بانکا والا کہ بد تو اس کر دیا۔ گھیر گھیر کے ہم دونوں انہیں ایک دوسرے سے ٹکراتے۔
بڑی بڑی ٹکڑیاں چل کے انہیں اکیلا چھوڑ کے مرگ جاتے۔ سیکینہ بیگم آنکھوں میں آنسو بھرتیں اور شکریہ ادا کرتیں۔

یا تو انور میٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیتا تھا۔ یا اب یہ حالت ہو گئی جیسے جوت سوار ہو گیا ہو۔ سرور کا ہوش نہ رہا۔ سرفرح نے شادی کی تھی محبت نہیں کی تھی۔

انور کی محبت نے اسے ایک نئی زندگی بخش دی۔ انور کو سکینہ کی صحبت سے نفرت تھی۔ مگر پھر تو وہ ان کا بھی گمراہ ہو گیا۔ وہ بھی اس پر صدقے داری جاتی۔ اس کے بغیر ان کے حلق سے نوالہ نہ اُترتا۔ میری اہمیت بالکل ختم ہو گئی۔ شادی سے پہلے ہی انور سسرال کا ہو رہا۔ رات کے دو دو بجے تک وہیں گھسا رہتا یا فرحت آجاتی اور دونوں کمرے میں بند ٹھنڈول کیا کرتے۔ میں اپنے کام کے سلسلے میں کچھ دن کے لئے پونا چلی گئی۔ وہاں سے کوئی نو معلوم ہوا — میرے پیچھے فرحت مستقل طور پر گھر میں رہی کبھی کبھار اپنے گھر چلی جاتی۔ اب تو شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ دونوں کی محبت عروج کی پہنچ چکی ہے۔

”آپ کچھ کر رہی ہیں؟“ میں نے سکینہ سے پوچھا — پہلے تو ثالثی رہیں پھر رولیں۔

”ہاں! احمد آباد کے ایک سوامی جی نے ایک بوٹی دی ہے۔“
 ”ارے ہٹاؤ سوامی جی کو — یہ لوگ پاکھنڈی ہوتے ہیں۔ طلاق کے بارے میں کیا کر رہی ہیں۔؟“

”اس شخص طلاق کے نام سے مجھے ہول آتا ہے؟“

”لیکن آخر ہو گا کیا؟“

”اللہ اپنا فضل کرے گا۔“

آؤ نہ — اللہ خاک اپنا فضل نہ کرے گا — سر پکڑے روئیں گی آپ!

ایک جوان لڑکا اور لڑکی کا یوں دن رات بلنا....

”کیوں؟ کیا ہوا؟ کیا تم سے فرحت نے کچھ کہا؟ وہ چونک پڑیں۔“

”نہیں فرحت نے کچھ نہیں کہا، مگر میرے کیا آنکھیں نہیں ہیں؟ میں بہت دینک انہیں اُترے بیچ سمجھاتی رہی۔ وہ بہت ڈکھی سر جھکائے نہ جانے کیا سوچتی رہیں۔“

”سوامی جی نے سات پڑیاں دی ہیں۔ ہر منگل وار کو ایک پڑیا پان یا گرم دودھ کے ساتھ۔“

”فرحت کو دی ہیں؟“

”نہیں ادا دیاں کو؟“

”ادا دیاں کو —؟“ میں جل کے رہ گئی۔ ”سات پڑیاں کیا۔ انہیں سات

ایٹیم بم بھی نکلا دیتے جائیں تو کچھ نہ ہوگا، کیا ادا دیاں آتے ہیں؟“

”ہاں ہر منگل وار کو آتے ہیں۔ نہادھو کر دو رکعت شکرانہ پڑھ کے گرم

دودھ کے ساتھ اور....“

”اد بھی؟ یعنی حد جو گئی — یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟“

”اے بہن تو وہ اس کا شوہر۔۔۔“

”مگر.... انور ادا دیاں.... یعنی.... یہ کیا ہو رہا ہے؟ میری

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بتاؤں۔ کیا یہ کم بخت اندھی ہے؟ مگر میری بہت

نہ پڑی۔“

”اگلے منگل وار کو جو تھی پڑیا ہو جائے گی۔“ وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

”سوامی جی کہتے ہیں اللہ نے پانچویں پڑیا....“

”سکینہ بہن اللہ کے واسطے یہ مذاق اچھا نہیں۔ اب فرحت کی طلاق کے

لئے کچھ کیجئے۔ اور کم بخت ادا دیاں سے مہر دھو لیتے۔ میں نے سوچا، انوراہ۔
فرحت الگ ٹیٹ لے کر زندگی بڑے مزے سے شروع کر سکیں گے۔

”مہر۔“ ”سکینہ بن جھوٹکی رہ گئیں

”کتنے بے مہر“

”خاک بھی نہیں۔ اب آپ سے کیا چھپانا، پچھپ ہزار مہر تھا تو دس ہزار
سرفراز دیاں نے کے دلالت چلے گئے۔ ایسے سدا سے ہیں کہ پٹنے کا نام ہی
نہیں لیتے۔ وہیں مہم سے شادی کر لی، ایک بچی بھی ہو گئی۔

سرفراز دیاں سکینہ کے بڑے بیٹے کے ایک دوست کی معرفت فرحت کا رشتہ
ہوا تھا۔ عمر زیادہ تھی ادا دیاں کی۔ مگر بیٹے کے مستقبل کا سوال تھا۔ ”کسی
قابل ہو کر آگئے تو خاندان کی گری ہوئی حالت منہجیل جائے گی۔ سو وہ پٹنے
ہی نہیں، اٹنے چھ ہزار اور مٹنے لائے کرائے کے نام سے۔ ادا دیاں کچھ جیتے
نکے سب مہر کے حساب میں لکھوا لیا۔“

”مگر یہ تو ہوسے سولہ ہزار۔۔۔۔۔ باقی....؟“

”دری پر ٹیٹ ہے۔۔۔۔۔ وہ رضیہ کے نام ہے۔ میں نے کس کچھ تو جو

نیک بخت کے لئے۔ آج کل کے لڑکے منہ پھاڑ کے دوڑتے ہیں۔“

مجھے فرحت پر بے طرح ترس آنے لگا۔ بجائی کے مستقبل اور بہن کی شادی
کے لئے اس کی زندگی مٹی میں ملا دی۔ ایسی ماں اور نانکدہ میں کیا فرق ہے ؟
اور اسی لئے سکینہ بیگم خلاق سے بوکھلائی جاتی ہیں۔“

”بہن اگر ادا دے اور شادی کر لی تو ہم لوگ کہیں کے نہ رہیں گے۔“

کیسے کیسے میں نے چلتے کیسے ہیں، دلیخے پڑے ہیں، غیش مانی میں جیسی تو شادی نہیں کی۔ دندنہ لوگ تو انہیں خوب ہنسا رہے ہیں۔

مجھے وحشت ہونے لگی۔ کتنی بے وقوف ہے یہ عورت! کچھ سمجھتی ہی نہیں مگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کیا ہو گا؟

”دیکھئے آپ نکر نہ کیجئے، آپ انور اور فرحت کے ساتھ رہیں گی۔ رضیہ کی بغیر فلیٹ کے بھی اچھی جگہ شادی ہو جائے گی۔ آپ طلاق کی فکر کیجئے۔“
انہوں نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔

اور وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ دو چاروں سے انور کچھ بکھڑکے سے پھر رہے تھے۔ فرحت بھی کچھ دیر ان سے نظر آ رہی تھی۔ میں نے ہو چاہا۔ کیا کچھ جھگڑا ہو گیا تو دونوں گھبرا گئے۔

رات کو کچھ عجب دھماکا ہو کر ہی سی انور کے کمرے میں بھی ہوئی تھی۔ اندر سے فرحت کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکٹایا۔

”اندر آئیے! وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر لے گیا۔“ اس بے وقوف کو سمجھائیے؟
”کیا ہوا۔۔۔؟“

”آئی۔۔۔! وہ میرے پیروں سے لپٹ گئی۔“

”یکھڑکی سے کود کر۔۔۔“ انور ہنسی طرح لہڑا ہوا تھا۔

”پانگل ہوئی ہو؟“ میں نے اس کا آنسوؤں سے ترسیرا اوپر اٹھا دیا۔ سب

ٹھیک ہو جائے گا۔ یوں رو رو کر مکان ہونے سے فائدہ؟ طلاق کے بعد۔۔۔؟“

”ہائے آئی جی! امی طلاق کے نام پر منہ پیٹے لیتی ہیں۔۔۔ کتنی ہیں۔“

نکلیا کہا لوں گی؟

”اتنی کم بخت کا تو بھیجہ بچھل گیا ہے، تم خود بالغ ہو، طلاق لے سکتی ہو۔ اور پھر اب ایسے حالات میں تو... وہ راضی ہو جائیں گی؟“

”نہیں آنٹی جی، وہ.... وہ نہیں مانیں گی۔ ہائے میں مرجاؤں؟“

”مر جاؤ گی مگر اپنے حق کے لئے فدا اپنی امتی سے مقابلہ نہیں کر سکتیں۔“

”ان کا مدنا نہیں دیکھا جاتا، کل انھیں جیسے زور کا دورہ پڑا۔ دانت بچھ گئے۔ بس اتنی سی بات ہوئی تھی کہ میں نے کہا انھیں منع کرو۔ شکل و شکل کو نہ آئیں، میں ان کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔“ مجھے گھین آتی ہے۔ ہائے آنٹی آپ کو کیا بتاؤں، وہ تو آدمی نہیں کتا ہے۔ منہ ڈھک کے رہ پھر سکیں لینے گی۔“

”تم نے اپنی ماں کو بتایا؟“

”نہیں جب انھیں اصلیت کا پتہ چلے گا۔ وہ مجھے کاٹ کے پھینک دیں گی۔“

”نہیں جب انھیں اصلیت کا پتہ چلے گا تو دماغ درست ہو جائے گا۔ اس کے سوا“

چارہ ہی کیا ہے؟ میں صبح جا کر ان سے سب کچھ کہہ دوں گی اور ساتھ دن کے اندر“

طلاق....“

”طلاق تو وہ مر کے بھی نہ لینے دیں گی۔ ویسے ہی ہر وقت کہتی ہیں تو تو خاندان“

کا نام اچھا لے گی۔ تیرا کیا ہے؟ درمرا ختم کر، پھر تیسرا کر؟“

میں نے اسے سمجھایا، یقین دلایا، اس کی ڈھارس بندھ گئی اور تھوڑی سی دیر“

میں مسکراتے ہوئے۔ روٹی روٹی شکل پر ہنس کچھ ایسی پیاری لگ رہی تھی کہ اندر کی“

نئی نئی آنکھیں اس کے چہرے پر ٹپک گئیں۔

میں ان دونوں کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ سونے کی کوشش کی مگر نیند نہ آئی۔ اگر امداد میاں کو پتہ چل گیا تو غضب ہو جائے گا۔ اور مٹری میں ہے۔ کم بخت کا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔ امداد کی پہلی بیوی تو اُدھار کھائے بیٹھی ہیں۔ سکیئرے بیگم اور فرحت کی دھجیاں اڑا دیں گی۔ ڈرتی ڈرتی میں صبح ان کے پاس پہنچی۔ حسبِ عادت وہ نگر مسند ہی بیٹھ گئیں۔ میں نے بڑی رسائی سے فرحت کی پتا سنائی۔ تمہیں کھا کر تھیں دلا یا کہ اور دو غاندے لگا۔ وہ تو اس پر جان چھوکتا ہے!۔ میں چورسی گم ٹم رہ گئی۔ سکیئرے بیگم کے کیلے پر جیسے مٹھیں گن کی باڑہ چل گئی۔ پاگوں کی طرح ہنسیں اور ہچوں کی طرح مدے لگیں، بچہ چتے کی طرح ان کا جسم کانپا اور وہ دبیں ڈھیر ہو گئیں۔ میرے ہاتھ پر پھول گئے۔ رضیہ بالی جلد ہلکی تھی، فرحت اپنے کمرے میں بیٹھی کانپ رہی تھی، انہوں نے کسی کو کوسا نہ پیشا نہ میرے منہ پر تھوکا کہ میرے بھائی نے ان کا نصیب چھوڑ دیا۔

”آپ اسی وقت وکیل کے پاس چلیے اور فرحت کو میں اپنی بہن کے پاس دہلی بھیج دوں گی۔ امداد پر ہر طرح کا ربا ڈالا جائے گا۔ آپ نگر نہ کیجئے۔“

ان کے چہرے پر جوائیاں اڑ رہی تھیں سر جھکائے بیٹھی رہیں۔

”وکیل؟ انہوں نے احمقوں کی طرح کہا: ہاں۔ مگر اس وقت....“

میں پھر آپ کو فونی کدوں کی۔ امداد آپ کو خوش رکھے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

واپس آکر میں فون کے انتظار میں بدحواس رہی۔ کہیں مددوں ماں بیٹی دسپہ کھا کر دسور رہیں۔ ساری عمر کی تھمت چڑھ جائے گی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ حالات یوں پٹا کھائیں گے۔

انور کا عجیب حال تھا۔ کہتے ہیں مرد سب دنیا ہوتے ہیں عورت کو مصیبت میں پھنسا کر فوج پکڑ جاتے ہیں مگر انور کی تو جان نکلی جا رہی تھی۔ شام تک انتظار کیا مگر فون نہ آیا۔ جھک مار کر میں نے فون کیا تو جواب نہ ملا۔ جب بہت ہی بے چین ہو گیا تو میں نے انور کو بھیجا۔

انور ڈٹا تو صورت دیکھ کے میاؤں مچ گئی۔

”کیا کہا؟“

”گھر میں کوئی نہیں، نالہ پڑا ہے۔ گورکھ سے پوچھا، معلوم ہوا سب گئے!“

”کہاں گئے؟“

”کچھ پتہ نہیں!“

سات انگاروں پر گئی۔ انور پاگلوں کی طرح دنیا بھر کو فون کرتا رہا۔ ادویہ کی سسرال کو فون کیا۔ پتہ چلا، کہاں گئے ہیں، کچھ معلوم نہیں۔ شاید درود کے غلیٹ میں ہوں گے۔

انور دیوانوں کی طرح در سودا بھاگا۔ میں نے بہت روکا لیکن اس پر تو سمجھوتہ سوار تھا۔

دہن ایک ڈکر تھا۔ اس نے کہا، کھا گئے ہوں گے، پیرچ گیٹ۔ ایک آٹا پیڑ روڈ پر بھی تھا۔ وہاں بھی نہ ملے۔ تین چار دن گزر گئے تب معلوم ہوا کہیں باہر گئے ہیں۔ آفس کو پتہ ہو گا جنھوں نے تین چار آفس تھے کہیں نہ معلوم ہو گا کہ کہاں مر گئے۔

پچھلے ساتریں دن ایک لفظ ملا۔ میلا کھینچا، پھٹا ہوا، لکھا تھا۔

”خدا کا واسطہ مجھے بچاؤ۔ اس جنم سے نکالو۔ میری جان پر ایسا سپرہ ہے کہ سانس لینا مشکل ہے۔ اللہ میری جان پر دم کر دے!“

”فرحت“

خط پڑھ کر تو اور سولی سوار ہو گئی۔ مٹی مٹی صرے پتہ چلا خط نیگم پیٹے سے خاک میں ڈالا گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ حیدر آباد گئی ہوں گی۔

کون بچائے کیسے بچائے؟ انور دیوانوں کی طرح حیدر آباد بھاگا۔ ادھر ادھر سرسار کے لوٹ آیا، کچھ پتہ نہ چلا۔

کیا دل پر وحشت تھی۔ اب بھی سوچتی ہوں تو پھر ریاں آنے لگتی ہیں۔ انور کو کئی مصیبتوں سے منبھالا ہے کہ بس میں ہی جانتی ہوں۔ اس گناہ میں میری مدد بھی شامل تھی۔ میرے دامن پر بھی بے گناہ خون کے دھبے تھے۔ اسی سال انور کا تبادلہ دہلی کی طرف ہو گیا۔ میری جان چھوٹی! اس واقعہ کو کتنے ہی سال بیت گئے۔ انور کو صبر آ گیا۔ چاند سی دھن اور پتوں نے سب کچھ بھلا دیا۔

میں مارک اینڈ اسپنسر سے نکل رہی تھی اور وہ داخل ہو رہی تھیں۔ ٹکڑے ہوتے ہی ہوتے ہی! مٹھوڑی دیر ہم انھوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

”ہن آپ! وہ سمور کا کوٹ پہنے فمڈے لیٹ گئیں۔ اللہ کتنے سال چمکے!“

”سکینہ ہن!“ بیل ملتی خشک ہو گیا۔

”سرفراز میاں کے اس ٹھہری ہوئی ہوں۔ انھوں نے تو پٹے کا نام نہیں لیا۔ میں نے کہا چلو میں ہی ناگ نیچی کر کے بل آؤں۔ اس بہانے ولایت کی سیر بھی ہو جائے گی۔ اللہ اللہ کیا ہشت بہشت ہو رہی بنایا ہے ان فرنگیوں نے!“ وہ اٹنی انفراس

اور سوشلزمینڈ کے قہقہے بیان کرنے لگیں۔

ان کی صورت پر ایک دم اطمینان اور جوانی ٹوٹ پڑی تھی پہلے سے بھاری ہجرم بھی معلوم ہو رہی تھیں۔ کسی اچھے ہیر سیلون سے ہاں بنوائے تھے۔ وہ حیران پریشان سیکھنے سوکھی ڈال سے ایک دم لہلہا تاچھن بن گئی تھیں۔

”فرحت کیسی ہے؟ میں نے ذرا تکلف محسوس کیا۔

”اٹھ کے فضل سے بہت خوش و خرم ہیں میاں بیوی۔ نادرمیاں بھی خیر سے اسکول جاتے ہیں۔ ناظم آباد میں کیا حق و ذوق کوٹھی ہے۔ ٹی وی ہے۔ کیرپرائی صورت ہے نادری۔ بتا بنایا باپ ہے؟

”باپ!“ میں الجھن میں پڑ گئی۔

”جی ہاں، وہی چٹانگ اور نیلی آنکھیں!“

”امداد میاں کی نیلی آنکھیں؟“

”اے ہے، آپ تو ایسی بن رہی ہیں جیسے....“ وہ ڈھٹائی کے کھلنے لگا اور جلدی جلدی سامان شرابی میں رکھنے لگیں۔

”اور وہ سات پڑیاں؟“ میں نے گریدا۔

”اٹھ قسم آپ کو ایک ایک بات یاد رہتی ہے۔ پہلے چار ہزار دس تھے سوائے“

”پڑیوں کے یا ترکیب کے؟“

”وہ نگوڑا تو کچھ اول قول کے تھا؟“

”یعنی اپنی خدمات پیش کر رہا تھا؟“

”جی اور دس ہزار انگ رہا تھا، مگر نیک بخت کی صورت دیکھ بھانج پڑے

تھا: وہ بڑبڑائیں۔

”ادامیاں کوشک تو نہیں ہوا؟“

”اے بٹائیے بھی — دنیا جہاں کے مردے جو اپنی اولاد پر شک شبہ کرنے لگیں تو.... بس اب جانے بھی دیجئے۔ اتنی عقل اپنی گریہ میں جوتی تو میری معصوم بچی پہ لازم نہ تھوپتے اپنے بوڑھے گریبان میں بھی ایک بار جھانک کر دیکھتے۔ اے مٹی ڈالنے ان باتوں پر دم ٹوٹتا ہے میرا۔“

”انور بے چارہ بہت تڑپا، آپ لوگوں نے صورت بھی نہ دکھائی بیٹے کی۔ میں نے چپکلی لی۔“

”بس جانے دیجئے! یہ جو گلی گلی بچے پکاتے پھرتے ہیں تب کیجھ نہیں پھٹتا۔“

بیتا رہے اللہ اسے درجنوں بچے دے۔ ”وہ انور کو دعا میں دینے لگیں۔“

میں نے ان کے بیش قیمت سمور کو دیکھا اور چائنا سلک کے اسکارف کو۔

پھر قنصل میں ناظم آباد میں پھیلی ہوئی حق و دوق کو خلی کا رقبہ ناپا۔ بٹھے میں سے پھلکے ٹوٹا ہرے ہرے پونڈوں کی گڈی دیکھی اور مجھے بے طرح کوفت ہونے لگی۔

میں کیوں جو رہی بیٹھی تھی فرحت کی گود بھرنے میں میری ہمدردیاں بھی تو شامل تھیں۔ ادا انور کتنا بد صورت تھا۔ برسوں منیر کی ملامتیں سناتا رہا۔ جسے وہ اپنی نادانی میں گناہ عظیم سمجھے بیٹھا تھا وہ تو زمین ثواب تھا۔

”میریں صدی“ دہلی

لارنس آف تھلیبیا

پنگ اتنا چوڑا تھا کہ اس پر جو کہیں بچھا تھا وہ چار کھیسوں کے برابر تھا۔ اس کے وسط میں نیش کے ایک گاؤں کیلئے کے سہارے بڑے ملک صاحب کے جسم کا ڈھیر بڑھا تھا۔ ان کی انگلیوں، انگوٹھوں، پنڈلیوں، رانوں، گڑبیدہ کندھوں اور سر کو بہت سے میراثی، تائی، جیور، دھوبی، موچی، گھسار اور کسان و بارے تھے۔ میں ذرا دور بیٹھا تھا اس لئے وہاں سے مجھے یہ منظر یوں دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے ایک بڑے سے عمارت کو جو امیں اڑ جانے سے روکنے کے لئے اس کے ساتھ بہت سے بچے چپٹ کر رہ گئے ہوں۔ پھر خدا بخش نے چوپال میں قدم رکھا۔ بڑے ملک صاحب بولے: ”آج چھوٹا ملک بہت خوش ہے آج اس کا باد آیا ہوا ہے لاہور سے“ انھوں نے ایک لمبی کانگہ کے ساتھ پلٹ کر میری طرف دیکھنے کی اور شاید مسکوانے کی بھی کوشش کی مگر یہ مسکراہٹ مجھ تک نہ پہنچ سکی۔ ان کے سوچے ہوئے گالوں اور گھنے گل جھوں سے ٹکریں مار کر وہی کہیں لگتی۔

میں وہ اس لئے بیٹھا تھا کہ میرے لئے چائے آنے والی تھی۔ جھکو چپال کے باندے کے آخری سرے پر دو کرسیاں اور ایک تپانی رکھ کر اور مجھے ایک کرسی پر بیٹھا کر خدا بخش کو بلانے اور چائے لانے چلا گیا۔ جھکو خدا بخش کا بہت چہیتاؤ کرتا تھا۔ نام تو اس کا بھی خدا بخش تھا، مگر خدا بخش اسے جھکو کہتا تھا۔ چنانچہ یہی اس کا نام پڑ گیا۔

خدا بخش کی امی کو نزلے اور بخار کی شکایت تھی اس لئے وہ بار بار اندر چلی کاچکر لگا آتا تھا۔ اب کے وہ واپس آیا تو میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بتایا کہ اس کی امی کا بخار اب ہلکا ہے اور وہ آرام کر رہی ہیں۔ ان کا بخار تیز رہتا تو آج میں تمہیں باز کے شکار کا تھاشہ نہ دکھا سکتا۔ وہ بولا: لارنس آف عربیا کی طرف نہیں نے اپنے باز کا نام لارنس آف تحلیلیا رکھ لیا ہے۔ جنس کو تحلیلیا میں بدلنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" وہ ہنسا۔ ابھی چائے کے بعد تم اور میں اور جھکو گاؤں سے باہر نکل جائیں گے۔ جھکو میرے باز کا سائیس ہے۔ وہ پھر ہنسا۔ یوں سمجھ لو کہ وہ لارنس آف تحلیلیا کا اردلی ہے۔ وہ باز کو اپنی منہلی پر بیٹھائے گا اور —"

دھم دھم کی آواز سے ہم چوٹکے، دیکھا تو دو آدمیوں نے ایک اور آدمی کو پکڑ کے بڑے ملک صاحب کے سامنے جھکا رکھا تھا اور ملک صاحب اس کی پیٹھ پر ہاتھوں کا مینہ برسا رہے تھے اور ساتھ ہی ایسی گالیاں بھی دیتے جاتے تھے جو صرف بڑے ملک ہی کسی کو دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ہانپ ہانپ کر کہتے جاتے تھے: "بھری مجلس میں کہتا ہوں، ملک جی تہ بند منہیاؤ"

ننگے ہو رہے ہو۔ اس حرام زادے سے کوئی پوچھے کہ تمہیں کیا تکلیف تھی۔
میں ہی ننگا ہو رہا تھا تمہاری ماں تو ننگی نہیں ہو رہی تھی؟

خدا بخش نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا: ”آگنی شامت بے چارے
کی۔ اب جب تک یہ ہاتھ پیر پڑھ لے نہیں چھوڑ دیتا۔ ابا اسے کوٹتے ہی رہیں گے۔“
خدا بخش کے لہجے میں برتری کا غرور تھا۔ میں نے کہا: ”خدا بخش تمہیں شرم
نہیں آتی؟ تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔“

خدا بخش نے معذرتی انداز میں کہا: ”کیا کریں یار۔ ان لوگوں سے یہی
سلوک کیا جائے تو سیدھے رہتے ہیں۔“

اتنے میں ہنگو چائے لے آیا طشت کو تپانی پر رکھتے ہوئے اس نے جھک
کر خدا بخش کے کان میں کہا: ”مسکین ایسا بُرا لڑکا تو نہیں چھوڑے ملک۔ پھر اسے
مار کیوں پڑ رہی ہے؟“

”اچھا تو یہ مسکین ہے!“ خدا بخش نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ اس کے تومر
میں زبان بھی نہیں۔ پانچ وقت کا نمازی ہے اذان ایسی دیتا ہے کرچڑیاں
مسجد کے میناروں پر اتر آتی ہیں۔ اس نے یہ کیا بکا دیا آتا ہے!

بڑے ملک صاحب کے دھمو کوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ مسکین ان آدمیوں
کے ہاتھوں میں لٹک گیا تھا جنھوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر ملک صاحب
کی آسانی کے لئے ان کے سامنے جھکا رکھا تھا۔

اب چھوٹو اس کیسے کو؟ ملک صاحب کر کے اور مسکین منہ کے بل ہنتر
کی طرح گر پڑا۔ ”اٹھا لے جاؤ اپنی اپنی باتوں کے اس یار کو۔ ملک صاحب

پھر گرے۔ اور ایک، جھوم کا جھوم سکین کو اٹھانے یوں بے تابی سے بڑھا جیسے سب لوگ سکین کو اٹھانے کے بہانے ملک صاحب کو ہنگ پر سے اٹھا کر پھینکنے چلے ہیں۔ پھر جو لوگ سب سے پہلے بے حس و حرکت سکین کے پاس پہنچے تھے اسے اٹھانے کے لئے جھکے تو لپکنے والوں میں سے ایک سیدھا ہو گیا اور بڑی تشویش سے بولا: "سکین تو اذان پڑھ رہا ہے!"

پھر سکین غصہ ہی اٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ پھر جیسے ملک صاحب سے جانے کی اجازت لینے کے لئے بولا: "سورج تو بہت ڈھل گیا پیش کی نماز تو ہو چکی ہوگی؟" سبھی کو خاموش پاکر وہ اٹھا تو میں نے دیکھا کہ وہ چھوٹ کا ایک وحید جوان تھا اور جب وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا، چوہاں کے چوتھے کی سیڑھیاں اتر کر گلی میں جانے لگا تو مجھے ایسا لگا جیسے گلی میں ایک مینا چل رہا ہے۔

آج اتے ہیں ماں کے یاز چوہاں پر گپ لڑانے کے لئے؟ "بڑے ملک صاحب کہہ رہے تھے: چوہاں پر بیٹھنے کی ایک تمیز ہوتی ہے۔ کہنے لگا ملک ہی ننگے ہو رہے۔" — ہو بھی میں ننگا ہو رہا ہوں تو تم دھیان نہ دو۔ افسانہ دوپہر کے وقت بھی نکلیں بند کر لے تو اس کے لئے سورج ڈوب جاتا ہے۔ پھر تم آنکھیں پھاڑے میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟" ذرا سا رنگ کراخٹوں نے پٹنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا: "کیوں چھوٹے ملک؟ چائے پلا دی اپنے یار کو؟" جواب کا انتظار کرتے بغیر فوراً ہی آنکھوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا لیا اور بولے: "لوہنی اسے دبا دو۔" دیکھنے لگا ہے حرام زادے کی ہڈیاں کوٹ کوٹ کر؟

"یہ حرام زادہ کون تھا؟" میں نے آہستہ سے خدا بخش سے پوچھا۔

”اس کا نام سکیں ہے“ خدا بخش بولا: ”ذات کا جو نام ہے۔ یہ کہیں جو آبا کے پنگ پر بچھا ہے اس نے بنا ہے، بڑا کارگر آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی مگر بہت بھولا ہے۔ نہ جانے آبا کو ٹوکنے کا کوسل کیسے ہوا اس بد نصیب کو! یہ تو بڑا ہی مسکین آدمی ہے، بشکو فوراً بولا: ”اس کا اصلی نام مسکین ہے جی۔ محمد مسکین۔ مسکین تو لوگ اسے ویسے ہی کہتے ہیں، جیسے مجھے بشکو کہتے ہیں۔“

”میں نے کہا۔“ یہاں اگر معلوم ہوا کہ مسکین جیسے لفظ میں بھی جگڑنے کی گنجائش موجود ہے۔“

”آہستہ بولو یار! خدا بخش نے ڈر کر جبے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر بولا: ”عمقوں نے سن لیا تو شاید تمہیں تو کچھ نہ کہیں، میری آفت آجائے گی۔“

”نہیں۔۔۔ اب کیا آفت اٹھے گی۔ اب تو ان کا ہاتھ دکھ رہا ہے۔“

خدا بخش کو میرا سہرا اچھا نہ لگا اس نے جیسے علامت بھیجتے ہوئے مجھے دیکھا اور بشکو سے کہا: ”اصل میں جا کر دیکھو، پیگے نے گھوڑے تیار کر لئے ہیں یا نہیں۔ زمینیں کس لی ہوں تو ختم جا کر لارنس کو اٹھا لاؤ۔ صبح کا سہو کا ہے؟“ بشکو چلا گیا تو خدا بخش میری طرف مڑا: ”دیکھو میاں یہاں کچ تمہارا سپلا دن ہے اور تم آج ہی طنز کرنے لگے ہو میرے آبا پر۔“ اس ملامت کے ایک منقولہ ہے کہ سر قنار بڑا ہوتا ہے۔ درد سر کا رقبہ اتنا ہی پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ آبا کو یہ پٹائیاں مجبوراً کرنی پڑتی ہیں۔۔۔“

”ذکر میں تو زمیندارہ کیسے چلے۔“ وہ رگ گیا، پھر بولا۔ ”میں کیا سوچ رہے ہو؟ میں نے کہا۔“ میں سوچ رہا ہوں کہ جس لمحے جوڑے پنگ پر ملک صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ اس کے پائے کتنے بڑے بڑے ہیں میں نے انہیں غور سے

دیکھا تو وہ لکڑی کے ٹکڑے :۔

حیران ہو کر خدا بخش نے پوچھا : لکڑی کے نہ ہوتے تو اور کس کے ہوتے؟
تم نے پہلے کیا سمجھا تھا؟

میں نے کہا : میں سمجھا یہ پائے نہیں بلکہ پلنگ کے ہرکونے کے نیچے ایک
ایک مسکین کھڑا ہے۔

”گھاؤں کی کھلی خفا کا تم پر ال اثر ہوا ہے“ خدا بخش بولا : تم پکڑا گئے ہو :۔
میں نے اپنی بات جاری رکھی :۔ اور خدا بخش : میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر
پہ چاروں مسکین پلنگ کے چاروں گوشوں کے نیچے سے نکل جائیں تو پلنگ
زمین بھرا ہے۔

”گھوڑے تیار میں چھوٹے ملک : بشکو ہمارے سروں پر چلا۔

بشکو کے بائیں ہاتھ کی بندش پر چڑے کا دستا نہ چڑھا ہوا تھا جس پر لائسنس
آن ٹیلیسیا بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے میں باریک سی ایک زنجیر تھی جس کا آخری برا
دستا نے میں ٹکا ہوا تھا۔ باز کی آنکھوں پر چڑے کے کھوپے چڑھے ہوئے تھے۔
خدا بخش نے سراٹھا کر یہ کھوپے ہٹائے تو میں نے دیکھا کہ باز کی آنکھوں میں
ہلاکی وحشت تھی۔

”کیوں کیسا ہے میل باز؟“ خدا بخش نے پوچھا۔

اور میں نے اس کے کان میں کہا : بازوں کا بڑا ملک معلوم ہوتا ہے !
خدا بخش ہنس پڑا۔ مگر یوں ہنسا جیسے نہ ہنستا تو اور کیا کرتا۔ اس نے باز کی
آنکھوں پر پھر سے کھوپے چڑھائے اور ہم لوگ اسٹبل کی طرف چلے۔

خدا بخش نے قسمیں کھا کھا کر مجھے یقین دلایا کہ اس نے جو گھوڑا مجھے سوار کے لئے دیا تھا وہ ملک صاحب کے اصطبل کا مسکین ترین گھوڑا تھا۔ آٹھواں تازہ گھوڑا مسکین تو نہیں ہو سکتا۔ میں نے شب ظاہر کیا۔ مگر اس نے مجھے بتایا۔ ”اس کے اندر کا گھوڑا پناہ دیا گیا ہے اب یہ طبیعت کا بہت غریب گھوڑا ہے اسے مڑا تازہ رکھنا بہت ضروری ہے ضلع کے افسر لوگ جو اس طرف سے پرتے ہیں اچھے سوار نہیں ہوتے، ہوتے بھی ہیں تو کاروں میں پھیل پھیل کر بیٹھنے کی عادت پڑی ہوتی ہے۔ اور گھوڑے کی پیٹھ پر چوکس ہو کر بیٹھا پڑتا ہے۔ سوا تانے اس کام کے لئے یہ گھوڑا چنا کما س پر افسر سوار ہو تو اس کی افسری کی شان بھی قائم رہے اندریوں بھی نہ ہو کہ لگام کو زنا سا بھی ڈھیلا پکڑ دے افسر کو اپنی پیٹھ پر سے ریشا تر کر دے۔ چنانچہ اس گھوڑے پر یا تو ڈرپٹی کشتری بیٹھے ہیں یا آٹھ تم بیٹھے ہیں نے کہا: تو جیسی اس وقت تم مجھے پٹواری لگ رہے ہو؟

خدا بخش کا گھوڑا بہت منہ زور تھا۔ کنوئیاں اٹھا کر اور نشتے پھلا کر وہ جیسے لگام کو جاکر اڑ جانا چاہتا تھا۔ مگر خدا بخش اچھا سوار تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو میرے گھوڑے سے آگے نہ بڑھنے دیا جس کی کنوئیاں تو اٹھی مہوئی تھیں مگر چل یوں رہا تھا جیسے سسرال کے صحن میں پہلی بار داخل ہونے ہوئے دہلیز چلتی ہیں۔ بشکو باز کو ہاتھ پر بٹھائے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ بھاگ بھی نہیں رہا تھا اور چل بھی نہیں رہا تھا۔ بس بین بین کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔

کیکروں کے گنہان ذخیرے کا موڑ کاٹتے ہی حد نظر تک پھیلا ہوا ایک چشیل دیرا نہ تھا۔ جس میں کہیں کہیں بہت فاصلے پر کیکر اُگے ہوئے تھے انگر

پیکو ہمارے گھلتے تھے۔ ان کے قد بہت چھوٹے اور شاخیں بہت ٹیڑھی اور
 نگی تھیں۔ لالیاں شام سے پہلے انہی اکاؤ کا کیکروں پر آکر بیٹھتی ہیں۔
 خدا بخش نے مجھے بتایا: اور لالی باز کا سن بھانا کھا جا ہے۔ میرا لارنس لالی کو
 دیکھتا ہے تو پاگل ہو جاتا ہے۔ لالی کا گوشت میرے لارنس آن تھیبیا کی دیک ہے!
 میں نے کہا: خدا بخش لالی تو بڑا ہی معصوم پرندہ ہے۔ یہ تو چڑیا ہے بھی
 زیادہ معصوم ہوتا ہے۔ اس کی پید پل پل کتنی کتنی باچیں اس پر کیا پکنا سا طاری
 کئے رکھتی ہیں۔ پھر یہ پرندوں میں شاید سب سے زیادہ بے ضرر ہے۔ یہ تو نہایت
 مسکین مخلوق ہے۔ آخر تم لوگوں کو مسکینوں کا خون پینے کا اتنا شوق کیوں ہے؟
 خدا بخش بولا: اگر تمہیں تقریر کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو راستے میں بھی
 کوئی ٹیڈ آئے گا، تم اس پر چڑھ جانا اور اپنی تقریر جھاڑنا، میں اور بشکو دست
 بستہ نہیں گئے۔ مگر ابھی دھاڑک جاؤ۔ میرے لارنس کو دیکھو، جھکو کی سنی پر کیے
 بار بار پٹ پٹا جاتا ہے۔ اس نے دیرانے کی بڑا سونگھ لی ہے۔
 لالی! جھکو سانپ کی طرح پھنکارا اور خدا بخش نے گھوڑا مدک لیا۔ میرا
 گھوڑا تو اس کی دیکھا دیکھی چل رہا تھا۔ چنانچہ وہ بھی ٹرک گیا۔
 خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارنے سے پہلے مجھے خود سے
 تماشہ دیکھنے کی تلقین کی۔ یہ تمہاری زندگی کا ایک کبھی نہ بھولنے والا تجربہ ہوگا۔
 اس نے کہا: مزہ آجائے گا جب باز لالی پر چھٹے گا تو ایسی آواز پیدا ہوگی
 جیسے ہوا کو تلوار کاٹ رہی ہے۔ دیکھو۔
 خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارے اور اس کا رن دودر

ایک ٹیڑھے میڑھے کیکر کی طرف کر دیا جس پر تقدیر نے ایک لالی کو لاسٹھا یا تھا۔ ایک دم باز پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس نے دیکھ لیا لالی کو۔ خدا بخش نے خوش ہو کر مجھے بتایا اور بشکو نے باز کے پنجے کو اپنے دستانے سے آزاد کر دیا۔ موت کی تلوار سوا کاٹتی ہوئی چلی گئی اور لالی اُڑ گئی۔ مگر باز نے اُن کی آن میں اس کو جا لیا۔ لالی کی ایک چیخ نے اس دیر لے کر ذرا سا چونکا دیا، اور پھر باز لالی کو اپنے پنجوں میں دبائے واپس بشکو کی سٹھی پر آ بیٹھا تب اس نے لالی کی چیر بھاڑ شروع کر دی۔ اس کی ٹٹری ہوئی چونچ لالی کے خون میں رنگ گئی، پھر اس نے لالی کی بوٹیاں نوچنا شروع کر دیں اور خدا بخش مسلسل بولتا رہا۔

”اس کے کھانے کا قرینہ دیکھو — ہڈی پر سے گوشت کیسے اُکارتا ہے، افسانہ کو بھی ایسا سلیقہ نصیب نہیں اور پھر یہ تو کچا گوشت ہے تازہ اور دھامن سے بھر پورا!“

”لغت!“ میں نے کہا۔ ”تمہاری ذہانت تو آدم خوروں کی سی ہے۔“

مگر خدا بخش ہنستا رہا اور میری طرف یوں دیکھتا رہا جیسے میں بیمار ہوں اور وہ میری دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔

باز جب لالی کو چبا چکا تو جیسے اسے شہ ہو گیا، اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا بخش بولا: ”لارنس آف تعلیلیا آؤٹ ہو گیا۔“ پھر مہنتا ہوا وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ باگ موڑی مگر پھر رک گیا۔ کچھ سوچ کر بولا: ”کیوں بشکو سیاں نکس پہنچ گئے ہیں تو بابا یار کو کیوں نہ دیکھتے چلیں۔؟“

بشکو بولا: ”بابا یار کی آنکھ بھی باز کی طرح تیز ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے

ہیں دیکھ ہی لیا ہو، ہم واپس چلے گئے تو وہ ضرور نگہ کرے گا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ خدا بخش میری طرف مڑا۔ چلو تمہیں غسل کی جائے پلائیے۔ یہاں قریب ہی ہمارے بڑے مزار ہے، بابا رو کا ڈیرا ہے، وہاں چلتے ہیں۔ تم اس سے بل کر خوش ہو گے۔“

باز نے جس وحشت سے لالی کو کھایا تھا، اس سے میری طبیعت بالکل تھیں ہو رہی تھی۔ میں نے کہا: ”جہاں چاہو چلے چلو۔“

دھماکی تین میل کا فاصلہ کر کے ہم ٹرنی ہاؤس مٹی سے بے ہوئے ایک گھروندے کے پاس پہنچے۔ خدا بخش نے چپکے سے اترنے اور آہستہ آہستہ قریب جانے کی تجویز پیش کی۔ وہ بولا: ”بڑا لطف آئے گا۔ ایک بار میں اور شکریہ چپکے سے آئے اور بابا یار کے پاس ایک چار پائی پہنچ گئے۔ بابا یار اپنی رسیاں بیٹے میں مگن رہا، مائی بیگیاں چولے میں پھونکیں مارتی رہیں اور رنگی ٹوکے سے چادر کترتی رہی کسی کو نہ ہی نہ چلا۔ پھر جب انھیں پتہ چلا تو بابا یار اتنا غرمندہ ہوا کہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ منہ سے بس پھپھپ کر کے رہ گیا۔ مائی بیگیاں اپنے بڑے پنے کو گالیاں دیتی رہیں۔ اور رنگی تو اتنا ہنسی کہ جب بابا کی ہنکار پر بھی اس کی ہنسی رکنے میں نہ آئی تو وہ اندر کوٹھے میں بھاگ گئی۔“

گھروندے کے پھپھوڑے گھونڈوں پر اتر کر ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ صحن میں لیکر کے بڑے بڑے درخت تھے، نیچے ایک گائے اور چند بکریاں شاید عادتاً بیٹھیں نہیں۔ کیونکہ درختوں کے سائے اپنے تئوں کے سائے سے بہت دور چپکے تھے۔ ان بکریوں کے پاس کھٹولے پر بابا یار بیٹھا انوں بٹ رہا تھا۔

دیوار کے ساتھ لگے ہوئے چولے میں آگ بھل رہی تھی اور مائی بیگیاں ہانڈی میں
بچہ چلا رہی تھی جیسے پتھر اُبال رہی ہے۔ دونوں اپنے اپنے کام میں ایسے
مغور تھے کہ انہیں ہمارے آنے کا پتہ نہ چلا۔ پھر اچانک مائی بیگیاں بولی: "ہائے
مجھے تو بہت چننا لگ رہی رنگی کو اب تک تو آ جانا ہی چاہیے تھا۔"

"آجائے گی۔" بابا یارو بولا: "کہاں گئی ہے؟ اپنے ملکوں کے ہاں گئی ہے
نا؟ تو پھر اپنے ہی گھر گئی ہے جانتی نہیں ہو ملک کی بیٹی اس کی کتنی بچی سیلی ہے؟
وہ دوپٹہ یاد ہے جو اس نے پھولی گرمیوں میں رنگی کو دیا تھا؟ آتا بڑھیا رشم تھا
کہ رنگی اسے تہ کرتی گئی اور آخروہ آتا ذرا سا رہ گیا کہ تمہارے چمٹے کے پھلے
میں آگیا۔ سو روپے کا جو گویہ دوپٹہ۔ وہ اپنی اتنی سیاری سیلی کے پاس گئی ہے
تو فکر کی کون سی بات ہے۔ رات بھی رہ لے تو کھو فرشتوں کے گھر جان ہے۔"

خدا بخش نے آہستہ سے کہا: "میرے خیال میں واپس چلنا چاہیے۔ ان
بے چاروں نے ہمیں دیکھا تو خاطر مدارات میں لگ جائیں گے۔"

بشکو بولا: "اور پھر چائے پکانا تو مائی کو آتا ہی نہیں جو شائد گھومتی ہے۔
رنگی جوتی تو پی لیتے۔ ایسی چائے پکاتی ہے کہ نشہ ہو جاتا ہے۔"

خدا بخش بے اختیار ہنس پڑا تو مائی اور بابا نے چونک کر دیکھا اور ان
کے ہاتھ پر پھول گئے۔ وہ خدا بخش سے رکنے بیٹھنے اور چائے پینے کی یوں التجائیں
کرنے لگے جیسے اگر خدا بخش نے ان کی بات مان لی تو ان کا گھر ذرا سونے
چاندی کے محل میں بدل جائے گا اور ان کی بکریاں گھوڑیاں بن جائیں گی۔
خدا بخش نے انہیں سمجھایا کہ: "سو بیچ ڈرو بے کو ہے اور ہم دشمنوں والے

لوگ ہیں۔ شام کے بعد تو ہماری جوبی کی فیصل چرائٹوں والوں کا سپرہ ہوتا ہے۔
 تم تو جانتے ہو بابا یارو! میں شام سے پہلے گھر نہ پہنچا تو بڑے ملک قیامت مچا
 دیں گے، ہمارا باز لالی کا شکار کرنے آیا تھا، سوچا تمہیں دیکھنے چلیں، ٹھیک
 ہونا، کوئی تکلیف تو نہیں۔ اچھا اب تم بیٹھو ہم چلے، رکاب میں پاؤں رکھنے
 ہوئے خدا بخش بولا۔ رنگی کی فکر نہ کرو، اگر سے دیر ہو گئی تو میری بہن اسے
 روک لے گی۔ ادا اب تو دیر ہو ہی چکی ہے۔“

بابا یارو بولا۔ آج صبح اسے ایک جھاڑی کی جڑ میں اُگی ہوئی بہت سی چوٹیں
 ملیں۔ اس کی سیسی کو چوٹیں بہت پسند ہیں اس لئے زٹ لگا دی کہ وہ ملکوں کی
 جوبی میں جائے گی۔ کپڑے دھوئے، سکھا کر بچے اور بچہ دہر کو چوٹوں کی پوٹی
 باندھ کر چلی گئی۔ دیسے تو وہ سیانی ہے پر سوچتا ہوں، اگر سے راستے میں شا
 پڑ گئی تو۔۔۔ تو دیرانہ ہے، ڈر لگتا ہے۔“

خدا بخش نے اسے تسلی دی: ہماری زمینوں پہ ایک چڑیا تک کو خطرہ نہیں،
 تو رنگی کو کیا ڈر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ رنگی بابا یارو کی بیٹی ہے اور سب جانتے
 ہیں کہ بابا یارو کس کا آدمی ہے۔ تم فکر نہ کرو، لو ہم چلے۔“

واپسی پر خدا بخش نے بازوؤں اور شکموں کے سلسلے میں بے حساب مہلوں
 سے مجھے لاد ڈالا، میرے ذوق کی رعایت سے اس نے خوش حال خان خٹک
 اور علامہ اقبال کے شاہینوں کا بھی ذکر کیا اور بعض پرانے سکوت، تلواروں
 کے قبضوں اور لبادوں کے جھٹوں پر بازوؤں کی تصویروں کے بارے میں بتا کر
 ثابت کیا کہ باز ایک شاہی پرندہ ہے، آخر میں اس نے پرمسکت دلیل دی۔

”تم نے آج تک کبھی نہیں سنا ہو گا کہ کسی غریب آدمی نے باز پالا ہو۔“
”غریب آدمی تو لایا ہوا پالتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

خدا بخش میرے طنز کا کچھ جواب دینے ہی لگا تھا کہ اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ کیکروں کے ذخیرے کے موڑ پر ایک ایک ایک نوجوان لڑکی ہمارے سامنے آگئی تھی۔ وہ رنگی تھی۔ نہ جانے اس کا اصل نام کیا تھا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ رنگوں کا ایک دبیر ہے۔ سات رنگوں میں سے کوئی بھی رنگ ایسا نہ تھا جس سے اس کا وجود محروم ہو۔ اس کی آنکھوں، بالوں، چہرے اور ہاتھوں سے جو رنگ پتھر رہے تھے وہ اس کی تہ بند کرتے اور اڑھنی میں جذب ہو گئے تھے۔ اس وقت سورج سپاٹ میدان کے پرے کنارے پر شعلوں کی جیسے زمین کا آخری نظارہ کر رہا تھا۔ آسمان کے وسط میں بادل کے چند ٹکڑے ابھی سے گلابی ہو گئے تھے اور یہ گلاب کیکروں کے ذخیرے کے اس موڑ پر برس رہا تھا۔ اگر ایک بے رنگ جہلی میں سے نکلے ہوئے رنگی کے پاؤں کے ناخن ٹوٹے ہوتے نہ ہوتے تو اسے زمینی مخلوق قرار دینے کے لئے مجھے اپنا پ سے خاص طویل جنگ لڑنی پڑتی مجھے ایسا لگا کہ کٹرے کٹر ملہ کو بھی رنگی کی ایک جھلک دکھا کر اسے ایک ایسے خدا کا قائل کیا جاسکتا ہے جو اس اتنا کا حسن کا رہے۔

یہ سب کچھ میں نے ایک لمحے میں سوچا جس میں بس اتنا ہوا کہ خدا بخش نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ رنگی خشک کر کھڑی ہو گئی اور بشکریہ سے ہمارا ہوا آیا اور ہوا۔ دیکھا چھوٹے ملک؟ رنگی کتنی بے وقوف ہے۔ اسی یہ بھی کوئی وقت ہے اتنے لمبے سفر کا؟ خجہ ملکائی نے رد کیا نہیں۔“

”چل واپس۔“ خدا بخش نے بڑی اہمیت سے حکم دیا: جو ہمارے دشمن ہیں وہ ہمارے مزارعوں کے بھی دشمن ہیں، اور ہمارے دشمن بے شمار ہیں سورج ڈوب رہا ہے، چاند کی رات بھی نہیں ہے، آسمان بادل ویران راستہ ہے اور چل کھڑی ہوئی ہے اس وقت چل واپس۔ میں جا کر اپنی بہن کی خبر لیتا ہوں کہ ایسا سلو کیا جاتا ہے اپنی سیبل سے غریب سہی پر کیا انسان نہیں ہے رنگی؟ چل رنگی۔“

رنگی صرف دو لفظ بولی مگر انھوں نے بھی اس کے حُسن میں جیسے ایک جہنا کو سا پیدا کر دیا۔ یا بابا بے چارہ۔“

”ہم سمجھا آئے ہیں بابا کو۔“ خدا بخش فوراً بولا: ہم نے کہہ دیا تھا کہ اگر رنگی ہمیں گھاؤں کے پاس مل گئی تو ہم اسے واپس حویلی میں لے جائیں گے۔ ایسے وقت دیرانوں میں نہیں نکلتے نادان۔ زمانہ بڑا خراب ہے چل۔“

رنگی ہمارے ساتھ چل پڑی۔ گھاؤں میں پہنچ کر وہ جنگو کے ساتھ حویلی کی طرف چلی گئی اور ہم چو پل پڑ گئے۔ رات کے کھانے کے بعد بڑے ملک صاحب نے مجھ سے باز کے شکار کا پوچھا اور پھر کافی دیر تک بازوں، شکروں، کتوں اور گھوڑوں کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے خدا بخش سے سرگوشی کی۔ کیا تمہارے ہاں شکروں اور کتوں ہی کی باتیں ہوتی ہیں؟ انسانوں کی نہیں ہوتیں۔؟

”ارے چپکے رہو۔ اس نے آہستہ سے کہا: ورنہ آبا پکڑ کر سکین بنوا لیں گے: بڑے ملک اُٹھ کر بچے گئے تو چھوٹے ملک کی گھوڑوں کی بادی آئی۔ وہ بیشتر وقت اپنے لارنس آف تھیلیبیا کی تعریف کرتا رہا۔ اور ایک بار جنگو نے آکر اس سے کوئی بات کی۔ اور وہ مڑکا سٹنے والوں کو داد دیکھیں کا موقع ملا: بابا بخش

کہتا ہے کہ وہ ایک صدی کا ہو رہا ہے مگر آج تک اس نے اس بلا کا باز نہیں دیکھا، وہ کہتا ہے چھوٹے ملک کا باز، بازوں کا شیر ہر ہے؟

جب خدا بخش بھی حویلی میں چلا گیا۔ اور شکوہ بھی میرا بستر جا کر اور تنہائی پر پانی کا ایک جگ رکھ کر روانہ ہو گیا تو میں اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ آسمان آنا صاف تھا کہ سیاہ ہو رہا تھا۔ نار سے اتنے بے شمار تھے کہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے سر جھکا جاتا تھا۔ گاوں پر مکھن سٹا تھا۔ رات کا آغاز تھا اس لئے کہتے تک سو گئے تھے، صرف جھینگر باگ رہے تھے مگر جھینگروں کی آواز بھی تو سٹاٹے کا ایک حصہ ہی ہوتی ہے۔

تب رنگی کو بیکر میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس تناؤ اور اعتماد کے ساتھ جیسے وہ کہہ رہی ہے کہ کوئی نقص ڈھونڈ سکتے ہو تو ڈھونڈو۔! میں نے رنگی کے اس پیکر کو جسے میں نے شام کے ایک گلابی لٹھے میں اپنڈھن کے اندر محفوظ کر لیا تھا ہر زاویہ سے جانچا اور تب میں نے کہا۔ ہاں رنگی تم میں ایک نقص تو موجود ہے اور وہ نقص یہ ہے کہ تم انسان ہو اور انسان بڑی کمزور مخلوق ہے؟

جہاں کے زیریں آگن میں کیکر پر چڑیوں نے داویلا چایا، میری آنکھ کھل۔ قریب ہی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی جانے والی سختی اور کوئی اونچی آواز میں تکبیر پڑھ رہا تھا، قد قامت الصلوٰۃ، قد قامت الصلوٰۃ! صبح کے ہلکے ہلکے آواز میں مسجد کے مینار آسمان کے پس منظر میں متحرک معلوم ہو رہے تھے۔ پھر ایک مینار کے کلس پر ایک چیل اُتری اور اُسے اپنا توازن قائم رکھنے کے لئے دیر تک پڑوں کو بار بار پھیلانا پڑا۔ اس پر بھی جب تک کرنہ بیٹھ سکی تو اڑ گئی، منہ اندھیرے

یہ جیل کہاں سے آگئی؟ میں نے سوچا پھر میں نے خود کو جواب دیا: جہاں سے
یہ جڑیاں آئی ہیں؟

سورج ابھی نہیں نکلا تھا جب بشکو میرے لئے ملائی سے اٹا ہوا دودھ کا
ایک گلاس لایا۔ غسل خانے میں منہ پر پانی کا ایک چھینٹا مار کر میں باہر آیا تو
خدا بخش چو پال کی شیرھیاں چڑھ رہی تھیں۔ چلو ذرا ذخیرے تک گھوم آئیں۔ اس
نے کہا: ”وعدہ کہ آج میں تم کے فنانس کی باتیں کروں گا۔“

”چلو۔“ میں نے کہا، ”پھر میں شیرھیوں پر رک گیا۔“ سنو کیا رنگی چلی گئی؟
دفعۃً خدا بخش کو اس زرد کی منہسی چھوٹی کہ وہ بہت بہت میرے ہنگ پر
جاگڑا۔ آخر کار پتھر میں بھی جو تک لگی تو۔۔۔ فینچوں کے دوران وہ اپنی رانوں کو
پیٹ کر کتنا رہا۔ ”برف کی تہہ بہت موٹی تھی مگر آخر توٹی تو۔۔۔ پھر مجھ سے
پٹ گیا۔“ یار، مجھے تم پر ایک دم بہت سہاوا لگ گیا ہے۔ میں تمہارا مقام اُٹو کے
اُٹو ہی ہو۔ ”بڑی مشکل سے سانسوں پر قابو پانے کے بعد بولا: ”وہ رنگی تو نہیں کہے
جاسکتی ہے؟“ ”سستی پیٹے گی، پراٹھا کھائے گی، اس کی سبلی اسے یوں آسانی سے
تھوڑی جانے دے گی۔“ اماں بیمار نہ ہوتی تو رنگی کو میری بہن اپنے کمرے میں ملائی۔
ابھی تو وہ اٹھی بھی نہ ہوگی۔ پھر ذرا سا ٹپک کر بولا: ”جانے لگی تو تمہیں دکھائی
گئے بلکہ آج شام کی چائے وہیں بابا یارو کے پاس کیوں نہ بیٹیں؟“
”چھوٹے ملک، بشکو چلا یا۔ اور اتنی تیزی سے بھاگتا ہوا آپا کر کیکر پرے
سب جڑیاں ایک ساتھ آؤ گئیں۔

”کیا ہے؟ اماں تو ٹھیک ہیں؟“ خدا بخش نے گھبرا کر پوچھا۔

”جی وہ تو شکیک ہیں۔۔۔ پر۔۔۔“ بشکو کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں، ہنسنے پھول رہے تھے اور منہ مسلسل کھلا تھا۔

”پر کیا؟۔۔۔ کچھ بکری؟ خدا بخش نے اسے ڈانسا۔

اور بشکو نے جیسے کائنات کے سب سے بڑے حادثے کی اطلاع دی کیسی نے آپ کے لارنس کی گردن مروڑ کر پھینک دی ہے۔ لارنس کرا پڑا ہے۔“ خدا بخش کو جیسے سکھ ہو گیا۔ ایک خاصے وقفے کے بعد بولا: ”رنگی کو یہاں لے آؤ۔“

بشکو واپس بھاگا تو میں نے خدا بخش سے پوچھا: ”رنگی کو بلانے کا کیا مطلب ہے؟“

”ہے ایک مطلب۔“ خدا بخش بولا۔

حادثہ شدید تھا اس لئے میں خاموش رہا فوراً بعد بشکو واپس آیا۔ رنگی تو منہ اندھیرے ہی چلی گئی چھوٹے ملک؟

اور خدا بخش اپنی لہولہان آنکھیں مجھ پر گاڑ کر بولا: ”دیکھا میں نہ کہتا تھا۔۔۔ میرے بازو کو اسی کمینے نے مارا ہے‘ رات وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ وہ مجھے مار ڈالے گی۔ میں نے کہا‘ لاہیاں بازوؤں کو نہیں مار سکتیں‘ تاوان۔ اسی نے مارا ہے میرے لارنس کو‘ میں جانتا ہوں یہ قتل اسی بد ذات، کنگلی تلاش لوکی نے کیا ہے۔ میں اس کی کھال اُدھیڑ دوں گا۔ میں اس کی.....“

”انکار کراچی“

بہار کا آخری گلاب

”تم بھی تو شاید شاعری کرتی تھیں؟“

آج انہوں نے پچھلے کے پاس روٹی کھاتے کھاتے یہ بات پوچھی۔ اور دل کی ہانڈی میرے ہاتھ سے گرنے لگتی تھی۔ میں نے روٹی کے بغیر خالی ہاتھ جھلتے تو سے پڑکا دیا۔ اور پھر چلے ہوئے ہاتھ کو بھونکنے کے بہانے اپنی نظریں جھکا لیں مگر وہ دم اچانک نہ جانے کدھر دوڑنے لگا میرے سامنے ایک خلی کی سطریں جیسے دھوئیں میں اُبھرنے لگیں:

”....تم شاعری کرتی تھو۔ ایسی شاعری جو میری رُوح میں اتر جاتی

ہے۔ اور میں جھجکا کے اپنی کہانیوں کی کبابی پیمائش دیتا ہوں۔ اتنی میں ہوئی شاعری۔ اتنی سر بلند شاعری! تم شاعری کرتی ہو تب میں تمہیں دُنیا کی چھین عورت سے زیادہ خوبصورت دیکھتا ہوں۔ آئندہ مجھے اپنی صورت کی تفصیل نہ بتانا۔ صرف یہ کہو کہ آج ختم نے کیا لکھا۔؟“

تباہ میں بھی شاعری کتنی تھی؟

کسی اندھے کو یہ بتانا کہ تو اندھا ہے، کیسی دل خراش بات ہے۔ پھر وہ مجھے بار بار شاعری کا طعنہ کیوں دیتے ہیں۔ میں تو خود اپنے اس جرم کا اقرار کر چکی ہوں۔ اور ہر بار سچ مچ توبہ کی ہے کہ آئندہ یہ تصور کسی نہ ہوگا۔

انہوں نے میرا گھونگٹ اٹھا کے سب سے پہلے یہی کہا تھا۔ مہربانی سنا ہے تم شاعری کرتی ہو۔ یہ بات ہمیں پسند نہیں ہے۔

میرے دل پر ایک پتھر اُڑا تھا۔ مگر میں نے پھر اپنا لولہ ان دل تمام کر کھا تھا۔ اچھا میں شعر کہتا چھوڑ دوں گی۔

پھر میں نے ان کا ہاتھ تمام کر سوجھا۔ اب میں وہی کروں گی جو تم چاہو گے۔ کیونکہ میں ماضی اور مستقبل میں بٹتے وقت لچکتا نہیں چاہتی۔ میں اس شائے سے ٹوٹ کر الگ ہونا چاہتی ہوں۔ جہاں سے میرے بندھن نکل چکے ہیں آج سے میں صرف تمننا ہی ہوں۔ تمننا ہی۔ تم جو کہیں مجھ سے ٹکرا کے بات نہیں کرو گے۔ ہمیشہ شک و شبہ کی نہری لپٹا ہوں سے مجھے دیکھو گے۔ اور میں اپنا یہ خود دار اور خدی سر تمننا سے قدموں میں جھکائے رکھوں گی۔

پھر میں نے اپنی آنسوؤں سے بھری آنکھیں کھولیں تو میں سچ مچ اُن کے قدموں میں جھکی ہوئی تھی۔ اور وہ بڑے تعجب سے بڑی پریشانی سے میرے چہرے کو گھور رہے تھے۔ شاید وہ گھبرا گئے ہوں گے کہ میں پتہ نہیں کس قصد کے اعتراف میں سر جھکائے ہوئے ہوں! مرد ذات۔ سوچ رہے ہوں گے نہ جانے کتنے گناہ آج پہلی بار بخشنا چاہتی ہے۔

اس رات دوشک کے دیا میں ڈوب ڈوب جاتے تھے۔ جیسے میں کوئی ایسا گھر ہوں جہاں چوروں نے ہر چیز کا صفایا کر ڈالا ہو۔ اب وہ ان لیٹروں کے قدموں کے نشان جگہ جگہ ڈھونڈ رہے تھے۔

صبح کو انہوں نے جب خالی بوتل کی طرح مجھے ایک طرف رکھنا چاہا تو میں پیران کے شانے سے لگ گئی۔

”میرے محبوب۔۔۔ میں نے کہاں کہاں تمہارا انتظار نہ کیا تمہارے لئے کیا کیا سوغات لئے بیٹھی تھی۔ آج میں نے اپنی جھولی کے سارے پھول تم پر پھرا کر دیئے ہیں۔ اب تم میری خالی جھولی میں کوئی کھلی کوئی ستارہ کوئی پیار بھرا بول بھی نہ ڈالو گے؟ میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ بات ان سے کہہ دوں! مسگر انہوں نے اپنی بات شروع کر دی۔ اماں کو خوش کرنے کا گڑبہ ہے کہ دن رات ان کے ساتھ چولہے کے پاس بیٹھی رہا کرو۔ وہ تمہیں چند دن میں سب کام سکھا دیں گی۔“

”نا بھئی! میں اپنی دلہن کو شاعری دلاؤں نہ کرنے دوں گی۔ یہ موا ادا رہ جس گھر میں گھسا، لاکھ کا گھر خاک کیا۔“ باہر میری ساس اپنی کسی ٹپو میں کواگاہ کر رہی تھیں۔

اپنی ساس کی اس بات پر میں جی جان سے قربان ہو چو گئی۔ ہائے کتنی اچھی بات کہی انہوں نے! سچ پچ یہ شاعری لاکھ کے گھر خاک کرتی ہے، جس وقت میں نے اپنی نظیں ایک ایک کر کے جلائی تھیں تو کیا یہ لاکھوں کی دولت نہ تھی؟ کوئی میرا ایسا سخی ہو تو لے جو اپنی کمائی گرا پنے ہاتھوں آگ لگا دے۔

”جہیں سبزیاں بہت پسند ہیں۔ چاول بالکل نہیں کھاتے۔۔۔ اب رطل
 اچار۔۔۔ تو بھی اچھا اچار بنانا تو نہیں سب سے پہلے سیکھنا پڑے گا۔“
 وہ پتہ نہیں کیا کیا کہے جا رہے تھے لیکن میرے سامنے تو اپنی نظموں کا
 دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا۔ مجھے ایک آدھ جلتے خط کی سطر میں یاد آ رہی تھیں۔
 ”... جہیں کشمیر پسند ہے نا؟ اس لئے ہم کشمیر کی سیر کر رہے ہیں اور تمہاری
 آنکھوں میں چھپی ہوئی جھیل ڈل میں ڈوبے جا رہے ہیں اور تمہارے کانوں سے
 کشمیری گیت سن رہے ہیں۔ تمہارے شاداب چہرے جیسے باغوں میں گھوم
 رہے ہیں اور تمہارے دل کی طرح وسیع میدانوں میں مٹر گشت کر رہے ہیں
 — مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آج ہم ضرور کوئی دلربا سی نظم لکھ رہی ہوگی۔“
 میلا دل۔۔۔! میں نے اپنے دل پر ایک نظم بھی لکھی تھی۔ یہ دیوانہ مجھے جاننے
 کون کون سے کنزیر جھنکوائے گا۔ یہ دل جو اٹنی مانتے نہ سیدھی۔ دن نکلے
 تو رات کے غم میں روئے۔ رات ہو تو دن کی عبادتی میں ٹر پے۔

اپنی اس نظم کو پڑھ کر میں خود ہی رو پڑی تھی۔ جانے کیسے مٹرن دیوانی تھی
 میں کہ اپنی نظموں سے خود ہی پیار کرتی۔ مہنتی تھی اور روتی بھی۔ یہ نظمیں میری
 راز دار تھیں جو بات دل میں آتی وہ خود خود کاغذ پر پھسل جاتی تھی۔ اب میں کیسے
 کیسے ختم کرتی۔ کاغذ کے ان پردوں کو چھپانے کے بیگنوں کے نام۔ رقص و قوں
 کی تتوں میں اکورس کی کتابوں میں بچہ بھی نہ تو چڑیل دیکھ ہی لیتی تھی۔ پڑھتی جاتی
 اور روتی جاتی کیسی عجیب سی بات تھی کہ ہم دونوں مہنتوں کا ڈکھا ایک تھا۔ معمولی
 سی صورت شکل گھر پر چھائی ہوئی مجلس اور نظر سے ٹھکرائے جانے کا دکھ۔ ابا کا

سیاہ رنگ اور اماں کا بے ڈھنگا نقشہ ہم دونوں بہنوں میں تقسیم ہوا تھا۔
 بہت دنوں کی بات ہے جب میں شاید ساتویں یا آٹھویں کلاس میں نقل
 ہوا کرتی تھی "ایک دن اپنے پڑوسن میں ہم ایک دوسرے دیکھنے گئے۔ ہائے کیسی
 خوبصورت دوسن تھی سچ پچ چاند کا ٹکڑا۔

"دیکھا بھیا" ایسی ہوتی ہیں دوسنیں۔ گوری گوری۔ "نموتے رنگ ہری
 نظروں سے دیکھا اور پھر اس لمحے میں بولی "بھیا اب اپنا بیاہ تو نہیں ہو گا۔
 کیونکہ سب دو لہا گوری دوسن چاہتے ہیں؟

"چپ بے شرم" میں نے اسے دھکا دے کر کہا۔ مگر دل میں خمو کی بات
 نے چاقو چھو کر چھوڑ دیا۔ واقعی میں نے بھی کالی دوسن کبھی نہیں دیکھی تھی۔
 اور پھر میں نے بڑے دھکے کے ساتھ سوچا تھا کہ میرا وہ لہا کبھی نہیں آئے گا۔
 مجھے کوئی بچہ اسی کہہ کر نہیں پکارے گا۔

بس اسی رات میری شاعری کا آغاز ہوا تھا۔ میں نے پہلی نظم لکھی تھی۔
 ایک ایسی لڑکی پر جسے انڈیا میں ہر چیز دینا معمول گئے تھے۔ دولت، صورت
 محبت، بے فکری — کوئی نعمت اسے نہیں ملی تھی —

اور پھر تو یہ شاعری کا رنگ جیسے میری جان کو لگ گیا تھا۔
 ادھر اماں ہمارے بڑھتے ہوئے قد کو دیکھ کر بابا کو کھائے ڈالنی تھیں کہ
 ان لڑکیوں کے لئے کچھ تو جمع کرو۔ مگر کی اس بے سرو سامانی کو دیکھ کر میرا دل
 ڈوبا جاتا تھا کہ یہاں کوئی گریا لینے آئے گا؟

انہیں دنوں ایک بار میں زہرہ خاں کے ساتھ ان کے کالج کے ایک

فلکشن میں گئی تھی۔ رہاں کوئی نام نہ ہوا نہ گانا۔ صرف ایک کالی، موٹی بھٹی چارہ کی صورت عورت آئی تھی اپنی کہانی سنانے، مگر اٹھ جانے اس میں کیا بات تھی کہ خلقت خدا کی اسے دیکھنے کو ڈیڑھ پڑتی تھی۔ کالج کی لڑکیاں اس کے آؤ گراف لینے کو مری جا رہی تھیں۔ اور وہ تھی کہ خوشی کے مارے کھلی جا رہی تھی۔ ایک ایک سے جھبک جھبک کر مل رہی تھی۔ جب میں نے ایک لڑکی سے پوچھا کہ یہ کون ہیں تو سب کو میری جہالت پر بڑا ترس آیا۔ اے ہے جاہل بے چاری چاندی کو نہیں پہچانتی۔ اتنی مشہور افسانہ نگار کو؟

اس دن میں گھر لوٹی ہوں تو چاند سورج میرے ساتھ ساتھ آئے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں بھی چاندنی بنوں گی۔ لوگوں کی حقارت بھری نظروں کو لات مار کے شہر کے آسمان پر رہا بیٹھوں گی۔ دیکھوں تو پھر دنیا مجھ سے کیسے منہ پھیرے گی؟

رات ہوئی تو میں نے سوچا کہ چاندنی کا قصہ سنایا۔ اسے بھی کسی طرح یقین نہ آیا کہ ایسی بد صورت عورت کی اتنی عزت ہو سکتی ہے۔

دوسرے دن ہم دونوں بقیعوں میں کتابیں دبا کر اسکول کی طرف دوڑ رہے تھے۔

پھر دوڑتے ہی چلے گئے۔ اتنے تیز کہ نہ تو مجھے چھوڑ کر آگے بھاگ گئی۔ اس نے ایم۔ اے کیا اور ایک کالج میں لیکچرار ہو گئی۔

لیکن میں شاعری کے کائناتوں میں الجھ کر مرف بی۔ اے کر سکی۔ بقول اماں کے شاعری نے مجھے بہاد کر ڈالا تھا۔ کورس کی کتابوں کو بھول کر

مجھے نہ دیکھتی۔ سارے دن انگلیش کی دوسری آلا بکاتا میں بڑھے جاتی۔ ان کتابوں کو پڑھ کر میرا دماغ اور بھی خراب ہو رہا تھا۔ رات بھر ٹھٹھل ٹھٹھل کر نکلیں لکھی جاتیں اور دن بھر بنگ پر اوندھی لیٹی ایڈیٹروں کے تعریفی خطوط پڑھے جاتی تھیں۔ اماں کہتی تھیں کہ میری صورت پر ٹھیکرے برسے لگے ہیں۔ سر پر کا ہوش نہیں رہا۔ یہ شہرت جانے کب اور کہاں سے نکل کر میرے ساتھ چلنے لگی تھی میں چونکی تو ہر سالے کا ایڈیٹر کہہ رہا تھا کہ آپ کی نغمہ نہیں آئے گی تو ہمارا سالہ مکمل نہ ہو گا۔

ڈاکر آنا تھا تو اپنے جھولے کے آدھے خط ہماری کمر کی میں پھینک جاتا تھا۔ پھر اماں بڑی کاہلی سے اُٹھتیں اور سوپ میں خط بتور کے میرے ہنگ پر اٹھیل دیتی۔ ”لو بتو، تمہاری ڈاک آگئی۔ بیکار خط سوپ میں ڈال دیا مجھے بولسا جلاتا ہے۔“

تب مجھے خیال آنا کہ تمہاری کمائی سے ہنڈیا چولے پر رکھی جاتی ہے اور میری کمائی سے چولہا سلگتا ہے۔

آپا ہمارے دو لہکا کا انتظار کرتے کرتے قبر میں جا سوتے تھے۔ اماں بھی ہمارے بوجھ سے تھکی جا رہی تھیں۔ انہیں دل دھڑکنے کی بیماری ہو گئی تھی۔ اب گھر کی کیسوں بار تھو تھیں۔ اور نمونہ آنکھوں میں کیسی چمک تھی! اس کی چال میں کتنی خود اعتمادی تھی! اس کے سیاہ رنگ میں سُرخ جھلکتی اور وہ ہر وقت چنے جاتی تھیں۔ بعض اوقات میں جھنجھلا کے سو رہتی کہ کون سا تار دن کا خزانہ ہنڈی لگ گیا ہے اس لڑکی کو؟

پھر آماں نے ایک دن پچھتو کے ہاتھ قارون کا خزانہ لگ جانے کی خوشخبری سنائی۔ اس کا پیغام آیا تھا۔ لڑکا نتو کے کالج میں لیکچرار تھا اور نتو کو بہت چاہتا تھا۔ یہ سن کر میں بھی بہت ہنسی — میری پیاری بہن اختر تجھے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی نا! آج مجھے بھی قارون کا خزانہ مل گیا تھا۔ لگتا تھا ہیشہ کی بے رحم میرے قہقروں کو روک کر سنا مشروع کر دیا۔ "نوشادی سے انکار کر رہی ہے۔ کتنی ہے میں دم دونوں کو کس سہارے چھوڑوں!"

شام کو نتو کالج سے آئی تو کہنے لگی: "بھیا، آپ کا پتنگ کتنا جھلکا ہو گیا ہے ذرا اٹھئیے ہیں نواؤ کس دوں؟"

میں نے خود کیا — نتو ٹھیک کہتی ہے۔ میں نے لیٹے لیٹے اس گھر کے پتنگ توڑ ڈالے ہیں — پھر میں نے آماں سے کہا۔

"اس لیکچرار کا پیغام نہیں روکیا جائے گا۔ نتو کوئی خدا ہے کہ میں پالے گی! میں کسی اسکول میں ملازمت کروں گی۔ اس پر نتو بہت روئی چلائی۔ سوہ کہتی تھی: "بھیا آپ نوکری نہیں کر سکتیں۔ آپ کی شاعری کا سوڈاں ہو جائے گا اور آپ شاعری نہ کریں گی تو مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ لوگ کیا کہیں گے....؟"

لوگ — لوگ —! ان لوگوں کے لئے ہم نے کیا کیا نہ کیا۔ پھر بھی ہم ان کے خوف سے مرے جاتے تھے۔ یہ لوگوں کا خوف ہی تو تھا جو اتنی شہرت نے مجھے پاگل نہ ہونے دیا۔ سالانہ مجھے ہسکا نے ناؤں کی کمی نہ تھی۔ اپنے دماغ میں تو ایک عورت کا نام ہی گھسنے والے مردوں کو رومانی بنا دیتا ہے اور اگر اس نام کے آس پاس شہرت کی چمک دیکھ ہو تو ہزاروں دیوانے مر جاتے

تہیہ کر ڈالے تھیں۔ اب مجھے اپنی ڈاک دیکھ کر چاندی یاد آتی تھیں۔ اب انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا، اور تیسرے شوہر سے بھی طلاق لے کر شنا ہے، پنجاب کے کسی گاؤں میں گننامی کی زندگی گزار رہی تھیں۔

میرے آگے بھی دنیا بہت بڑی تھی۔ ادب بھی پھیل جاتی اگر کل برہنہ سے میرا راستہ نہ بند کر دیتا۔

اُن دنوں میں بڑی میاکی اور اٹھنا د کے ساتھ دوسرے شہروں کے مشاعروں میں جاتی تھی، نشے میں چوہا یک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے شہروں کے ساتھ راتوں کو سڑکوں پر چلتے وقت مجھے ڈراؤ نہیں لگتا تھا۔ کیونکہ ہر جگہ دھچکی دھچکی لگاؤں میں میری نگرانی کرتی تھیں۔ ہر وقت ایک سایہ میرے پیچھے پیچھے چلتا تھا جیسے میں کسی کی پناہ میں ہوں۔ میرے راستے کے سوائے خنجر کوئی آگے سے بٹانا جاتا تھا۔ میرے یوں آزاد گھومنے پر اتان کو سخت اعتراض تھا۔ تو بھی اظہارِ ناپسندیدگی کے طور پر دروازہ کھولنے کے بعد یہ جنانا نہ بھولتی کہ اب رات کے دو بجے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے میری فیکوں پر بات کرنا چھوڑ دی۔ میری ڈاک سے اسے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ جن رسالوں میں میری نظمیں چھپتی تھیں انہیں اپنی میز سے اٹھا کر میرے پلنگ پر ڈال دیتی تھی، البتہ اس کا خلوص کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

”بجیا، آج آپ کے لئے ایک ہینڈ لوم ساڑھی لائی ہوں۔“

”بجیا کے لئے ایک گٹری خریدتا ہے۔“

کھانے کے وقت بھی وہ خوب شور مچاتی۔

”بجیا اتنا دماغی کام کرتی ہیں، ااں، آپ انہیں روزِ گوشت کا سبب پوچھتے
میرے لئے وال کافی ہے۔“

”تب میں سوچتی، نمونہ کیسی ڈیپو میٹ ہے، وہ کتنی کمزری کھڑی ٹٹا کر فوڈ سے
درخواست کر رہی ہے کہ میں اس گھر سے پہلے جاؤں۔“

میں اپنی شاعری کے پتنگہ لگا کر آسمانوں پر اڑتی رہی۔ اور نمونہ نے کتنی
مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم دھرتی پر جما لئے تھے۔ ہم دونوں نے ساتھ ساتھ
دوڑنا شروع کیا تھا۔ مگر میں کتنی غلط راہ پر چل پڑی۔ کانٹوں اور پتھروں نے
میرے سارے ارادے لہو لہان کر دیئے تھے۔

بعض وقت نمونہ، ہنس کر کہتی ”بجیا، آپ بغیر سوچے سمجھے جانے کیسے ہر کام
شروع کر دیتی ہیں۔“

نمونہ کی یہ بات میرے دل میں اُتر جاتی۔ واقعی میں جانے کیسے ہر
بات سوچے سمجھے بغیر کر بیٹھتی ہوں۔ اب اسی بات کو لے لو۔

کسی طرح یاد نہیں آتا کہ مکمل سے میں نے اپنا جلتا کب اور کیوں شروع کیا
تھا۔ حالانکہ وہ ہندی کا بہت مشہور افسانہ نگار تھا اور ہندی والوں سے
ہم اردو کے شاعروں کی ویسے بھی کب بنتی ہے؟ پھر مکمل تو یوں بھی بڑا کا
جھگڑا ہوا تھا، ویسے اور کوئی خوبی بھی نہ تھی اس میں۔ پانچ بچوں کا باپ،
بیمار اور چڑچڑی بیوی کا تابع وار خورہر۔ سو کھانا چرخر۔ کسی اخبار کے آفس
میں ہزار ڈیڑھ ہزار کا ملازم تھا۔ مگر جانے یہ کیسے ہونے لگا کہ میں جس مشاعرے
سے واپس آتی وہ میرے ساتھ ہوتا۔ مٹرک پر چلتے چلتے مجھے جب بھی اس کا

خیال آتا وہ میرے سامنے کھڑا ہوتا۔ میں ڈانس پر جاتی تو وہ سب کے سامنے بیٹھا مجھے دیکھے جاتا تھا۔ میں اُتر کے نیچے آتی تو وہ آگے بڑھتا۔

آؤ، آج تو آپ نے ہمیں ہلا ڈالا۔ ذرا اپنے کھسے کی رفتار روکیے، تھرمزورڈ اس شر کے سارے شاعر اپنا منہ کالا کر کے فرار ہو جائیں گے۔

پھر اس نے مجھے ایک خط لکھا، بہت ہی صندب سا۔ یہی کہ میری نظموں نے اسے بہت متاثر کیا ہے۔

یہ خط مجھے بڑا بے ضرر سا لگا۔ اس کی کچھ طلب کرتی ہوئی، چاروں طرف راستہ گھیرتی ہوئی آنکھوں سے زیادہ سکون بخش۔

دیے بھی مجھے اطمینان رہتا تھا کہ کبھی کوئی ایسا آدمی میری طرف نہیں بڑھ سکے گا۔ جس نے مجھے قریب سے دیکھا ہو جو میری فضول سی صورت، بے ڈھنگی اور وسطی قسم کی باتوں سے واقف ہو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ منامی ادبی حلقوں میں کبھی میری بہت افزائی نہیں ہوئی۔

کمل کے خط پڑھتے گئے چند دن بعد تو یہ نامکمل سا ہو گیا کہ اس کا روز ایک خط نہ آجائے۔ مجھے اپنی ہر نظم اسی طرح یاد ہے کہ کمل نے اس کے بارے میں کیا لکھا تھا۔ وہ جہاں ہوتا، جس موڑ میں ہوتا مجھے روز ایک خط لکھا کرتا تھا۔ چاہے آفس کے کسی کام سے کشمیر جائے، بچے کے ساتھ ہسپتال میں جو بیوی کے میکے میں جو یا کسی ادبی محفل میں۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خط لکھے جاتا تھا۔ کوئی شہنا تو کبھی یقین نہ کرتا کہ میں نے ان محبت اور شہنشاہی سے سب پریشوں کا ایک بار بھی جواب نہیں دیا۔ ہم دونوں میں ایک خاموش سا سمجھوتہ ہو چکا

تھا کہ وہ جو جی میں آئے مجھے لکھے جائے گا۔ اور میں صرف ثنا کروں گی۔

مگر وہ کب تک محتاط بنا رہتا! اس نے پہلے اپنے خلیص کو حقیقت میں بدلا، پھر محبت میں اور پھر بلا لگی پن میں، اور جتنے اس کے خطا بڑھنے گئے اتنا ہی وہ خود بہت کم ملتا تھا۔ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی کبھی کبھی نظر بھی آجاتا تو بڑا اجنبی بن کر بڑے تکلف کے ساتھ بات کرتا۔

ایک دن آخر کل مل ہی گیا۔

ایک بہت بڑا آل انڈیا مشاعرہ تھا۔ ہندی والے بھی اس کے لئے مالی مدد کر رہے تھے۔ مشاعرہ شروع ہونے میں کچھ ہی دیر تھی۔ لوگ باہر گیلری میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کل کو اکیلا دیکھ کر میں اس کے پاس چلی گئی۔ اسے ساتھ لئے جان بوجھ کر اس طرف بڑھنے لگی۔ جہاں کوئی نہیں تھا، جہاں درختوں کی آڑ میں اندھیرا سا کروا تھا۔

”مجھے بتاؤ کل میں نے آج تک تمہارے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ پھر

تم مجھ سے اس کی شکایت کیوں نہیں کرتے؟“

”کیونکہ مجھے تمہارے جواب کا انتظار نہیں ہے۔“ اس نے سنبھل سنبھل کر کہا۔

اس وقت ہمارے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو شبہ بھی نہ ہوا ہو گا کہ اس وقت ہم دونوں کیسے بھنور میں گھرے چکولے کھا رہے ہیں۔

”تم — تم اتنے اُدھے آدوش رکھتی ہو۔ اتنی جہاں کھلا کار ہو، اور پھر تم ابھی

صرف بیس برس کی ہو۔ تمہارے لئے دنیا بھر بھیلانے کھڑی ہے۔ عزت، دولت، شہرت ہر چیز تمہاری منتظر ہے۔ میں تمہاری راہ کیوں کھوٹی کروں۔ میں تو ایک غریب

آدمی ہوں۔ بیوی بچوں والا۔ چالیس برس کا بوڑھا۔ اب میرے جیون کا صرف ایک ہی مصروف ہے کہ اپنی ہر ذمہ داری کو پورا کرتا رہوں مگر۔۔۔ مگر پھر بھی میں تمہارا مسنون ہوں کہ تم نے میری کسی بات کا بُرا نہ مانا۔ مجھے اپنی تنہائی کے صحرا میں کیا گلاب ہسکانے کی اجازت دے دی ہیں نے تمہاری بدولت جان لیا کہ کسی کے لئے اپنی ذات کو بھلا دینے کا شکہ کیسا ہوتا ہے۔۔۔۔۔“

وہ جانے کیا کیا کسے جا رہا تھا۔ مگر مجھ سے تو اس نے ایک لمحہ میں ہر سکہ چھین لیا تھا۔ اس خود غرض انسان نے جو میری بہار کی ساری ادھ کھلی کھیاں اُجاڑ کر اپنے من میں گلاب ہسکا رہا تھا۔

اگر اس وقت میرے قریب ایک لگائی بھگائی کرنے والا چنل خورد شاعر نہ کھڑا ہوتا تو شاید میں کل کی باتوں میں جا گرتی۔ شاید زور زور سے رونے لگتی۔ نہ تو کہنتی تھی ”بیبا، آپ ہر بات سوچے سمجھے بغیر کیسے کر ڈالتی ہیں؟“ مگر اس روز میں کتنی مصلحت پسند تھی! اگر اس دن میں ان باتوں پر غور نہ کرتی تو شاید وہ دن کبھی نہ آتا جب مجھے کل کے ہر خط کے ساتھ اپنی ایک نظم جلاتا پڑی تھی۔ اور جب سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا تھا تب میں نے سوچا کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو اس راکھ کا اتنا سب کچھ کے نام کرتی۔

لیکن میں کچھ بھی نہ کر سکی تھی۔ بلکہ مدد مشاعرہ کو آتے دیکھ کر میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ انہیں سلام کیا تھا۔

”اب کیسے ہیں آپ!“ یہ بات میں نے پاس سے گزرتے ہوئے کسی شاعر سے کہی تھی یا کل سے! خون میرے کانوں میں سنسنار رہا تھا۔ اور میں گرنے سے

پہلے کسی سہارے کو تھامنا چاہتی تھی یہ پلو۔ تم اب گھر واپس چلی جاؤ۔ اپنے گھر جاؤ۔ کل مجھے تنہا کر کے رہا تھا۔ نہیں گھر میں بھی جگہ نہیں رہی۔ کہیں بھی جگہ نہیں ہے۔ پھر کل مجھے رکشائیں بٹھا کر گھر لایا۔

جب مجھے ہوش آیا تو اتاں مجھے موسمی کارس پلا رہی تھیں کھل سا منہ کر سی پر میٹھا تھا اور تمنا اس سے کہہ رہی تھی: ”آپ ٹھیک کہتے ہیں کل بھائی بیٹا تو بچیا کے بھی کئی ہیں۔ مگر بچیا بیاہ کے لئے راضی ہی نہیں ہوتیں۔ اللہ جانے کس کا انتظار کر رہی ہیں۔“

”ایک لڑکا تو سیکریٹری ایٹ ہیں تین سو کا نوکر ہے۔“ اتاں نے فوراً تفصیل شروع کر دی۔

”وہ خود ہی شاعر ہے، مٹا ہے مولانا بھٹل بگراسی کا شاگرد ہے، چائے، سنگریٹ، شراب کچھ نہیں پیتا۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے۔“

”مگر بچیا۔۔۔ بچیا کا موڈ۔۔۔ بچیا کی پسند۔۔۔ تو میری طرف دیکھو دیکھو کر گھورتی جا رہی تھی۔“

”بس بس بہت ہو چکا تمہاری بچیا کا لاڈ۔“ اتاں نے غصے میں نٹوکی بات کاٹی۔ ”جائے کیوں اللہ میاں نے اس کا داغ ہی اوندھا کر دیا ہے جب ہی تو ایسی حالت ہو گئی۔ اب میں کچھ نہ سوچوں گی۔ کھل صاحب، آپ اپنی عورتوں پہنوں کا ساتھ ساتھ بیاہ کر دیجئے، بتائیے بھلا میں کسی مرد کے بغیر ان دونوں کے فرض سے کیسے سبکدوش ہوں گی؟“

”وہ تو ٹھیک ہے، میں سب کچھ کروں گا۔ آئندہ آپ کو میرا فرض یاد دلانے

کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اماں! کمل جان بوجھ کر میری طرف نہیں دیکھتا تھا۔
 مگر ان کا جیون ساختی کوئی آرٹسٹ ہونا چاہئے۔ بڑے لطیف ذوق والا،
 بڑے حسّے والا۔ جو انہیں سنبھالے رہے۔ ان کی شاعری کی رفتار مدھم مدھم نہ
 پڑ جائے، ورنہ عام لکھنے والیوں کی طرح کہیں گھر داری میں گھر کے.....
 کہیں... کہیں...“

”بس بس رہنے دیجئے۔“ میں نے جھجلا کے کہا: ”شراب سگریٹ چاہتے
 کچھ نہیں دیتا۔ تین سو روپے کماتا ہے، اور کیا چاہیے مجھے۔ اماں تم تم کو کے
 بیاء کی تیاری کرو۔ اب تاراج مقرر کرو۔“

پھر میں نے سوچا کہ جانے میرے لئے اس پیغام کو ڈھونڈنے کے لئے
 تمہو نے کتنی جدوجہد کی ہوگی۔ میں کب تک اس گھر میں بیٹھی رہوں گی۔ کوئی
 تمہیکہ لے رکھا ہے۔ تمہو نے میرا، تمہو کو کتنا ارمان ہے دامن بننے کا ہم دونوں
 بہنوں کو بٹھایا گیا تو اچانک تمہیں پڑی۔ اس نے اپنا گھر نکلت ہٹا کے
 مجھے دیکھا اور آہستہ سے بولی بجیا آج مجھے بڑی ہنسی آرہی ہے۔
 ”تو ہنسنا۔“

”گھر آپ۔ آپ۔؟“ وہ میرے چہرے پر جانے کیا دیکھ کر گھبرا گئی؟
 ”ہاں مجھے بھی ہنسی آرہی ہے تمہو۔ آج تو جی چاہتا ہے۔ دنیا کی ہر
 بات پر ہنسنوں ہر چیز کا مذاق اڑاؤں؟“

”.... تم جب وہ بنو گی، میں اس وقت بہت دُور بیٹھا تمہیں دیکھ رہا ہوں گا۔
 جانے تمہارا دل کہا اس خوبصورتی کو دیکھنے کی تاب کہاں سے لائے گا؟“

آج تمہارے چہرے پر کتنے خوبصورت خوابوں کا اُجالا ہو گا؟

”اس لمحے جب تم ادب، شاعری اور میری بکواس سے پرے — کسی پر اپنا تن من بچھا دو کر رہی ہو گی تو تمہیں کہاں یاد آئے گا کہ کوئی تمہیں اپنی روح کی گرائیوں کے ساتھ مبارک باد دے رہا ہے۔“

”آج تمہارے شکم کا گلاب تمہارے دلہا کے چہرے پر کھلنے والا ہے۔“

”اب میں تمہیں کبھی خط نہ لکھوں گا۔ بس ہر نئی نظم میں

تمہاری کامرانیوں کی خبریں سن لیا کروں گا۔“

جلتی ہوئی روٹی کو جدی سے راکھ میں چھپا کر میں سوچتی ہوں کہ میں نے اپنی کامرانیوں کی کوئی خبر کبھی نہ بھیجی۔

یہ کیسی اچھی بات ہے کہ میری بہار کا آخری گلاب ابھی تک نہیں مڑھایا۔

کہیں میرا ایک خوب صورت سا ہنستے گلاب جیسا خیال زندہ ہے کسل میں چھپا ہوا۔

”بانو“ وہی

وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے

پھر یہی ہوا کہ یاجوج ماجوج رات بھر دیوار کو چاٹا کرتے۔ یہاں تک کہ دیوار تحلیل ہوتے ہوتے انڈے کے چھلکے کی مانند ہو گئی اور پھر یاجوج ماجوج ٹھک گئے اور انہیں نیند آنے لگی اور وہ یہ کہہ کر سو گئے کہ باقی دیوار صبح کو چائیں گے۔ مگر جب وہ صبح کو اٹھے تو دیوار بھر اُدھنچی اور سوئی ہو گئی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ پھر اپنی کوتاہی پر گھپٹائے۔ اور انہوں نے پھر یہ عزم باندھا کہ آج تو ہم دیوار چاٹ کر ہی دم لیں گے۔ سو جب شام ہوئی تو پھر وہ اپنی لمبی لمبی زبانیں نکال کر دیوار کو چاٹنے لگے۔ چاٹتے رہے چاٹتے رہے۔ یہاں تک کہ رات کا کجرا پھیلنے لگا اور دیوار انڈے کے چھلکے کی مثال رہ گئی مگر یاجوج ماجوج اب ٹھک کر چور ہو گئے تھے اور زبان ایٹنے لگی تھی اور پوٹے نیند سے بوجھل ہو رہے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ سید سکندری کو ہم نے واقعی چاٹ لیا ہے۔ دم ہم کے لئے سولیں۔ پھر تازہ دم ہو جائیں گے اور دوزبانیں پھیر کر اس کا ستر اٹھ کر دیں گے۔ سو یاجوج نے ایک کان ٹیچے بھجایا اور دوسرا کان اُڑھ کر سو گیا۔ ماجوج نے

بھی اپنا ایک کان نیچے بچھا یا اور دوسرا کان اوڑھ کر سو گیا۔

یاجوج ماجوج صبح کو سو کر اٹھے تو انھوں نے دیکھا کہ دیوار تو پھر پہاڑ کی مثل ان کے سروں پر کھڑی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ ایسے ڈھے گئے جیسے برسات میں کچی دیوار ڈھے جاتی ہے۔ یاجوج نے بہت دکھ کے ساتھ یاجوج سے کہا کہ ”اے یاجوج! کیا ہمارے عمل کا کوئی حاصل نہیں ہے؟“

یاجوج ڈھکی آواز میں بولا کہ ”شاید ہماری تقدیر ہی یہ ہے کہ روز رات کو دیوار چٹا کرے اور روز صبح کو دیوار کو وگراں کی طرح ہمارے سروں پر کھڑی ہو جائیگا۔ اس پر یاجوج مایوس ہو کر بولا کہ ”اگر میں بات ہے تو دیوار کو ہم چٹا کئے تو کیا اور نہ چٹا کیا تو کیا۔ پس قبل اس کے کہ وقت ہمیں چاٹ لے ہمیں چاہیے کہ دیوار کی طرف پشت کریں اور تھوڑا زندگی کو چھکیں۔“

تب قوم یاجوج ماجوج کا وہ بوڑھا جواب اپنی عمر کے ہزاروں سال میں تھا۔ پہاڑ کی کمزور سے نکل کر باہر آیا اور بولا کہ ”اے یاجوج ماجوج ہر شے کے ایک معنی ہیں اور ہر عمل کا ایک حاصل ہے۔ کوئی دیوار ایسی نہیں کہ سدا کھڑی رہے۔ ڈھینا دیوار کا اور چٹا زبان کا مقدر ہے۔ اور میں نے تمہارے باپ یا نٹ سے اور تمہارے باپ یا نٹ نے اپنے باپ فوش سے یہ سنا ہے کہ اولاد ان کی مذہب سیکھ کر کو ایسے پہاٹ لے گی جیسے دن رات کو چاٹ لیتا ہے۔ پھر وہ آزاد ہو کر کھلے میدانوں اور ساداب سبزہ زاروں میں پھیل جائے گی اور وہ زبانیں جو پتھر جاتی تھیں۔ خیر جن چشموں تک پہنچیں گی۔ پہلے قوم یاجوج ماجوج کا اگلا گروہ طبرستان کے ٹھنڈے پھٹے چشمے تک پہنچے گا اور وہ اتنا پیاسا ہو گا کہ چشمے کا سارا پانی

پی جائے گا۔ جب دیکھا کہ وہاں پہنچے گا تو خشک چشے کو دیکھ کر کہے گا کہ شاید یہاں آگے کبھی پانی تھا۔

بوڑھا تو واپس پہاڑ کی کھوہ میں چلا گیا مگر اس کی بات ماجوج کے بیٹے نے سن لی تھی اور اس نے اپنے پہاڑ میں جا کر آل ماجوج کو جمع کیا اور سوال ڈالا کہ اُسے آل ماجوج، کیا ختم سید سکندری کے ٹوٹ جانے پر بھی پیچھے رہ جانے والوں میں رہو گے؟

آل ماجوج نے پوچھا کہ تو نے کیا دیکھا جو ایسا سوال زبان پر لایا؟ ماجوج کا بیٹا بولا کہ کیا ختم نہیں دیکھنے کہ آل ماجوج نے سرسبز پہاڑ پر قبضہ کر رکھا ہے اور ہمارے حصے میں بھرپور آلی ہے۔ وہ پیٹ بھر کر تل کھاتے ہیں جبکہ ہم پتھر چاٹ کر میٹ پالتے ہیں۔ اب جبکہ سید سکندری ٹوٹنے کو ہے تو میں نے قوم کے بزرگ سے یہ سنا ہے کہ جو گروہ اس قیدی سکندری سے پہلے نکلے گا۔ وہ طبرستان کے غنیمتیں چشے پر پہلے پہنچے گا اور سیراب ہو گا۔ جو گروہ بعد میں نکلے گا وہ چشے پر بعد میں پہنچے گا اور اسے خشک پائے گا تو اے ماجوج کے محروم بیٹو! کیا تم اس قید سے رہائی کے بعد بھی پیچھے رہ جانے والوں میں رہو گے؟

یہ کلام سن کر آل ماجوج نے تاد کھایا اور بیخ کر کہا کہ اپنے باپ ماجوج کی اس لمبی زبان کے دم سے جو سید سکندری کو پاٹ کر پوست بھیڑنا دیتی ہے ہم پیچھے رہ جانے والوں میں نہیں رہیں گے اور تشنہ لبوں میں شمار نہیں ہوں گے۔ اور صراحتاً ماجوج کو بھی یہ خبر مل چکی تھی کہ سید سکندری اب ڈھینے والی ہے۔ اور آل ماجوج سب سے پہلے نکل کر طبرستان کے چشے سے سیراب ہونے کے

لئے کمر باندھ رہی ہے۔ آل یا جوج نے یہ سُن کر غصہ کیا کہ ماجوج کی آل نے ابھی سے چشموں پر قبضہ کرنے اور سبزہ زاروں پر چھاپانے کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ اُنھوں نے غصہ کیا اور اعلان کیا کہ ہم ان میں سے نہیں ہوں گے جو پیچھے رہ جاتے ہیں اور سوکھے چشے سے نکل کر چلتے ہیں سو ابھی رات باقی تھی وہ اپنے پہاڑ سے نکلے اور دیوار کی سمت چلے۔ مگر ادھر ماجوج کے بیٹے پرتے بھی اپنے پہاڑ سے نکل پڑے تھے اور آل یا جوج سے پہلے دیوار تکسب پہنچ جانا چاہتے تھے۔

رات کے اندھیرے میں یا جوج کے بیٹوں نے ماجوج کے بیٹوں کا راستہ کاٹا۔ اور ماجوج کے بیٹوں نے لپک کر یا جوج کے بیٹوں کو جا لیا تب ماجوج کے بیٹے ماجوج کے بیٹوں سے اُلجھے اور ماجوج کے بیٹوں نے یا جوج کے بیٹوں کو لٹکارا۔ وہ آپس میں لڑتے مارتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور اُنھوں نے دیکھا کہ ماجوج ماجوج سوئے پڑے ہیں اور سید سکندری بھراؤ پچی اور موٹی ہو گئی ہے۔ یہ دیکھ کر اُنھوں نے اپنی راہ لی اور واپس اپنے پہاڑوں میں چلے گئے۔

جب پہاڑ ساون کٹ گیا اور رات نے ڈیرہ کیا، تب ماجوج ماجوج نے پھر اپنی زبانیں تیز کیں اور دیوار چاشنی شروع کر دی اور ابھی رات باقی تھی کہ دیوار کے ڈھچے مارتے کی امید لے کر اور شیریں چشے سے سیرابی کا تصور باندھ کر آل یا جوج اپنے پہاڑ سے نکلے اور آل ماجوج اپنے پہاڑ سے ہمارہ ہوئی۔ اُنھوں نے بھوکا دھڑکا کا دستہ کاٹا اور پھر آپس میں دست دگیاں ہوئے۔

ماجوج ماجوج کے بیٹے رات بھر آپس میں لڑا مڑا کئے اور خونم خون ہو گئے۔

جب تڑکا ہوا تو انہوں نے یہ دیکھا کہ یاجوج ماجوج سو گئے ہیں اور دیوار پھر سپاڑ کی طرح بلند اور سنگین ہو گئی ہے۔ یہ دیکھ کر ہیزاد حم نے انہوں نے اپنا اپنا رستہ پکڑا اور واپس اپنے اپنے سپاڑوں کو پہلے۔

دن پھر کسی نہ کسی طور کٹ گیا اور رات پھر لگئی۔ مگر آج آل یاجوج یہ تہیہ کر کے نکلی تھی کہ روزِ روز کا خرخشہ ختم کر دے اور رستے کا لانا نکل چسکیو۔ تو انہوں نے بنے خجری میں آل ماجوج کو جالیا اور ان کے سپاڑ سے نکلنے سے پہلے ان پر طہ بول دیا۔ انہوں نے ان کے گھروں کو لوٹا، جوانوں کو قتل کیا اور عورتوں کو بے عزت کیا۔ یہ قیامت دیکھ کر ماجوج کی بیٹی اپنے خیمے سے نکلی اور یاجوج کے بیٹوں سے مخاطب ہوئی کہ ”اے مرے دادا کے بیٹے کے بیٹو! کیا تم ہم میں سے نہیں ہو اور ہم تم میں سے نہیں ہیں کہ تم ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو؟“

یاجوج کے بیٹے نے یہ سن کر تازہ کھایا اور کہا کہ ”اے ماجوج کی بیٹی! ہم تم میں سے کیونکر ہو سکتے ہیں اور تم ہم میں سے کیسے ہو جبکہ ہم یاجوج کی اولاد میں اور اپنے سپاڑ میں رہتے ہیں۔ اور تم ماجوج کی اولاد ہو اور اپنے سپاڑ میں آباد ہو۔“ ماجوج کی بیٹی یہ سن کر چلائی اور بولی کہ ”اے مرے دادا کے بیٹے کے بیٹے! کیا تم اس سے انکار کرے گا کہ یاجوج ماجوج ایک باپ سے پیدا ہوئے اور ایک ماں کی گود میں پلے؟“

یاجوج کا میثا قطن انداز میں بولا کہ ”اے ماجوج کی بیٹی! میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ ہم یاجوج کے بیٹے تو ہم یاجوج میں اور اپنے سپاڑ سے پہلے جلتے ہیں۔“ ماجوج کے بیٹوں نے یہ سن کر بہن کو پیچھے دھکیلا اور ادنیٰ آواز میں کہا کہ

”ہم ماجوج کے بیٹے فریم ماجوج ہیں اور اپنے پہاڑ سے پہچانے جاتے ہیں۔“
اور پھر آل ماجوج نے آل ماجوج پر اور آل ماجوج نے آل ماجوج پر طرہ بولا۔
ماجوج کی اولاد نے ماجوج کی اولاد کے خون میں اور ماجوج کی اولاد نے ماجوج
کی اولاد کے خون میں ہاتھ رنگے؟

صبح ہوئے پر ماجوج کی بیٹیوں نے جسموں پر شاٹ باندھے، بال پریشان کئے
اور برصہ پانا کہناں ماجوج کے پاس پہنچیں اور چلائیں کہ ”اے ہمارے باپ،
تو گریہ کر کہ تیرے بھائی کے بیٹوں کے ہاتھوں ہمارے گھر برباد ہوئے، ہمارے سہا
اُجڑے اور ہمارے ماں باپوں کے خون سے ہماری زمین لالہ زار ہو گئی۔“

ماجوج نے اپنی آل کا یہ حال دیکھا اور ماجوج کے پاس جا کر بولا کہ ”اے
ماجوج تیرے بیٹوں نے میرے بیٹوں کو تہ تیغ کیا اور میری بیٹوں کو دسوا کیا۔“

ماجوج یہ سن کر لال پلٹا ہوا اور بولا کہ ”اے ماجوج تیرے فرزند اب میں سے
ہیں جو شیریں چشموں سے سیراب ہونا چاہتے ہیں اور دوسروں کو پیسا رکھنے
کے در پے ہیں؟“

ماجوج ماجوج میں ٹکرا رہے تھے لگی اور بات بڑھتی ہی چلی گئی۔ ماجوج نے
طیش لکھایا اور کہا کہ جو زبان ستر سکندری کو چاٹ کر انڈے کے چھلکے کی مثال
بنادیتی ہے وہ ماجوج کو کبھی چاٹ سکتی ہے۔ ماجوج پھینپھنایا اور بولا کہ ماجوج کی
زبان چاٹنے میں ماجوج کی زبان سے زیادہ چیز ہے؟

بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ شام ہونے پر ماجوج ماجوج نے اپنی اپنی
زبانیں نکالیں اور ستر سکندری کو چاٹنے کی بجائے عالم غیظ میں ایک دوسرے کو

چاٹنے لگے۔ وہ رات بھر ایک دوسرے کو چاٹتے رہے حتیٰ کہ یا جوج یا جوج کے چاٹنے سے اور یا جوج یا جوج کے چاٹنے سے انڈے کے پھلکے کی مثال رہ گیا۔ یا جوج نے دل میں سوچا کہ اب یا جوج میں رہ ہی کیا گیا ہے۔ اب سوئے جاتا ہوں۔ صبح اُٹھ کر ایک زبان مادریں گا اور یا جوج کو چاٹ جاؤں گا۔ سو اس نے اپنا ایک کان بچھا یا اور دوسرا کان اڑھو سو گیا یا جوج نے بھی دل میں یہی کہا کہ یا جوج کے نام کا تو اب ایک پھلکارہ گیا ہے۔ تھوڑا آرام کر لوں۔ صبح اُٹھ کر ایک زبان بھیریوں گا اور اسے صفا چٹ کر جاؤں گا سو وہ بھی ایک کان نیچے بچھا دوسرا کان اوپر سے لے پڑ رہا۔

جب یا جوج یا جوج سو کر اُٹھے تو یا جوج نے یا جوج کو اور یا جوج نے یا جوج کو نازہ دم پایا اور حیران ہوئے۔ پھر یا جوج کے پاس آل یا جوج اور یا جوج کے پاس آل یا جوج نالہ و شیون کرتی پہنچی کہ رات بھر آل یا جوج نے آل یا جوج کا آل یا جوج نے آل یا جوج کا خون بہا یا تھا۔ تب پھر یا جوج نے یا جوج برداشت کچکپکپائے اور کہا کہ میں تجھے ادنیٰ آلی کو یوں چاٹوں گا جیسے ستہ سکندی کو چاٹا ہوں۔ اور یا جوج نے یا جوج پر زبان تیزی اور جھلکایا کہ میں ستہ سکندی کو بعد میں ادنیٰ آلی کو پہلے چاٹوں گا۔ اور شام پڑے سے وہ پھر ایک دوسرے کو چاٹنے لگے اور چاٹتے ہی چلے گئے حتیٰ کہ دونوں انڈے کے پھلکے کی مثال رہ گئے۔ مگر اب ان کی زبانیں دہشتہ چلی تھیں اور آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ یا جوج نے طے کیا کہ یا جوج بوند برابر تو باقی رہ گیا ہے۔ اتنا صبح کو چاٹ لوں گا۔ سو وہ اپنا ایک کان نیچے ڈال دوسرا کان اوپر تان سو گیا۔

ماہوج نے بھی یہی سوچا کہ باقی ماندہ یاہوج کو صبح چاٹ کر ختم کر دوں گا۔ وہ بھی ایک کان کو گتہا بنا کر اور دوسرے کان کو محاف کی طرح اوڑھ کر سو گیا۔

صبح جب یاہوج کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے کان کے اندر سے جھانک کر ماہوج کو دیکھا اور اسے تازہ دم دیکھ کر متحیر ہوا۔ پوچھا کہ اسے ماہوج کیا میں نے تجھے چاٹ نہیں لیا تھا؟ ماہوج خود اسے خندہ رست دیکھ کر متعجب تھا۔ پوچھنے لگا۔ ”گمراہ یاہوج میں نے تجھے کیا چاٹ نہیں لیا تھا؟“ اور پھر دونوں کی آل، خونم خون اپنے اپنے بزرگ کے پاس پہنچی اور فریادی ہوئی۔ یاہوج ماہوج اپنی اپنی اولاد کی فریاد سن کر پھر ایک دوسرے پر غراتے پھر ان کی لمبی لمبی زبانیں ان کے منہ سے یوں باہر نکلیں جیسے بانسی سے سانپ نکلتے ہیں۔

یاہوج ماہوج ایک دوسرے کی طرف زبان لہراتے تھے کہ بوڑھا دانشمند پھر اپنی کسوہ سے باہر نکل آیا۔ یاہوج ماہوج کو دیکھ کر اس نے افسوس کیا اور کہا کہ اے یاہوج ماہوج، تمہارا بڑا ہو کہ تم سیدہ سکندری کو تو نہ چاٹ سکے مگر ایک دوسرے کو پہنچ جائے لے رہے ہو۔

تب یاہوج نے اپنی آل کا مالٹا یا اور ماہوج نے اپنی آل کا تھم کیا۔ دونوں نے بوڑھے سے انصاف چاہا۔ بوڑھا دانشمند دونوں کی بات سن کر بولا کہ میں ہا جیل اور قہیل کے درمیان تو فیصلہ کر سکتا تھا کہ کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے کہ ان میں سے ایک قاتل تھا اور دوسرا مقتول تھا مگر یاہوج کے باب میں کیے فیصلہ کروں کہ میں یاہوج کی زبان کو ماہوج کے خون سے اور ماہوج کی زبان کو یاہوج کے خون سے لال دیکھتا ہوں ؟

وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے

یا جوج نے کہا کہ اے بزرگ، کیا تو چاہتا ہے کہ آلِ ماجوج طبرستان کے چشمے سے سیراب ہو، اور میری آلِ سوکھے چشمے کے کنکر پتھر چاٹے؟

ماجوج بولا کہ اے بزرگ، کیا تو یہ گوارا کرے گا کہ آلِ ماجوج طبرستان کا پورا چشمہ ڈکوس جائے اور میری آلِ تشنہ لب پھرے؟

بوڑھا بولا کہ طبرستان کا چشمہ کس نے دیکھا ہے۔ وہ تومہ سکندری کے اُس طرف ہے۔ اس چشمہ سے تو وہ سیراب ہو گا جو پہلے پتھر چاٹے گا کہ وہ بولہو چائے گا؟

تب ماجوج نے اعلان کیا کہ میں پہلے ماجوج کو چاٹ لوں، پھر سکندر کے کھڑے کئے ہوئے پتھر چاٹوں گا۔ ماجوج گر جا کہ میں ماجوج کو اس کے آخری بچے تک چاٹ لوں گا۔ پھر میں سہ سکندری کو چاٹوں گا اور اپنی آلِ کرے کرے طبرستان کے چشمے تک پہنچوں گا؟

بوڑھے نے انہیں افسوس کے ساتھ دیکھا اور کہا کہ چاٹنا ماجوج ماجوج کی زبانوں کا مقدر ہے۔ وہ سہ سکندری کو نہیں چاٹیں گے تو اپنا لہو چاٹیں گے؟

اور ماجوج ماجوج اپنی لال لہو زبانوں کے ساتھ پھر آپس میں گھٹم گھٹا ہو گئے۔

بوڑھے دانش مند نے انہیں گھٹم گھٹا دیکھ کر بعد افسوس کہا کہ یا نٹ کی اولاد دد منہا سانپ بن گئی کہ خود ہی کو ڈس رہی ہے؟ اور یہ کہہ کر وہ واپس اپنی کھوہ میں چلا گیا۔

یا جوج ماجوج اس اندھیاری رات میں ایک دوسرے کو بھنبھرتے
رہے، پچھتے رہے۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کو چاٹا، اتنا چاٹا کہ وہی میل
یا جوج ماجوج گھٹ کر انڈے کے چھلکے سے بھی کم رہ گئے۔

”قنوں“ تلامذہ

نیون سائنز

اور ہم نے سرا کی سرود اور اندھیری راتوں میں لارنس جانا چھوڑ دیا ہے۔ اور اس بات کا مجھے یقین بھی بہت ہے۔

پوچھو! وہ کیوں؟

یوں کہ لارنس کی ٹھمٹھری ہوئی کالی راتوں میں رات کی رانی کی آواز ہلک اور لانجے لانجے گھنٹے اور عمر رسیدہ درختوں کے مہیب سائے بہت یاد آتے ہیں۔ گھمب اندھیرے میں اُونچے درختوں اور بے چراغ لمبے پوسٹوں سے گہری پنختہ سیاہ روش اور دور درختوں کے کینج میں سے ٹیم ٹم نظر آتی نرت مرادشاہ کے مزار کے دیوؤں کی روشنی بہت مہبت زدہ کر دیا کرتی تھی۔ نامعلوم سس دہشت کی ایک خشک اور جہا دینے والی لہر سارے وجود میں دوڑ جایا کرتی تھی۔

اور خوف دوم ہشت انسان کے لئے کنٹین ایہم اور ضروری شے ہے۔

کہ انسان خوف زدہ نہ ہو تو بہت پھیلتا ہے اور آدمی سے آدمی ڈوب جاتا ہے

اور جب وہ ہمیشہ زندہ ہوتا ہے تو وہ سکڑتا — اور ایک دوسرے کے بہت قریب ہونا چاہتا ہے۔

ہاں تو ہم اپنی سانسوں اور آہٹوں سے ڈرتے ڈرتے جم خانے والی سڑک پر چلتے چلتے بنجباب کلب کی جانب آ نکلتے۔

کلب ہال کے شیشوں سے چھین چھین کر آتی روشنی اور سایوں کے سوا ایک آواز بھی نہ سنائی دیتی اور ہمیں خوب معلوم ہوتا تھا کہ اندر تاشوں کی بازی اور دھکی کے پیگ پر بزنس پیکٹ طے ہو رہے ہونگے، لیکن دین کے معاملے اور غصیدہ بادل سے زور شور سے کہتے جا رہے ہوں گے۔

دھکی کے ایک پیگ کے گردش میں آنے اور کسی عورت کے ادھر سے اُٹھ کر اُدھر بیٹھ جانے پر لاکھوں اور ہزاروں کے دارے نیارے ہو رہے ہوں گے۔ اور ہمیں بھی خوب معلوم ہوتا تھا کہ اب لوگ شراب پی کر بدست نہیں ہوتے، بے خود ہونے کے بجائے اپنی بزنس کے سارے معاملے اسی عالم میں کرتے ہیں ناؤ اگر لوگ شراب پی کر بدست ہو جایا کرتے تو انھیں ایلن ایس ڈی ایجاؤڈ کرنا پڑتی۔ پھر میں اس سڑک پر آ کر خون مجھے لگتا اور ہر مغلطیوں معلوم دیتا جیسے کوئی ابھی جھوٹا جانتا آپٹے گا۔ قدم تیز اُٹھتے، سانس تیز چلتی اور ہم سروی میں تنہا ہوتی گاڑیوں میں بے آرامی سے سوئے ہوئے ڈرائیوروں کو دیکھتے، اور ان سے بھی ڈرتے جلد جلد قدم اُٹھاتے اس گیٹ پر آ نکلتے جس کے عین مقابل آرٹ کو فصل کی عمارت ہے۔ اور جس کے ساتھ برگد کا گھنا اور تازہ زبردست درخت ہے کہ اس کی جڑوں نے بختہ اور شفاف سڑک کے ساتھ ساتھ فٹ پائتھ کو جا بجا سے شق کر دیا ہے اور

میں ہمیشہ اور ہر کام کے لئے فلاں اور باسکٹ مایس استعمال کرتی ہوں کہ اس کی تیلی لکڑی سے نہیں، مومیا کے ہوئے کاغذ سے تباہی جاتی ہے۔ اور میرے نزدیک لکڑی کو انگو دکھا ناگنا دہہ۔

لکڑی جو خود درخت ہوتی ہے ابو برگ و بار لاتی ہے اور درخت جتنا پرانا ہوتا ہے اتنا ہی خاموش پرمقدار اور صبران ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کبھی انسان بھی پرمقدار اور صبران ہوا کرتا تھا۔

ہاں تو پھر کیا ہوا۔ ایک دم ہی داستانی انداز پھر لے پر غالب آ گیا تھا۔ ایک رات یوں ہوا۔

ایک سرے پر برگ کا درخت تھا اور دوسری طرف وکٹوریہ گیٹ اور اس کے آگے وچھڑوں سے گھرا ہوا راستہ یعنی چڑیا گھر کی سڑک۔

نویس کیا ہوا کہ اس شب برگ تلے وقت کی چھا لگیں خاموش رہیں اس کی ایک بھی پائل نہ تھی۔

اگلے اور پچھلے زمانوں کے سارے قافلے گم تھے۔ جیسے کسی نے بھولے سے رات کے بجائے دن کو کوئی کہانی سنادی ہو۔ اور سارے زمانے رستہ بھول گئے ہو۔ اور ہم نے چونک کر دیکھا تو وکٹوریہ گیٹ کے کٹر پر کو کا کو لا کا ایک بہت بڑا سائین سائن نصب تھا۔ ایک بڑا سا گول دائرہ ۱۰ اور اس کے اندر کئی دائرے۔ ہر دائرے کا رنگ دوسرے سے مختلف تھا۔

ہر دائرے کا اپنا الگ رنگ تھا۔

اور سارے دائروں پر جمادی۔

کو کا کو کا کا نام تھا۔

یہ سارے دائرے۔

گاہ جل اُٹھنے اور گاہ بچھ جاتے۔

آنکھوں میں چکا چوند سی ہوئی نظر تھلائی۔

اس طرف برگد کا پرانا درخت تھا۔ اور اس طرف فری میسن ہال کی تاریکی

کی متلاشی ہمارا صارت۔

ہمارے اس اندھ کو وا پڑا بلڈنگس کا پیارنا سبز روشنی سے لہریز رقبہ تھا اور اس

سے کچھ آگے۔ افلاح کی روشن جبین۔ اور اس کی نیون سائز سے دیکھتی پیشانی پر

سروس خنودالوں کا بار بار پکٹتا ہوا جوتا۔

حد ہو گئی تھی.....

ہمارے حمد کی راتیں سو گوارا اور ماتم کناں تھیں۔ تم نے راتوں کی غنوتوں

پر چھاپے مارے ہیں۔ پہلے تم نے ہماری اذانوں کے اسرار گم کئے سائی گھون کی

لہروں پر کرخ آوازوں میں دی جانے والی اذانوں میں کوئی بھیدا کوئی راز

باقی نہ رہا۔

اور اب تم نے ہماری راتوں کے سماگ بھی لوٹ لئے۔

اور شبوں کا تقدس تو ان کی افسروگی ان کی ظلمتوں اور کینوں سے عبارت ہے

اب نہ ہماری راتوں میں سکوت باقی ہے اور نہ ظلمتیں۔ انسان اب راتوں کو بھی

اتنا ہی نڈر ہے جتنا وہ دن کو تھا۔

نیون سائز نے رات کی چادر کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔

نیون سائز رات کے جسم پر چکتے ہوئے داغ بجے ان سے خوف آتا ہے۔ اور ان کے انتظار سے میری آنکھیں دودھ کرنے لگتی ہیں۔

پھر اس روشنی میں انسان کچھ بھی تو نہیں دیکھ سکتا۔ اور اس دنیا میں کتنی بہت سی چیزوں کو انتظار ہوتا ہے کہ ان کی طرف دیکھا جائے۔

مگر اسے نیون سائز۔

جیسے تاریکی اور غلغلہ کی ضرورت ہے۔

کہ بہت سی روشنی نظر کو خیرہ کر دیتی ہے۔

وہ پھر اندھیرے میں جنسی۔

اور عجیب بات ہے کہ اتنی بہت سی گلی اور بے سرو پا باتیں کرنے کے باوجود اس کی جنسی میں ذرا بھی پگھلا پن نہ تھا۔

اور پتہ ہے کیا ہوتا ہے۔ جب ہم بہت دیر تک چند حیا دینے والی روشنی کی طرف دیکھتے ہیں تو وہ ہماری آنکھوں میں بس جاتی ہے۔

ہم آنکھیں بھی بند کر لیں تو بھی ان بند آنکھوں میں وہ روشنی در آتی ہے۔ اور پتہ ہے کیا ہوا۔

شاید یہ نیون سائز میری آنکھوں میں ساگئی ہیں۔ یہ ہر گھڑی رنگت بدلتی اور اندھیرے اُجالے سے آنکھ پھولی کھیلتی ہوئی میری آنکھوں میں بس گئی ہیں۔

جب ہی تو میں نے یہ نیون سائز انسانی چہروں پر جلتی جھکتی دیکھی ہیں۔

اب اس کی آواز ہر وحشت تھی۔

دیکھو مجھے لگتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نہیں نہیں لگنا کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے۔

میں کریک ہو گئی ہوں، مجھے لگتا ہے کہ جیسے میرے دماغ کا ایک حصہ ختم ہو گیا ہے۔

خواب ہے۔

تمیں روشنی کروں اس کے سامنے نے گھبرا کر پوچھا۔

تم روشنی کر کے کیا پاؤ گے، جسکا اندھیرے اور اُجالے میں فرق ہی نہیں رہ گیا۔

اُجالے اب اتنے عرصے تو نہیں۔ اب تو راتیں بھی اندھیری نہیں ہوتیں۔

سارے کی میں سگریٹ کا روشن سرا بجھ جانے والی ضلع کے گلی کی طرح مکسدا مکتا۔

پھر بھی روشنی کر لینے میں کیا حرج ہے۔ تم یوں سدا اندھیرے میں تو نہیں جھوکتیں۔

تم روشنی کر لو۔

تب اس نے ہنسی جلائی۔ اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ نہایت مطمئن اور

باہوش نظر آ رہی تھی۔

اس کو اطمینان سا ہوا۔ اور حیرت بھی۔

ارے!

ارے کا کیا مطلب، تمہیں کس بات پر حیرت ہوئی!

کچھ نہیں، اس نے بات بنائی، تمہارے گرد قلم ہیں، کاغذ میں برش ہے۔

رنگ اور روغن ہیں۔ تم کیا ایک وقت میں دو دو کام کرتی ہو۔

دو اصل میں کچھ بھی نہیں کرتی ہوں جب ہم سب کچھ کر دینا چھوڑ دیتے ہیں

نواپنے اور گرد براطریق اکٹھا کر لیتے ہیں اور لوازمات کا ایک جال بٹن لیتے ہیں

اور بہت بولتے ہیں۔

اچھا! اب تم نے اصل بات کہنے سے گریز کر کے دوسری بات کیوں کی تھی اس لئے کہ تم نے یہ نہیں کنا یا ہاتھ لگا کر اسے تم تو ذرا بھی پاگل نہیں نظر آ رہی ہو نہیں میں پاگل نہیں ہوں، لیکن میرے دماغ کا ایک حصہ ضرور خراب ہے جب ہی تو بے صبر ہو تاکہ میرے اندر گریز سے چھٹکارا کر دوں اور ان لوگوں کے چہروں پر جن سے میں خوب اور اچھی طرح واقف ہوں یہ بڑے بڑے سے بڑا ڈاؤن ہوا ہے جو گھڑی گھڑی رنگ بدلتے اور جلتے بکتے ہیں۔

اور اب یہ حال ہے کہ میں کسی کو بھی نہیں پہچان پاتی۔

اب ہر شخص اجنبی اور ہر گھڑی نیا نظر آئے گا، لوگوں کی محبتیں، وفائیں، محبتیں اور سارے اصول گھڑی گھڑی بدلتے ہیں۔

کون کیا تھا؟ اور اب کیا ہے؟

یہ فیصلہ مشکل ہو جائے گا۔

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے، 'میں یہاں اپنی ہوں اور اپنی بستی سے ناواقف۔

جیسے میری بستی کھوئی گئی ہو۔

میرے رشتے گم ہو گئے ہوں۔

چہرے بہت جلد بدلنا چنے رنگ بدل رہے ہیں، لگا لگت اور بیگانگی کے فاصلے

ختم ہو چکے ہیں۔ ایک ایک انسان کے بے شمار روپ مجھے اپنے محیط میں لے رہے ہیں۔

تب اس کی آنکھوں کی چمک سے گھبرا کر اس نے ایک بار اور التجا کی۔ میں روتی

گل کر دوں، بستی بھجا دوں۔

ہاں، ضرور اس نے فوراً جواب دیا۔ اندھیرے اور ظلمات میں بڑا تھکا اور بڑی

کیا نیت ہے۔ اندھیرے بڑے پردہ پوش ہوتے ہیں۔

بش بھٹی تو وہ اچانک چونک کر پوچھنے لگی۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی۔

کیا بہت ضروری ہے کہ انسان کچھ نہ کچھ کہتا ہی چلا جائے؟

ہاں کم سے کم اس کے لئے بہت ضروری ہے۔ جسے ہر ہرے پر چھوٹے بڑے

بے حساب دائرے نظر آتے ہوں۔ گھڑی گھڑی جھپٹے بجتے رنگ بدلتے اور تمام دائروں پر محیط کوئی نہ کوئی اشتہار نمایاں اور خوبصورت حروف میں لکھا ہو۔

اب انسان کس کس سے کہے اور کس کس کو جتنا پھرے کہ میں نے تمہارے کون

کون سے اور کتنے روپ دیکھے ہیں۔ اور یہ بتاؤ! کہ تمہارا کوئی سچا اور اپنا روپ بھی ہے۔

اب گئے دن کی بات ہے کہ میں نے وہ چہرہ دیکھا جس سے میں بہت واقف

تھی اور میں نے اسے بہت دیکھا تھا۔ اور اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کتنا بدلا

اور میں نے اس پر کتنے دائرے اور کتنے رنگ دیکھے۔ حد تو یہ ہے کہ اس پر کھلے ہوئے

اشتہار بھی گھڑی گھڑی بدلتے تھے اور اس چہرے کے منہ جیسے میں کو کا کولہ کا دو نمونہ

سائن کتنا بہتر لگا تھا کہ جس کے دائرے گھڑی گھڑی رنگ بدلتے اور جھپٹے بجتے تھے۔

لیکن کم سے کم ایک چیز تو مستقل اور برقرار تھی کہ اس پر مستقل کو کا کولہ کا اشتہار اور میں غلام

اور اب کیا تمہارا خیال ہے کہ مجھ پر یہ فرض تھا کہ میں اپنی اس واقف اور درست

کو بہ بتاتی کہ مجھے تمہارے چہرے پر مختلف دائرے نظر آتے ہیں اور ستم بالا کے ستم یہ کہ اس

پر کوئی مستقل قسم کا اشتہار بھی تحریر نظر نہیں آیا ہے۔

نہیں یہ بات درست نہیں کسی کو اس کے بارے میں بتانا اور جانا بڑا خطرناک

اور غیر منصف بخش سودا ہے۔ دوسروں کے پردے فاش کرنا ہم پر لازم نہیں۔

کہ خداوند ستار العیوب ہے۔ وہ خود پردہ پوش ہے۔ اور اس نے انسان کو نیون سائز عطا کئے ہیں۔ کہ وہ اپنے چہروں کو نقاب اندر نقاب رکھیں۔

لیکن یہ بات بھی ہے کہ دیکھنے والی نظر کا خیال نہ کیا۔ کہ یہ گھڑی گھڑی جتنی بھی روشنیاں نظر پر ظلم کرتی اور جڑا دکھ دیتی ہیں۔ اور با اوقات نظروں میں سا کر رہ جاتی ہیں، کہ میں اس رات کو بہت کو سستی اور نہیں چاتی ہوں کہ جس رات میں نے برگد تلے سے کھڑے ہو کر وکٹوریہ گیٹ کے ننگے پرجھل کرنے کو کا کو لاکے اس نیون سائز کو دیکھا تھا۔ اور پھر اس شب کے بعد مجھے اور اندھیرے نے اپنے آپ کو ان کے محیط میں محصور پایا۔

لاؤس کی راتیں اب بھی ویسی ہی سوکھا موش اور اندھیری ہیں۔ اور روشنی رات کی رانی کی آوارہ دھمک بھٹکتی ہے۔ اب بھی جم خانے اور پنجاب کلب کے بار شینوں سے چھین چھین کر آنے والی روشنیوں کی کریمیں تلیکی کے پردے چاک کرنے کی ناکام کوششوں میں مصروف نظر آتی ہیں۔ اب بھی وہاں تاش کی بازیوں اور عورتوں کے الٹ پھیرے معاطے اور سودے ملے ہوتے ہیں۔ لوگ بڑھیا سوٹوں میں لمبیں، بڑھیا شرابوں کے جام ہاتھوں میں اٹھائے اپنے چہرے پر نیون سائز کے بورڈ آؤٹز کئے ہنس بول رہے ہیں۔ اور رات گئے با صبح کا ذب کے دھنگ ہیں کوئی بیران کو نیم بے ہوشی کے عالم میں گھسیٹ کر لن کی گاڑیوں میں ڈال دیتا ہو گا اور ڈرائیور کا نشانہ ہلا کر اس کو بیدار کرتا ہو گا۔ انہیں لے جاؤ کہ ان کے معاطے اور سودے مکمل ہو چکے ہیں۔

وقت دے قدموں یوں ہی اپنے کاموں میں مصروف رہے گا۔ اور میں شاید

اندھیرے اور ظلمتوں کی عافیتوں کی تلاش میں یوں ہی بے کن رہوں گی۔ میرے ارد گرد غریب سائز کے بورڈ کسی بدخت کی ڈالوں پر تیزی سے بڑھتے ہوئے چتوں کے اضافی اور ضربی عمل کی سورت میں بڑھتے جائیں گے۔ اور کہتے ہیں جب بدخت ناقص باتوں اور ڈالوں کا بوجھ اٹھائے اٹھائے اٹھتا جاتا ہے تب خزاں کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ اور خزاں کے دامن میں بہاروں سے کتنی گنا زیادہ رنگ ہوتے ہیں۔ پتے پتے گاروپا بدلتے ہیں۔ پتے پتے کارنگ جھانپتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کبھی فصل خزاں کا وہ دور جب پتہ پتہ رنگ بدلتا ہے اور پھر حیرت انگیز تمام رنگ آپس میں گڈمڈ ہوتے ہیں تو مکمل اور بھرپور خزاں آتی ہے۔ اور یہ کہیں فصل خزاں تو نہیں۔

کہیں ہم نے خزاں کے پاؤں کی چاپ تو نہیں سنی!
 نہیں ٹھہرو۔ پہلے میں اپنی کسر کیاں اور دوازے مضبوطی سے بند کروں۔
 تب کوئی جواب دینا۔

اچھا چھوڑو! مجھے نیند آرہی ہے۔
 میں نے تکبیر پر سر رکھ لیا ہے۔
 اور اب تم بھی سو جاؤ!

اس کے ساتھ ہی نے اس کی نیند میں ڈوبی آواز کیا آخری بار سنا۔
 اور بہت دیر بعد مکمل سکوت کو محسوس کیا۔ بجز دھیرے دھیرے آتی ہوئی،
 نرم نرم سانسوں کے۔

کھڑکی کے شیشوں میں سے چہن چہن کر آتی ہوئی روشنی میں اس کے ہمارے

طرف بکھرے ہوئے کاغذ تھے اور بلا کیپ کا ایک قلم تھا۔ جس کی روشنائی شاخیم
 ہو چکی تھی۔ اور سگریٹوں کی راکھ سے لبریز راکھ دانی۔ برش رنگ و روغن کھڑکی کے
 شیشوں میں سے آتی ہوئی مدھم روشنی اپنے ساتھ درختوں کی ڈالوں کے جو سائے
 لائی تھی وہ دیا پر مدھم اور پراسرار نقش اُبھار رہے تھے۔

پھر اس نے اُن کو کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا اور کھڑکی کے دروازے کھول کر
 دیکھا، سامنے کوہ کا کولہ لاکانیوں سا، گھڑی گھڑی جل بجھ رہا تھا۔

”سیپ“ کراچی

آنکھوں پر دونوں ہاتھ

تمیسا سترن ہوا تھا؟ یہ سب لوگ باہر کیوں نکل آئے؟ اس نے اپنے برابر ریٹنگ پر جھکی اس لڑکی سے پوچھا جس سے بات کرنے کے لئے وہ صبح سے کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ لیکن اس وقت تو وہ کسی سے بھی یہ سوال کر سکتا تھا یہ تو بعض اتفاق تھا کہ اس کے قریب وہی لڑکی کھڑی تھی۔ اسے یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس آواز پر باکس کے کھنکھے بڑبڑا کر اپنے کہیں سے باہر نکل آیا تھا۔

وہ لڑکی ریٹنگ پر اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اس کا سینہ اس کے دونوں ہاتھوں میں چھپ گیا تھا اور اس کی کمرے چمک کر اس کے ہرے بھرے کوہوں کا اندھ بھی نمایاں کر دیا تھا۔

”تم تو اس کے گول گول کوہوں پر ہاتھ پھیرنے کے لئے سرے جا رہے ہو اور

بس — — —“

اور بس — — —؟! — — — ارے یہ کیسے کر رہا گیا؟ اس نے گھوم کر کیسے کہیں کی

طرف دیکھا۔ سب لوگ اپنے کمبندوں سے باہر نکل آئے تھے۔ ہر شخص ریٹنگ پر جھک کر اندھیری ندی کے پانی میں کچھ دیکھنے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کیوں کی کھڑکیوں سے چپن چھن کر آنے والی روشنی سے اسٹیر کے آس پاس ندی کاغور ٹرا سا حد نظر آ رہا تھا۔ مگر روشنی میں پانی اور بھی ٹیلا ہو گیا تھا اور اسٹیر کے چھنے سے جو لہریں پیدا ہو رہی تھیں اس سے وہ گدلا پانی بار بار رنگ بدل رہا تھا، کبھی اس کا رنگ کالا ہو جاتا، انگریز کا لاکھیری نیلا اور کبھی سرخ۔ ندی سے اُٹھنے والے بھاپ کے مجھوڑے اور کالے بادل سرخ لائٹ کی تیز روشنی کا رستہ روک رہے تھے۔ سامنے بھاپ کی مجھوڑی دیوار کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ شاید اسٹیر منہر گیا ہے۔ مگر جب اس نے غور سے سنا تو انجن اور پانی کی ملی جلی آوازیں براہ راست تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اسٹیر چل رہا ہے۔ اور اس نے اپنی رفتار بھی ابھی تک کم نہیں کی۔ اس نے ٹوکی کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل مطمئن کھڑی تھی، جیسے اس کے لئے طوفان اگر گزر بھی چکا ہو، جیسے وہ صدیوں سے اسی طرح پرسکون کھڑی ہو مگر دیکھ کا عجیب عالم تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہاں جو آرام کرسیاں ترتیب سے رکھی تھیں وہ منتشر ہو گئی تھیں۔ کچھ کرسیاں چھوٹی میزوں پر کھدی گئی تھیں اور کچھ اٹنی پری تھیں۔ ریٹنگ کے ساتھ ٹھکنے والی لائف بیلٹ کھول دی گئی تھی۔ ڈائینگ ہال کے بیرے اور مشین روم کے لوگ اب دھڑا دھڑا کھڑے ہوئے تھے۔ ڈائینگ ہال کے اندر سے بھی کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں جیسے برتن چٹنے جا رہے ہوں اور الماریوں کے دروازے کھول کھول کر بند کئے جا رہے ہوں۔

پھر اس نے کچھ اجنبی پھرے دیکھے جو ڈائینگ ہال کے دروازے نکل کر تیزی

سے نو ریکلاس کی طرف جانے اور اسی تیزی سے واپس آجائے۔ وہ حیران ہوا کہ یہ کون لوگ ہیں اور اچانک کہاں سے آ گئے؟ پہلے تو اس نے انہیں نہیں دیکھا۔ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟

مگروہ نہیں غیر ملکی کہاں گئے؟ اس نے آنکھیں میچا ڈیڑھ چاروں طرف دیکھ کر ایک سفید فام لڑکا، ایک بوڑھی عورت اور ایک بوڑھا مرد مرد نے پادریوں والا سفید فراک پہن رکھا تھا۔ بوڑھی عورت سر پر سفید بھال باندھے تھی اور لڑکے نے سفید قمیض اور خاکی بیلون پہن رکھی تھی۔ وہ لڑکا بھی دن بھر خاموشی سے اُس لڑکی کو دیکھتا رہا تھا جو اس وقت اُس کے ساتھ ریڈنگ پر جھکی ہوئی تھی۔ بوڑھی عورت آرام کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھتی رہی تھی اور بوڑھا مرد وضو کرتا رہا تھا۔ وہ بیٹھوں جب تک اس کے سامنے رہے، بالکل خاموش رہے۔ اسے تو ایسا لگا کہ انہوں نے اپنے کہیں میں جکر بھی کوئی بات نہیں کی ہوگی وہ حیران تھا کہ اگر یہ بولے تو ان کی آواز کیسی ہوگی؟ وہ ڈیک پر خاموش بیٹھ رہے یا غلطی سے رہے۔ پھر فائینگ ہال میں اسی کلیسا والی متبرک خاموشی کے ساتھ کھانا کھاتے رہے۔ زیادہ رات ہوئی تو اپنے کہیں پکڑوں میں چلے گئے۔ پھر۔۔۔ وہ بھی کتنا پاگل ہے۔ وہ خورائے ہی میں کسی گھاٹ پر اتر گئے تھے۔ آدھی رات کے وقت۔! مگر کس گھاٹ پر اتر گئے تھے؟!

تو کیا آدھی رات ہو چکی ہے؟ اس نے ریڈنگ برائڈنگ کر سہاں کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں ایک بھی ستارہ نہیں تھا، اور بادل اتنے گائے اور اتنے گھنے تھے کہ اس کی آنکھوں کی روشنی انہیں پا نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اس نے اپنے سامنے ندی کے کنارے پر نظر جمانے کی کوشش کی کہ شاید ادھر کوئی ایسی چیز نظر

آجائے جس سے وقت کا اندازہ ہو سکے ٹھہراتے ہیں لڑکی کھڑی تھی اور ندی کا کوئی کنارہ نہیں تھا۔

”میں اپنے کہیں میں تنہا ہوں اور اس میں دو بستر ہیں۔“

لڑکی نے گنگا گھوڑا ٹھکڑوں پر سے لائیں اور گھسیٹیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا جیسے اس کی بات سن لی ہو اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر بڑے آگے کو ٹھک کر اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور کھیل بھلا کر ہنس پڑی۔

”خوب صورت ہیں آپ بہت خوب صورت! مگر اس لینڈ اسکیپ میں آپ کا یہ تنگ لباس کچھ اچھا نہیں لگا۔“ یا۔ اچھا لگتا ہے! ایس۔؟“

”تمہارا کیا خیال ہے۔؟“ یہ بات اس نے کبیرے کسی اور زور سے کہی۔

”کس پاسے ہیں۔؟“

”لابیٹر بہت مزے کی چیز ہے۔“

”اور لابیٹر بھی اس اسٹیئر کے۔“

ساری حرکت کبیر کی تھی۔ اس نے کہیں الگ الگ لئے اور ٹائینگ ہال کی چاروں میزوں میں سے چھانٹ کر اس بیئر پر بیٹھا تھا جو بالکل اس لڑکی کے سامنے تھی۔ پھر وہ پلکیں نہیں اٹھائیں۔ یا خود اس نے ہی ڈر کے مارے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

”اب ہم کل دو بیئرنگ کھانا پہنچ سکیں گے۔“

”کہیں۔؟“

”اسٹیئر نے راستہ بدل دیا ہے۔“

”راستہ کیوں بدلا؟“

”دیوانہ مارا ضبوت گئے ہیں ہم خلیج بنگال کے قریب ہیں اور سارے طوفان ہمیں

جنم لیتے ہیں۔“

”سارے طوفان ہمیں جنم لیتے ہیں؟ اس نے دریا میں نہرتے ہوئے جل کر مری

کے پودے پر بیٹھی تھی کو دیکھا۔ یہ تھی جو ایک کنارے سے چلی ہے اور جل کر مری کے پودے

پر بیٹھ بیٹھ کر دریا پار کر جائے گی۔ مگر اس تھی کو دریا پار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ

ایک ہی کنارے پر زندہ گی کیوں نہیں گزار دیتی۔ اُس نے اُس لوکی کو دیکھا۔ وہ بھی

مشابہا سی تھی کو دیکھ رہی تھی اور اس کا ساتھی گھوم پھر کر تصویریں آٹار رہا تھا۔ اُسے

ہنسی آگئی۔

وہ دوزخ بیک وقت ایک تیسری چیز کو دیکھ رہے ہیں۔ کتنا شاعرانہ خیال ہے!

وہ اور ایک خوب صورت ترکیب۔ اور تیسری شے! دوزخ میں مشترک! — اور پھر

مشترک حقیقت۔ یہ سفر۔!

پھر اسے شبہ ہوا کہ اس نے اس لوکی سے کچھ پوچھا بھی تھا یا محض اس کا خیال

تھا کہ اس نے پوچھا ہے؟

”کیا سائرن ہوا تھا؟ سب لوگ باہر کیوں نکل آئے؟“

اس نے زور سے کھٹک رک رکھا صاف کیا اور چاہا کہ پھر اس سے وہی سوال کرے۔

لیکن پھر سوچا کہ سوال کرنے سے کیا حاصل؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ لوگ اپنے کینڑوں

سے باہر نکل آئے ہیں اور ریلنگ پر رک گئے ہیں؟ جو ریلنگ پر نہیں شک کے وہ

ایک دوسرے کا منہ کئے پھر رہے ہیں۔ جیسے دوسروں کی آنکھوں میں نہیں اپنی خط

کا سامان نظر آئے گا۔ وہ خود ریگ ریل کے والوں میں سے تھا کیونکہ جن آنکھوں میں وہ اپنے بچاؤ کی تدبیریں بڑھا چاہتا تھا وہ بھی ندی کے تھیلے اور تار یک پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

”ارے یہ کیسے کر رہا ہے؟“ اس نے گھوم کر اس زمین کی طرف دیکھا جو لوئر کلاس کے تنگ و تاریک غار کی طرف اترتا تھا اور جس کی طرف جانے کے لئے وہ صبح سے کئی مرتبہ ارادہ کر چکا تھا۔ مگر جب بھی قدم بڑھانا وہ آنکھیں اس کا راستہ روک لیتی تھیں۔ کتبہ یقیناً نیچے ہو گا بلکہ ہو سکتا ہے وہ مسافروں کا سامان اکٹھا کر کے انہیں گھاٹ پر اتارنے کے لئے تیار کر رہا ہو۔ مگر کونسا گھاٹ؟ ایک گھاٹ تو گزر گیا۔ اب کونسا گھاٹ آئے گا؟ اور وہ تینوں غیر ملکی جس گھاٹ پر اترے وہ کونسا گھاٹ تھا؟ وہ رات کا کونسا پہر تھا؟ اسے پتہ کیوں نہیں چلا!! ہو سکتا ہے وہ بھی یہی اتر جاتا۔ تو پھر وہ سندھ میں کیسے پہنچتا؟!

”اب اسٹیمر سندھ میں کے راستے جائے گا۔ اسے یہ اطلاع دوپہر کے کھانے پر ملے گی۔“ اچھا۔!!۔۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ خوش تھا کہ مقررہ وقت سے پہلے ہی وہ سندھ میں دیکھ سکے گا۔

”مگر وہ تو آدھی رات کے بعد کہیں آئے گا۔ آپ کیا دیکھ سکیں گے؟“
 ”کچھ بھی نہ دیکھ سکیں! اس کی خوشبو تو سونگھ سکیں گے۔“

پھر اس نے پہلی بار گستاو پ آنکھوں اور بجاپ دیتے سانولے جسم کی گردن کا خوشبو اپنی ناک آنکھوں اور ہونٹوں کے قریب محسوس کی۔ وہ بیماری بیماری کی بری تکلیف سے اٹھیں، پھر سادے دریاؤں کی گہرائی نے اس کا جائزہ لیا اور ٹھکانے

حکیم گولوں پر جھک گئیں۔ اس نے جلدی سے لائبریری نرم نرم میگ سے دبا منہ بھر لیا اور محسوس کیا کہ چشمدہنی چیز کھاتے ہوئے بھی منہ میں پانی بھر سکتا ہے۔ اب سفر اچھا کٹ جائے گا۔ اس نے سوچا۔ !

پھر دائیں ہاتھ والی میز سے تینوں غیر ملکی اٹھے اور اپنے کمپنوں کی طرف چلے گئے۔ ان کے بائیں جانب مینز رتھنا بیٹھ گئے پولیس افسر نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا وہ بھی خاموش تھا۔ تینوں غیر ملکی بھی خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ وہ لوگ بھی چنے ساختی سے کوئی بات نہیں کر رہی تھی، سفید وردی میں ملبوس دیشر میں ایک کونے میں بت بنا کھڑا تھا حتیٰ کہ کبیر بھی خاموشی سے لائبریری میں گھس گیا تھا۔

اس مکمل سکوت سے اسے ڈر لگا۔ اتنی گہری اور گہیر خاموشی! بنگال کے تمام

دریادوں کی گہرائی اور سارے جنگلوں کا سناٹا اس وقت اس دامننگ ہال میں گھس آیا تھا۔ اس نے گہرے سکوت کے بعد کچھ نہ کچھ مزور ہو جاتا ہے، مگر کیا ہو جاتا ہے؟ پھر اس نے خاموشی توڑنے کے لئے بھاری رستے والی شیفلڈ کی چھری اٹھائی اور اپنے سر کے پاس لے جا کر زور سے کلتری کے فرش پر جھوڑ دی اور سامنے کھڑکی کے شیشوں میں سے کھلے آسمان کو دیکھنے لگا۔ آٹھ آنکھوں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور وٹیر چوہا کھڑکی کی چھری اٹھانے کے لئے لپکا۔ کبیر نے پہلے تو آنکھیں پھاڑ کر اس کو دیکھا پھر مسکرا کر کڑم کڑم جھینگے چالے لگا، خاموشی پھر چھا گئی۔

لوئر کلاس کی طرف جانے والی سبز جیولڈر سافروں کی بھیڑ غنی، پتہ نہیں اتنے بہت سے لوگ کہاں سے آ گئے تھے۔ ہر شخص نیچے اترنے کے لئے بے قرار تھا اور چلتا تھا کہ سب سے پہلے وہی نیچے پہنچ جائے مگر ایسا لگتا تھا کہ آگے کسی چیز نے راستہ

روک رکھا ہے۔ آگے والے سرک ہیں نہیں رہے تھے۔ ہر آدمی اپنی جگہ جا کھڑا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اس کے آگے والا قدم بڑھائے تو وہ بھی اپنا پاؤں نیچے اتارے۔ اس نے لوگوں کے سروں پر سے نیچے جھانکنے کی کوشش کی مگر اندھیرا اتنا تھا کہ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اسے کبیر دکھائی دیا جو اجنبی لوگوں کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ کبیر حسب معمول گھبراہٹا ہوا اور پریشان تھا۔ وہ بار بار اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتا سر ہلاتا اور زور زور سے ہاتھ ہلاتا۔ اجنبی لوگ اس کے سامنے بالکل خاموش کھڑے تھے۔ جیسے کھنکی ساری باتیں کبیر کے پاس نہیں اور وہ سننے کے لئے مامور کئے گئے تھے۔ مگر۔۔۔۔۔ انہیں اس کام پر کس نے مامور کیا تھا۔ اس وقت جبکہ استیبر طوفان زور شہر بنا ہوا ہے یہ لوگ انہیں مطمئن اور اتنے بڑے سکون کیوں ہیں؟ کبیر پچھتاؤں لوگوں سے مدد طلب کر رہا ہو گا۔ تو گویا کبیر طوفان میں کسی کی مدد حاصل کر سکتا ہے۔

کبیر۔۔۔۔۔ بھائی۔۔۔۔۔ اس نے زور سے آواز لگائی اور نیچے سے آنے والے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اتنے بہت سے لوگوں کی موجودگی میں اس کی آواز کبیر تک کیسے پہنچ سکتی ہے مگر جیت اس بات پر ہوئی کہ اس کے قریب کھڑے لوگ بھی اس کی آواز پر نہیں چونکے تھے جیسے انہوں نے کوئی آواز سنی ہی نہیں۔ تو کیا وہ خواب میں سوچ رہا ہے؟ یا صرف سوچ رہا ہے کہ وہ سوچ رہا ہے؟! پھر اسے شک ہوا اپنے آپ پر اپنے خیال اور اپنی سوچ پر۔ وہ لوگ جو راستے میں کسی گھاٹ پر اتر گئے کیا واقعی غیر ملکی تھے؟ یا یہ بھی محض اس کا خیال ہی تھا؟ صرف اس پر ہذا سفید فرائ دیکھ کر ہی اس نے فرض کر لیا تھا کہ وہ غیر ملکی ہیں، ہو سکتا ہے وہ غیر ملکی نہ ہوں، صرف انہوں نے لباس ایسا پہن رکھا ہو مگر اس سے کیا

فرق پڑتا ہے کہ وہ ملکی تھے یا غیر ملکی۔ وہ سکرایا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ وہ رات میں کسی وقت چپکے سے کسی گھاٹ پر اتر گئے۔ تو وہ کونسا گھاٹ تھا!! اس کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ اس لڑکی کو مزہ معلوم ہو گا۔ وہ بھی بڑی بیٹھی بیٹھی نظروں سے اس لڑکے کو دیکھ رہی تھی۔ مگر۔۔۔ اس کے دماغ میں اچانک ایک کونسا سا پکا۔ اس لڑکی کا ساختی نظر نہیں آیا۔ کہاں گیا وہ جیسی۔۔۔؟ جیسی۔۔۔؟

”عجیب بات ہے خوب صورت لوگوں کے ساتھ مرد ہمیشہ بد صورت ہوتے ہیں۔“
 ”ہوتے نہیں لگتے ہیں۔“

اس نے بے ساختہ قہقہہ لگا یا اب اس کے ارد گرد کھڑے بہت سے چہرے اس کی طرف مڑ گئے اور ساری آنکھیں اس کے چہرے پر گڑ گئیں۔ نیم تاریکی میں اس نے دیکھا کہ اُن کا لے بھجنگ چہروں سے تیل ٹپکا ہوا تھا اور رنگ و طرح جسم اس وقت آپس میں چٹے ہوئے تھے جیسے انھیں گوند سے چپکا دیا گیا ہو۔ پھر وہ چہرے ساکت ہو گئے اور سارے جسم پیسنے میں چپکے گوشت کی دیوار بن گئے۔ اب صرف آنکھوں کی سفیدی جگر جگر کر رہی تھی۔ وہ ڈرا لگئیں اس کا جسم بھی تاریکی کے اس وسیع جسم میں تحلیل نہ ہو جائے۔ اس نے خوف سے جھجھری لی اور زور سے آنکھیں بند کر لیں۔

نہ جانے رات کا وہ کونسا پہر تھا۔ جب وہ اپنے کہیں میں گیا تھا۔ اسی وقت اس نے بہت سے لوگوں کی آوازیں سنی تھیں، جو ایک ہی لے اوں ایک ہی آہنگ میں۔

”اٹھو۔ اٹھو۔ اٹھو۔ اٹھو۔“ جیسے بہت بھاری بوجھ یا جیوت کی بھاری بھاری گانٹھیں اسٹیر سے دھکیل کر گھاٹ پر لے جانی جا رہی ہو اور بوجھ اور ٹھکن کا احسا کم کرنے کے لئے ”اٹھو۔ اٹھو۔ اٹھو۔ اٹھو۔“ کی آواز لگاتی جا رہی ہو۔ تو گویا وہ کوئی گھاٹ تھا اور وہ

تینوں ضرور اسی گھاٹ پر اترے ہوں گے۔ مگر وہ کونسا گھاٹ تھا اور اسے اس وقت خیال کیوں نہیں آیا۔ اب کیوں آرہا ہے؟

لوئر کلاس کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر جو جگہ تھا اُس سے زیادہ مجمع اب اس کے پیچھے ہو گیا تھا اور سب مل کر اسے دوبارہ بتاتے تھے اس نے آہستہ آہستہ انگلیں کھینچیں اور اس طرف دیکھنے کی ہمت کی جب ضرورہ لڑکی ریٹنگ پر چمکی ہوئی تھی۔ چاہا کہ آگے بڑھے مگر راستے میں ایک لمبی سی دائری والا دیوار بنا کھڑا تھا۔ وہ ٹھٹھک گیا نیچے اترنے والا راستہ تنگ و مضرتنگ جھوم نے روک رکھا تھا اور اوپر جانے کا راستہ اس دائری والے نے۔ اس نے اپنے پیروں کو دیکھنے کی ناکام کوشش کی اور بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔ کبیرا چھا رہا جو پہلے ہی نیچے اتر گیا۔ اس نے دائری والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں جو سکت نہیں اور اسے تکیے جا رہی تھیں۔

”اس لڑکی کا سانسی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔ وہ کہی ہے بھے اوپر جانے وہ۔“

پھر اسے بکھت خیال آیا کہ کہیں وہ بھی نواں تینوں کے ساتھ اس نامعلوم گھاٹ پر نہیں اتر گیا! اتوار لڑکی کو اکیلا چھوڑ گیا۔ اب اس نے دائری والے کے کندھوں پر سے اچک کر اوپر دیکھا۔ ڈائینگ ہال کے دروازے تک آدمی ہی آدمی تھے۔ اب تو ریٹنگ کے پاس بھی انسانی جسموں کی دیوار بن گئی تھی۔ اب وہ اس مقام تک نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جہاں اس کا خیال تھا لڑکی کھڑی ہے۔ مگر یہ اتنے لوگ کہاں سے آگئے؟! وہ حیران ہوا۔ اوپر آتے دوس کینوں میں زیادہ سے زیادہ سوراخ ہوا کرتے تھے۔ ڈائینگ ہال کے اسٹاف کو بھی شامل کر لیا جائے تو پانچ چھ افراد اور بن گئے۔

تو پھر یہ سینکڑوں ننگے نیل ٹپکاتے جسم کہاں سے آگئے۔! اور خون سے کانپ گیا۔ کہیں اسٹیئر ہی نہ ڈوب جائے۔!

”کبیر بھیا..... فی.....“

پھر اسے سب اُپر بیٹھنے والوں کا خیال آیا۔ وہ کوشیٹے کے گھروندے میں بیٹھ کر اسٹیئر کو راستہ بتاتے ہیں طوفان آیا تو سب سے پہلے وہی مشاخر ہوں گے! مگر مس وقت ان کا کیا حال ہے۔۔۔!

جس کلاس میں وہ سفر کر رہا تھا۔ اس میں سے اُپر جانے کے لئے کوئی راستہ نہیں تھا۔ یا اگر راستہ تھا تو اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُپر پہنچنے کے لئے سب سے خپلی کلاس میں اُترنا پڑتا تھا۔۔۔ جب وہ اُپر چڑھنے کے لئے نیچے پہنچا تو اس نے درگاہ کے مسافروں کو بھی دیکھا جو کڑے کرکٹ کے ڈبیر کی طرح کڑی کے فرش پر باوجود سر بکھرے پڑے تھے۔ پیسے میں چھپانے کا لے بھگ مرد عورتیں اور بچے جو ہال میں کافی جگہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اس طرح چٹے ہونے لگے کہ اگر علیحدہ ہوتے تو ان کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔۔۔ ابھی وہ یہ سوچ رہی تھا کہ اسٹیئر کی اصل زندگی میں لوگ ہیں کہ کچھوں کے پیشاب پاخانے بوڑھوں کے بلغم اور جوان جسموں کی تیز بوٹے اسے اور کبیر کو فوراً اُپر پہنچا دیا۔

اُپر بیٹھنے کے گھر میں بیٹھے اس شخص نے جو جوفی گھسا رہا تھا اسے گور کر دیکھا اور اپنے سامنے سے کچھ کھد پھر وہ دوسرا آدمی کہیں سے باہر آیا اور کبیر کی ایک طرف نے جا کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا۔ کبیر نے بھی سب سے تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔۔۔ اس نے سوچا اور دُور درختوں کے درمیان تنگ ہوتی ندی کے ٹوٹنے

لگا۔ ندی چر سکون تھی۔ خاموش پانی میں بہتے جل کمڑی کے چودوں نے بھی جیسے زمین میں جڑ پکڑ لی تھی۔ کناروں پر کھڑے درخت بالکل خاموش تھے۔ صرف آسمان پر بادل تیر رہے تھے جو اتنے نیچے تھے جیسے ذرا سا اچک کر انھیں ہاتھ لگایا جاسکتا تھا۔ البتہ یہاں پہنچ کر دریا کا پانی دُور ہو گیا تھا اور کنارے بھی کہیں دُور بہتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں اسٹیمر کی بھٹ ہے!۔ اس نے اپنے آپ سے کہا اور ہم سب مسافروں کے سروں پر کھڑے ہیں!! پھر وہ دُور رسوں کے درمیان چلتا ہوا سب سے آگے دسٹر کے سرے پر پہنچ گیا اور نیچے جھانک کر دیکھا۔ نیچے ایک کشتی موٹے موٹے رسوں سے بندھی اسٹیمر کے ساتھ ٹک رہی تھی اور اس میں دو آدمی بیٹھے مٹیوں پر بٹیاں بھرنے لگے اور مچھلی کھا رہے تھے۔ وہ جھکا تو ان دونوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور منہ میں بھرے ہوئے مچھلی کے کاٹے زور سے ندی میں تنقوک دیئے۔ دو سچے ہٹ گئے۔ اچھے لگا جیسے ان دونوں آدمیوں نے اسے دیکھ کر تنقو کا ہے۔ مگر کیوں!!

اب وہ لڑکی اور اس کا ساتھی بھی اُپر آ گئے اور اس کا ساتھی کیبن کو بیک گراؤڈ بنا کر اس کی تصویر تار رہا تھا۔ کتیرا اس کے پاس آ گیا تھا اور بنگال کی جادو گریموں کا ذکر کر رہا تھا اور اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو اب کیبن کے قریب ریٹنگ کے ساتھ بیٹھ لگا ہے 'سینئر' بھائے 'مگرون' کے ذرا سے غم کے ساتھ ٹھوڑی اُتر بھی گئے سیاہ بال ہوا میں لہرا رہی تھی اور اس کا ساتھی تصویر کھینچنے کے لئے کیمرو ہی سیٹ نہیں کر پا رہا تھا۔

اچھے پھر رسوں سے بندھی ہوئی کشتی کا خیال آیا۔ طوفان اُجھائے تو یہی کشتی مسافروں کو کنارے تک پہنچاتی ہے۔ مگر ایک چھوٹی سی کشتی کتنے مسافروں کو کنارے

نمک پہنچا سکتی ہے! اور اگر وہ خود ہی اٹ جائے تو —
 ”تم تو ہمیشہ اُلتی ہی بات سوچتے ہو۔“

اس نے بچوں کے بل کمرے ہو کر کالے سا بندے گوشت کی دیوار پر سے نیچے
 جمنا کہا کہ شاید کیر کیس دکھائی دے جائے۔ مگر اب اتنی تاریکی ہو گئی تھی کہ کچھ بھی نظر
 نہیں آ رہا تھا۔ سوائے ایک جسم کے جو اسٹیمر کے انجن کے ساتھ سانس لے رہا تھا
 اور یہی سانس ندی کی لہروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی تھی۔ انسانوں، اسٹیل اور زک
 کی لہروں کے ایک ساتھ سانس لینے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسٹیمر بھی چل رہا ہے
 اور اس کی رفتار میں بھی فرق نہیں پڑا۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہی جیسے
 تاریک چروں کا جائزہ لیا اور حیران ہوا کہ اس عرصہ میں کوئی بھی گھاٹ نہیں آیا کہ
 طوفان گزرنے تک اسٹیلروہاں ٹھہر جاتا۔!! پھر اس نے دقت کا اندازہ لگانے
 کی کوشش کی۔ کیا دقت ہو گا۔؟ اس نے اس سرے میں گزرنے والے تمام واقعات
 پر غور کیا۔ پھر سوچا کہ باہر بھی نمک کالی رات برس رہی ہے، اندر دیاہیں بھی نمک
 اندھیرا ہے جنگل کی خوشبو بھی ابھی تک نہیں آئی کہ سندھین آئے کی نوید ملتی ہو تو
 آتا تو رات کا پھپھلاہٹا ہو رہی آتا اور پھر صبح — مگر اس کی گھڑی کہاں گئی؟ اس
 نے گھبرا کر اپنی دونوں کلاٹیاں آنکھوں کے ساتھ لگا لیں۔ شاید وہ کہیں میں
 ہی سہول آ یا گھڑی ہوتی تو کم سے کم اسے دقت تو معلوم ہو جاتا۔ پتہ نہیں طوفان آیا تو اس
 کی گھڑی بھی مل سکے گی یا نہیں! — اور اس کا باقی سامان؟ کیا سب کچھ غائب ہو جائے
 گا۔!! — کبیر نے بہت دھوکا دیا۔ خدا جانے وہ اسے چھوڑ کر نیچے کیوں بھاگ گیا۔
 کبیر جتنا تو وہ اس سے باتیں ہی کرتا۔ آگے بڑھنے یا واپس جانے کی باتیں۔

جس جون وہ آگئے بڑھتی گئی۔ راستے میں دانے بکھیرتی گئی کہ واپسی میں راستہ نہ
بمحل جائے لیکن جب وہ طویل اودکشن راستوں پر ہنگام کر لیتی تو کوتا سارے دانے
چگ گیا تھا۔ مگر میں تو راستے میں دانے بھی نہیں بکھیر سکتا! اپنی بے بسی کا
احساس کر کے وہ خوفزدہ ہوا۔ میرے آس پاس پانی ہی پانی ہے جو سارے نشانِ شا
ڈالتا ہے۔!

اب اس کے کپڑے بھی پیسے میں بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئے تھے۔
اور اسے اپنے جسم سے بھی دوسرے جسموں کی بو آنے لگی تھی۔ وہ کمرے کھڑے تنگ
گیا تھا اور چاہتا تھا کہ کہیں ہنوز سی جگہ بھی مل جائے تو بیٹھ جائے۔ اب تو وہ
اندھیرے میں گھپلتے ہوئے جسموں کے قدموں میں بھی بیٹھنے کو تیار تھا۔ مگر ان جسموں
کے پاؤں کہاں ہیں؟! اور میرے پاؤں۔!! اس نے ہمت کر کے واپس پاؤں
اوپر اٹھانے کی کوشش کی مگر دوسری ٹانگوں کی طرح اس کا پاؤں بھی کٹھنی کے فرش
میں جم گیا تھا اور اس کی طاقت جواب دے گئی تھی۔

پھر وہ سرے پاؤں تنگ کانپ گیا۔ یہ طوفان کب آئے گا؟ کیوں نہیں
چمکتا۔!! یہ کیسا عذاب ہے۔!! اس نے جی کر ڈاکر کے ایک بار پھر کبیر کو آواز
دینے کے لئے منہ کھولا۔ لیکن ابھی وہ حلق سے آواز نکالنے ہی والا تھا کہ اوپر ایک
بلند رخ بلند ہوئی اور سارا سیٹھ لڑ گیا، پھر تمام سکت آنکھیں اپنے خوں سے ہنسی
پڑیں اور کان لہجے ہو کر کہیں کی قطار تک پہنچ گئے۔

”اس نے ندی میں چھلانگ لگا دی۔“

اس نے؟ کس نے؟! اس کون؟! تو کیا وہ میں تھا۔!!۔ مگر میں نے تو

ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

پھر اس نے زور سے دونوں آنکھیں میچ کر اور دونوں کان بند کر کے سینے کے
پیرے زور سے آواز لگائی۔

”کیئر — ہا.....ئی.....ای“

لیکن اس کے آس پاس کھڑے لوگوں میں سے کسی نے بھی اس کی آواز نہیں
سُنی تھی۔

”فنون“ لاہور

ریپ

پہلے تو ایک ہی گھر تھا مگر جب جھگڑا حد سے بڑھا تو بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی گئی اور پھر جوں جوں وقت گزرنے لگا۔ نئے نئے جھگڑے بڑھتے چلے گئے۔

پہلے برآمدے میں مٹی کے تیل والا چولہا لے آگئی سویر میں غرقِ مٹی تھی۔ سر کے بال اُلجھے اُلجھے اور بکھرے ہوئے تھے۔ سر کا دوپٹہ رستی کی صورت بن کر گرہوں کے گرد پڑا تھا اور بچے فرش پر انگشتِ شہادت سے وہ بار بار لکیریں سی کھینچنے لگتی اور ایسے میں نظریں تختیں کہ بار بار دیوار پر جا پڑتیں۔

ابھی ابھی ذہن تھا اس کے پاس سے اُٹھ کر باہر گئی تھیں۔

وہ خوب جانتی تھی جو کچھ مٹی آپا کے ہاں پک رہی تھی اس کا مطلب کیا تھا اور بے قرار میاں جس اُجھن سے نکلے کو ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اس کی نوعیت سے بھی آگاہ تھی۔ غضب یہ تھا کہ میاں اُنظم کے بعد اب جیسے ساروں کو اُنکر اس کو رہ گیا تھا اور فکر بھی ایسا کہ اس سے کچھ بچھٹا تو یا ایسا گناہ تھا جو سرد ہو جا

تو جاننا اسلام خطرے میں پڑ جاتا!

یہ جو سارے جہاد کو کھٹکھٹس میں لگے تھے اس کی ابتدا کہاں اور کیسے ہوئی
اب وہ کیا کیا سوچتی۔ پہلے پوچھو تو جب سے اس نے ہوش منبہ لایا یہی کانچہ دوس کی
جہل آرہی تھی 'بات کی گہرائی میں کچھ اور جاؤ تو یہ بھٹکارتی ہوئی سرگوشیاں اسی دن
سے وجود میں آئیں جس روز اس نے آنکھ کھولی۔

مودی آپا تو اسے ناجائز اولاد سمجھتے تھے جب انہوں نے ہی ایسا جانا تو پھر
دیوار پر سے والے کیوں نہ ہاں میں ہاں ملاتے۔ ساروں کا گنا ہے۔ کہ اعظم میاں دولت
کیا گئے کہ گوری چڑی والی میم سے آنکھیں چار کر بیٹھ۔ اسے وہ کیا جانے کھ کیا ہے
اور وہ بن اسلام کس چیز کا نام ہے۔ نماز نہ روزہ، زکوٰۃ نہ حج، کسی بات کی تو خبر
نہیں اور لے آئے گھوڑی کی نشانی اک لوٹنے سے ایسی بھی بیچ کی بات تو یہ ہے کہ بڑی
ساری جائداد ورثے میں پائی تھی۔ سو گھڑے اڑائے گئے جو من میں آیا کیا۔ روکنے
فونکے یا پوچھنے والا کون۔ کسی کو کیا چڑی تھی کہ خواہ مخواہ میں ٹانگ اڑاتا؟

سچی بات پوچھتے تو ساروں پر میاں اعظم کا بڑا رعب تھا، زندگی میں تو کہیں
کسی نے چوں نہ کی۔ مودی آپا کہیں کبھی رانگ جھوں چڑھا کر کوئی تیغ یا سڑا جلد کہہ
دیتے تو وہ یوں نظر انداز کر دیتے کہ وہ اپنا سامنہ لے کر وہ جاتیں اور پھر منہ کھڑا
بدلنے کو جگ کرنے کی نشان دہی نہیں مگر پر دین کی بیادیش کے سوا سال بعد ہی ستم یہ ہوا
کہ اعظم میاں نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں اور بن ماں کی بچی انگھوٹھا
چوستی رہ گئی!

ستمبر کا مہینہ واقعی ستم گر میں کرایا۔

ہوں بچی کو سنبھالنے والے بہترے تھے خیر سے لگی پھوپھی اماں بھی نہیں مگر اس
 نصفی سی جان کے ساتھ ڈھیر ساری بابتیلا کی چمک کچھ اتنی تیز تھی کہ ادھر ادھر
 سارے آن اکٹھے ہوئے۔ قریبی رشتے داری جتانے کو سبھی نے لیاقت بگھاری۔
 ہر ایک اپنی پوری قوت سے چیخا چلایا۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی گئیں۔ ایک
 پڑھے لکھے لائق میاں نے اپنی بیگم سمیت بچی کے سر پر ہاتھ بھی رکھ دیا۔
 مگر قسمت کو کچھ اور سی منظور تھا۔ ان کی بیوی کو بناؤ سنگھار کچھ زیادہ ہی محظوظ
 تھا اور غرارہ پسپے کی تو اتنی شوقین نقیب کہ نئے نئے فیشن کے غرارے دیکھ کر ہادی
 آپا کا منہ کڑوا ہونے لگا۔

جانے ان کے غرارے کو کس کی نظر کھا گئی کہ کچھ عرصے بعد وہ شوہر بنا دیا جس
 کی بند سٹھیاں دیکھ کر دیوار پر سے والے مسم مسم جاتے ایسوں ہی کی سازش کا شکار
 ہو گئے اور ایک بار پھر ساروں کو پردہ میں کے سر پر ہاتھ دھرنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔
 فاطمہ آپا تک گود بچیلانے پھپس پھپس کرتی دھڑی آئی اور ایک وہ لاغری سا
 بوڑھا جو خود کو سب کا غلام کہتے نہ ٹھکتا۔ ساتھیوں سمیت پہنچا، بڑی بوا کا ہے کہ
 نیچے نہیں وہ بھی اس دوڑ میں شریک ہوئیں اور عالیہ بوا ساری جائیداد کا حساب کتاب
 انگلیوں پر گنتی اور اعداد و شمار سے خود کو جائز قرار دیتے دیتے ایک دم سے اتنے سادوں
 کی پٹریوں تک دیکھ کر کچھ اتنی فحاش ہوئیں کہ مستقبل کے پروگرام کا خاکہ دھندلانے لگا۔ پھر
 سزا جی اپنی بیگم کا بازو دھساے بھاگے آئے اور دھوئی آپا کو تھینکا دھکائی بیگم نے پڑ سوزے
 میں گانے کی گوشش کی تو نفرت سے منہ سکڑ کر پامودی نے اپنے طور پر پھڑکنے ہوئے
 یہ شمر پڑھا:

”اس غیرت نامید کی ہر تان ہے چپکے“

انہوں نے گانے کی کوشش فوراً ترک کر دی۔ عالیہ بوا کو البتہ ترس گیا اور کچھ دیر کو اس کا جی بھلایا اور ہمدردی میں بڑی بوا کو کہا: وہ بے چاری گانا تو الگ رہا، ایک شعر بھی سلیقے سے نہ پڑھ سکتی تھیں۔“

مرزا جی اپنے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھامے اس کا جی بھلانے کی کوشش کرتے رہے پر وہ مزاج کی مذا تیز تھیں، اپنے یہ چوٹ نہ برداشت کر سکیں اور پھر تو وہ سائیں ہوئیں کہ اللہ کی پناہ!

پھر یہی اماں کہیں کبجا رجب بات برداشت سے باہر چلے گئی تو چیخ کر سمجھانے کی کوشش کرتیں مگر نثار خانے میں کسی کی آواز سنائی جاتی ہے؟

دیوار پر سے والوں سے تو کب کی ٹھن جکی ٹھن وہ مزے سے تماشہ دیکھ کر کہنے اور زیر لب سکراہٹ قبضوں کے روپ میں ڈھکھکی بکھر کر شہرہ اپنا صندوق کھول کر روپ دکانے کے بہانے شال لاکر سامنے دیوار پر ڈال دیا کرتے اور ادھر لڑنے بھگڑنے والے وقفہ وقفہ سے چھپائی نظروں سے اس کو گھور کر رہ جاتے۔

اس شال کا بھی عجیب قصہ تھا۔

اس خاندان میں بڑی پرانی چلی آرہی تھی۔ یوں سمجھو کہ جب بھی اس گھر کا وارث پیدا ہوا اس کی پیدائش پر اسے اس قیمتی شال میں لپیٹا گیا اور اعظم میاں تک کو اس پر بڑا ناز تھا۔

مگر جب بیچ میں دیوار کھڑی ہوئی تو دیوار پر سے والوں کے ساتھ اس شال کا تنازعہ شروع ہو گیا اور جب اعظم میاں کی آنکھیں بند ہوئیں تو بھگڑا کچھ اور بھی بڑھ گیا۔

دراصل سب کے مینے میں جب ساما گھر اعظم میاں کی جدائی میں جمع ہو کر شک بہا بہا تھا کسی کو دھوپ میں پٹری اس شال اور وہ اور ضروری کپڑوں کا خیال نہ رہا۔ بسنی دھبے ان قیمتی چیزوں کو بھولے ہوئے تھے !

دیوار پر بے دالوں کا جی لٹایا۔ سو تیلے تھے تو کیا ہوا۔ کسی نہ کسی طرح اپنا حق تو جتایا جاسکتا ہی ہے سو آؤ دیکھنا نہ تاؤ کدوا اور قیمتی کپڑوں کے ساتھ شال بھی دیوار پر بے گھسیٹ لی۔ ادھر جانے کس کی نظر پڑی اور کوئی چلا یا "ارے ذرا لینا پکڑنا۔ وہ شال لے چنے۔"

عالیہ ہوا کا کہنا ہے۔ ادھر کسی نے شال نہیں پکڑی ورنہ دشمن کیوں کامیاب ہو جاتے، وہ تو اتفاق سے اس طرف گئی ایک کیل میں شال اُلجھ گئی زمین سے وہ لے گئے ایک حصہ کیل سے لٹکا ٹھونڈا رہ گیا۔ اب کیل نہ ہوتی تو ساری شال ہانٹھ سے گئی تھی !

مگر جی ہوا کا کہنا تھا کہ انھوں نے شال تھپتھپتے دیکھا ادھر سے پلو پکڑ لیا۔ اور پھر وقتی طور پر تیز ہوتے جذبات کو اُسودہ کرنا چاہا۔

تو اب شال تب سے اسی حالت میں دونوں طرف والے لئے بیٹھے تھے تبیں سے اُدھر اور پھر اُدھر اور کوشش دونوں طرف سے برابر تھی کہ کسی ایک طرف پوری پوری شال آئے اور صندوق میں سما جائے۔

ابھی اسی کشمکش میں کچھ وقت گزرا تھا کہ دشمنوں کی نظر لگ گئی اور سر پر وہ عذاب نازل ہوا کہ جسے اب سارے یاد کر کے توبہ توبہ کرتے ہیں۔

بات کچھ یوں ہوئی کہ اعظم میاں نے جائیداد کی دیکھ بھال کو ایک منشی رکھا تھا۔ نوجوان سا گورا گورا خوبصورت سا چٹھان، صعبی کو اس پر اعتماد تھا خان میاں خاں میاں

کہتے کہتے سبھی کا منہ خشک ہوا جانا اور وہ بھی ہر ایک کے کنگے مسکین بنا ہی حضوری
کئے جانا گروہ بڑا کائیاں نکلا !

سبھی اس کی طرف سے بے فکر بیٹھے تھے 'یوں بھی اس پر عبور نہ کرنا ہی جیتا تھا کہ
ساری جائیداد کی تفصیل وہ خوب جانتا تھا۔ زمینوں کی آمدنی ان کا خرچہ سزا و حق کی
باز پرس اور دیوار پر سے والوں کی غیبی تقویٰ کو گھونگر ٹھکانا سے سبھی کچھ خوب آتا تھا۔
مائلہ آپا سے لے کر عالیہ بونک اور بڑی بوا سے لے کر مرزا جی اور ان کی بیگم سبھی ان
کی جانفشانی کے فائل ہو رہے تھے۔ اسے بلاتے پاس جھانسنے حساب کتاب پوچھنے
حال احوال پوچھنے، شاہاٹیاں دیتے ادویوں ان کا حوصلہ بڑھاتا چلا گیا۔

حوصلہ کچھ اتنا بڑھا کہ پھر اس کا جی گیارہ برس کی پردہ کی حالت پر بڑا کر تھا !
اس کا کہنا تھا کہ وہ تو اس بن ماں باپ کی بی کا ہمیشہ سے خیر خواہ ہے۔ اس کی
پیدا نش سے لے کر اس کے گیارہ برس تک کی ہونے کے سارے حالات وہ خوب جانتا
تھا۔ جو جو ستم اس ننھی سی جان پر کئے گئے اس نے دیکھے اور صرف دیکھے ہی نہیں ابھی
طرح سے جانے حتیٰ کہ کئی بار ایسا وقت بھی آیا کہ مرزا جی نے خود بھلا کر اسے جائیداد
کی آمدنی میں حصہ دار بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔

میرزاں کا کہنا تھا کہ وہ پکا مسلمان تھا۔ دیندار تھا اور ایسی دھاندلی اسے بالکل
پسند نہ آئی اور صاف انکار کر دیا۔

ایک بی بی کا کہنا تھا کہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ اصل میں وہ بی بی کہ جسے گانا تو ایک
طرف رہا شعر چڑھنے تک سلیقہ نہ تھا۔ خان کی بڑی مداح تھیں اور یہ کہتے وقت ان
بی بی کی آنکھیں ٹپکتیں تو بڑی بوا کی باجھیں کھل جاتیں اور پھر پوتوں پر بڑی گہری اور

زہری مسکراہٹ چھٹکارنے لگتی۔

قصہ مختصر یہ سمجھو کہ ایک دن جب اس نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ اب اندرونِ خانہ ہر بار زبانے کے بعد وہ ہر اہم بات کا اہل بن چکا تھا۔

گیارہ برس کی پردہ بین جی کو کچھ آنتا بھائی کہ وہ بے اختیار چو گیا

جس نے سنا دنگ رہ گیا۔ چہرے ہلکی ایسے پیلے پھٹک، اتنے اتنے سے منہ کلک آئے۔ لوجی دیکھ لویہ انجام ہوتا ہے بے اتفاقی کا، ہر دل اپنے آپ میں کڑھا اپنی اپنی استعداد پر غور ہوا اور پھر پوئے پوئے دن گزرنے لگے تو خان کو خوش کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔

پہلے پل تو پھر بھی اماں نکالنے کہہ دیا: "اے جو ہوا اچھا ہوا۔ میں تو پہلے ہی بخدا کتے دیتی تھی کہ ہوش کے ناخن لو۔ کیوں آپس میں جو حتم ہیزا ہو رہی ہو۔ پر میری کون سنتا ہے جو تیل میں دال بت کے رہی برابر اب بھی سنبھل جاؤ۔ چلو اب بھی کچھ نہیں گیا۔ دیر ہوئی اندھیر نہیں ہوئی!"

لیکن پھر دیر کے ساتھ ساتھ اندھیر بھی ہو گئی!

سب سے پہلے یہ بات جس نے کی "اسے خود اپنے آپ پر اعتبار نہ تھا۔ ہے ہے گیا"

سال کی ناسمجھ کے ساتھ یہ ظلم!؟ تو بہ! تو بہ!

پھر عالیہ جانے سواٹھایا اور یوں بھی ان کا ذہن کمپیوٹر کی طرح حساب کتاب میں ڈرا ماہر تھا۔ جو جو دن گزرا وہ خان کے گھر میں جمع ہوتا دھن حساب کے نقطوں کی صورت ان کے ذہن میں ڈھالتا اور وہ ہر سب کے عین درمیان بیٹھی اپنی انگلیوں کی ہڈوں پر چیزی سے گنا کرتی تھیں۔ "ایک دو۔ تین، ہزار لاکھ۔ لاکھ کروڑ۔ کروڑ"

لاکھ کروڑ کی باتیں سننے والے کہتے عالیہ بڑا کا دماغ چل نکلا ہے اور خوب ہنستے مگر ہنسنے ہنسنے آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔

اسی دنوں کام کچھ اتنا ہیسا کہ بے چارہ خان تنہا کیونکر سرانجام دیتا۔ سو اس نے ادھر ادھر نظر دوڑانی شروع کر دی۔

اُس کی نظروں میں آنے کو سب دوبارہ پر توڑنے لگے حالانکہ وہ ان سب کی امیدوں پر گھروں پانی بہانے کے بعد خوب کسل کھیلنے لگا تھا۔

سو ہی آپا دیویوں میں گھیر کر دو ایک بار اندر چ کر آئی تھیں اور اب جائے نماز پر بیٹھی تاک بھوس پڑھا یا کرتیں عالیہ بڑا ابھی تک اپنے طور پر حساب کتاب میں الجھی بیٹھی تھیں بڑی بھاننا غم آپا کے سنگ مرزا بھی کو لایت خط پر خط لکھا کرتیں وہ تو کہیں کے یہاں سے سارے رشتے مٹے توڑ کے مسند پار جا بیٹھے تھے، عالیہ بڑا کہیں کہیں پوچھ کر بتا یا کرنی تھیں کہ ان کے خوجے پورے نہیں ہوتے وہاں مانگیری کر رہے ہیں۔ اشد اشد کیم کو بدلتے زمانے کا حال پھر خاں بابا کے اور گردنئی نئی خشکیں گھیرا ڈالنے لگیں، اسنی میں ایک نوجوان بہر کے کام کرنے پر مامور ہوا۔ تک سک کا اچھا جوانی کے خون کی لالی سانولے سے چہرے پہ بیٹھ گئی ایک کو وہ بڑا بھلا نظر آتا۔ بڑی بڑا کو ایک بار اک ہمدردی بی نے کان میں بھونکا۔

”خان کے اچنوں میں سے ہوگا“

کسی نے بولے سے سرگوشی کی۔ ”ہمدرد بھی تو خیر سے جوان ہو رہی ہے۔ سبھی کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ یہ خاں بابا کیا کرنے لگا۔

پھر ادھر ادھر چھوٹے شروع ہوئی۔ معلوم ہوا امام تو کچھ اور تھا مگر تخلص بے قرار تھا۔ خون بھی گرم گرم تھا اور رہتا بھی ہر دم پارے کی طرح میٹھا اور تھلا۔ باہر کے کاموں میں

بڑا ہوشیار اور خان بابا کے خلاف کوئی بات سننے کا تو بالکل رد و ادارہ تھا۔ جو کچھ کہنے کو کوئی آگے آتا تو جھٹ سے قسطن کی استیں چڑھا تھا بے کو تیار ہو جاتا۔ پھپھلوں کے بارے میں تحقیق ہوتی تو خبر ملی کہ کسی سے کہہ نہ تھا۔ اینٹوں کے کئی پتھر کا تن تنہا ملک تھا اور پھر کیا تھا سبھی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے خان بابا نے پرجنا کا برعلاش کر لیا ہے۔

لیکن زمانے کی رفتار دیکھو! اور صراطِ آدمی آسمان بدل گیا۔

بات کچھ یوں ہوئی کہ مودی آپا کی ایک جاننے والی جو پردیس سے آئی تھیں ایک دن دیوار پر سے والے گھر گئیں۔ دراصل وہ شال کے جھگڑے کو پٹانے کی کوشش میں ہی پھیرے پھیرے ڈال رہی تھیں کہ وہاں سے یہ بات سن کر حیران پریشان سرسید ہو کھاگی بھاگی مودی آپا کے دل آئیں۔

مودی آپا اس وقت قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں۔

حیران پریشان بی بی سیٹھ پر ہاتھ مار مار کر وہ راز دہانے کی کوشش کرنے لگیں۔ مگر کب تک یہ کوشش ہوتی؟ پیٹ میں ڈھیر سا راز دہاٹھنے لگا تو اب مودی آپا کچھ سنو گی بھی کہ نہیں؟

”کاشے کو غری جاتی ہو۔ دیکھتی نہیں یہ آیت ختم کر لوں“

آے خوب دیکھ رہی ہوں بس اب تم یہ سلسلہ ختم کرنا اور میری سنو“

مودی آپا اس بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جائیں مگر ان بی بی کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ اس وقت جو بات تھی وہ کچھ زیادہ ہی اہم تھی۔ سو جلدی سے فاسخ ہو کر پوچھ گئیں: ”کیا ہوا جلدی بولو؟“

”یہ پوچھو کیا نہیں ہوا۔ اے بی بی پوچھو کہ پچھلے چھ برسوں سے کیا کچھ نہیں ہو رہا؟“
 اے ہمیں تو بس یہ خبر ہے کہ میاں متھرا د کو چینی کچھ زیادہ ہی پسند ہے سو بازار میں
 مستانوں کا بھاؤ.... وہ تیزی سے بات کاٹ کر بولیں۔ بس بڑا تمہیں ہوا کیا ہے؟ کیوں
 کونٹیں کا سینڈل بنی جا رہی ہو؟

”تو پھر تم ہی بتاؤ دیر کیوں لگاتی ہو؟ مودی آپا کا سانس پھول گیا
 کیسے بتاؤں تو یہ تو ہے۔“

”اے اب کد بھی چکو دیکھو میرے دل کو دھڑلے جاتی ہو۔“
 ”تمہاری قسم کس منہ سے کہوں! میں تو سنتے ہی دم بخود ہو گئی۔ بات کروں تو کیسے؟“
 مودی آپا کو آگ لگ گئی۔ میں کہوں بس تمہاری یہ بات دھم نہیں۔ خواہ خواہ بھلے
 کونٹ پہنچانے لگی ہو۔ دھم طرح خبر ہے تمہیں، مجھ سے یوں پھیلیاں نہیں دھم جاتی۔“
 ”اے بی بی وہ اپنی پردیہ کی بات ہے؟ وہ پھر روک گئیں۔“

”اللہ اب کد بھی چکو۔“ مودی آپا نے زح ہو کر کہا۔ ”تمہیں میری قسم؟“
 ”ہائے! ہائے!“ ٹھنڈا سانس بھر دہ بی بی بولیں۔ ”بس یوں سمجھو کہ پردیہ کو خان
 نے کہیں کا نہ چھوڑا۔“

”زیں؟“ مودی آپا نے چیخ ضبط کی
 کہنے والے نے تو قسم کھا کر کہا ہے کہ گیارہ برس کی بچی پہلی یہ ظلم ہو گیا۔ اب تو خیر
 سے سترہ برس کی ہو گئی ہے۔“

”آہیں؟“ آپا مودی کی چٹکیاں پھیلیں۔ ”میرے بچوں۔ اللہ قسم! ایسی سچ کو تمہیں
 میرے سر کی قسم!“

ان بی بی نے آنکھوں پر پتھر رکھ لیا۔ میں کس منہ سے کہوں اے اعظم میاں کے بعد
حشر جو نا تھا۔ سچی آپا۔ یہ کیا اندھیر چوہا؟
مودی آپا اس فلم کا جان کر دل گئیں بلکہ یوں سمجھو کہ انہوں نے جس کسی کو بتایا وہ بھی
پھٹی آنکھیں بنے دانتوں تلے انگلیاں دبانا رہ گیا۔
”نکاح ہو جاتا تو پھر بھی تھا۔“ عالیہ برا نے آنکھوں پر عینک جھاتے ہوئے کہا۔
”جے جے معصوم پر یہ قسم! تو بہ تو بہ!“

یہ انکشاف سرگوشی کی صورت اُبھرا اور پھر شعلوں میں ڈھل کر پھیلنے لگا۔ سارا رُیا
پس چڑ گئی۔ سفید روتی ایسے سر کھڑی بالوں بھرے سروں کے ساتھ جڑنے لگے۔ خود آپا
دولتے بی بی، عالیہ برا اور دوسرے سب جو خود آپس میں ٹھن پکنے کے بعد ٹوٹی ملا کے
موتیوں کی صورت بکھر چکے تھے اب اس آگ کی لپیٹ میں آنے کے پلاٹنگ کی طرح سکڑ
اوپر کھینچ کر دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ آن لگے۔ یہ انکشاف جیسے وہ دھاگہ بن گیا
جس نے دوبارہ انہیں ایک دوسرے کے قریب لاکر سی دیا۔

بہت سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ کریں تو کیا کریں۔ جے جے مسلمان کے گھر میں یہ
اعظم۔ یہ تو کافروں سے بھی گئے گزرے ہو گئے۔

پھر سب کے سب برقعے اوڑھ پھر بھی اماں کے ہاں پہنچے!

دہاں کا حال نہ پوچھو تو اچھا ہے۔ ناظمہ آپا نقاب اٹھاتے پھینک پھینک کر دھڑکیں
مودی آپا کا مارے جھکیوں کے بُرا حال ہوا۔ وہ جہیز مردکی رائے کو ترجیح دیا کرتی
تھیں اس بُرے وقت میں پھر بھی اماں میں مردانگی ڈھونڈنے لگی تھیں، عالیہ ہوا پودوں
کو لگی گن اور عینک منبھاتے بے حال ہوئیں اور پھر بڑی بواہک نے وہ چار آنسو ٹپکانے

اور دوتے بی بی نے سرگوشیوں کا آغاز کیا۔

ہوئے ہوئے سب کا رونا دھونا ٹہرتے ہوئے نفلوں میں ڈھلے اور پھو پھو میں کو
بتایا گیا کہ بد نیت خاں نے محصور کو زبردستی زنی ہوس کا شکار بنا لیا تھا۔
ہردن اس مظلوم پر نیا دکھ لے کر آتا ہے اور گئے ہیں کہ اپنے اپنے جھگڑوں میں
بے حال ہو رہے ہیں۔

ان کا خیال تھا کہ پھر بھی اماں کو اس واردات کی خبر ہی نہ تھی۔
پھر بھی اماں کی آنکھیں غصے سے کھلیں اور تب انہوں نے بتایا کہ "اری کبترانجی
تو یہ سب معلوم ہو چکا ہے میں تو اس انتظار میں تھی کہ تمہاری آنکھیں کھلیں نہیں کچھ
سمجھ میں آئے تو پھر سب مل کر اس کے تدارک کا بندوبست کریں۔!!"
"تو میرا بکيا کیا جائے؟" کئی آوازیں بیک وقت اٹھیں۔

پھر بھی اس دیر تک سفید سُرخ دایاں ہاتھ رکھے سوچ میں ڈوبی رہیں۔ اور
گٹھے میں پڑی سفید موتیوں کی مالا کو باتیں ہاتھ کی انگلیوں سے سستے وہ افسردگی سے
سُرخا قی رہیں۔

”میرا خیال ہے، حقہ پانی بند کرو اس کا۔“ نصیلاں بی بی پہلے بدھیں۔ انھیں حقہ پانی کا سبب شوق تھا۔

غصے وقف نہ ہیں۔۔۔۔۔: مری آیا فے ڈاٹنگ۔

”اے تو کیا دھتہ نہیں بیٹا؟ عالمی برائے مصیبت سے پوچھا تو میسر بھی! ماں کا جی
چھا کہ کہہ رہا سرسریٹ لیس۔ میں کہوں محموداں؟ انھوں نے مودی آپا کو مخاطب کیا۔ تو جانتی
عالم فاضل بنی رہتی ہے تو کچھ انہیں بھی عقل دی ہوتی۔!“

”اے چھوٹی ماں! مودی آیا کی آنکھیں کھل آئیں۔“ مجھے کیا کتنی ہر میں تو آپ بیزاد
 بیٹھی ہوں۔ یہ گھوڑیاں مجھ پر کو گھنٹی بھنٹی ہیں کہ یہ تو پردین کی سیدائش ہی سے اس
 کے خلاف ہے۔“

”بھئی بھئی بات کو جھٹلانا کیا؟“ دوتے بی بی بولیں۔ ”جب سے اعظم میاں جندر
 پار گئے ہیں تو تم ہی نے تو مخالفت کی تھی۔۔۔۔۔“

”بس رہنے دو بڑی آپ!“ مودی آپ نے تنک کر کہا: ”گھنٹی باتیں مجھے تو یاد نہیں جاتے
 تم کون سی بات کہاں سے لے اڑتی ہو۔ بغیر سیاق و سباق کے خاک معلوم ہوتا ہے اہل
 بات کیا ہے؟“

اب ناظمہ آپ بڑے ہوئے ہیٹ پر ہاتھ رکھ کر بولیں: ”چلو جانے دو پرانے گڑے
 مڑے اکھیرنے سے فائدہ؟ اب تو یہ سوچنا ہے کہ مسموم کو اس کے پنوں سے کیسے نکالیں؟
 ”مسموم کی فکر کیسے ہے؟“ چھوٹی ماں نے فستے میں سچ بات کی۔ ”سبھی کو اپنی اپنی
 ہانڈ کی روٹی کی فکر ہے۔“

سبھی نے نظریں نیچی کر لیں۔

”اب فستہ تنوک دو چھوٹی ماں!“ ناظمہ آپ نے التبا کی۔

”ورنہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔“ عالیہ براہمت کر کے بولیں۔

”خانہ ان میں جو مٹری مٹری ہوگی وہ الگ اور جو تھوٹکا پڑ رہی ہے وہ علیحدہ۔۔۔“

ایک بی بی اند بولیں۔

”ہیں اور کیا کر سکتی ہوں“ چھوٹی ماں نے کانپتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے پوچھا

”تم سب کچھ کر سکتی ہو۔ سب نہیں جانتے ہیں چھوٹی ماں!“ ناظمہ آپ بولیں: ”او“

معصوم کو بچا لو؟

”میری رائے بھی یہی ہے۔“ دو تھے بی بی تاک پہ انگلی دھر کر بولیں۔

”تجے چاری پر بڑا ظلم ہو رہا ہے۔“ عالیہ بولا بولیں۔ ”میں خوب جانتی ہوں۔ وہ بالکل معصوم ہے۔“

”گیارہ برس کی عمر میں اسے بھلا دنیا کی اُدھنچ پنچ کی کیا خبر تھی۔ مودی آپا سر پر پچولے کر چولے سے بولیں۔ ”وہ کس سے فریاد کرے؟“

بھوپھیں اماں کا دل بھر آیا۔

اب سب کے ہتے ہوتے سرود بارہ جلا گئے اور پھر سرگوشیوں میں تباہی مچ رہی تھی۔
ہونے لگا۔

آخر میں فیصلہ ہوا کہ پنچایت بلائی جائے۔

اس فیصلے کے بعد معلوم ہوا کہ پنچایت بلوانا کوئی گڈے خرڈیا کا کھیل نہ تھا۔ ناظم پاپا مودی آپا۔ دو تھے بی بی اور عالیہ بوا وغیرہ سے کئی ایک خفا تھے۔ کئی بڑے بزرگ ان عورتوں کے کروتوت خوب جانتے بوجھتے تھے۔ اور بے حد تالاں تھے۔ کئی ایک تو ان کی رگ رگ سے واقف ہونے کے ناطے خان بابا کو سچا اور مسلمان جانتے تھے۔

لیکن بھوپھیں اماں ایک ایسی سستی تھیں کہ جن کے سفید بالوں اور بڑھا چکے ہی سب کو پاس تھا اور جب انہوں نے ان عورتوں کا ساتھ دیا تو کئی بزرگ ان کا اعتبار کرنے لگے۔ اسی اثنا میں ناظم آپا کا انتقال ہو گیا۔ تو کئی ایک جہودی میں ساتھ دینے لگے۔

ادھر بے قرار مہیاں کو جب اس سازش کا علم ہوا تو خان بابا کے کہنے کے مطابق انہوں نے ان کا توڑ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اچھے بھلے مرد کے منہ کو عورتیں آنے لگی ہیں غصہ غصہ!

اصل سچ بات یہ ہے کہ بے قرار میاں کو اپنے مالک پر پورا اعتبار تھا۔ اسے یقین تھا کہ پردہ ایسی معصوم جس کی بدلت وہ ہر طرح سے صاحب الرائے بنا ہوا تھا خانہ بانہ کے کسی ظلم کا شکار نہیں ہو سکتی۔ ادھیڑ عمر کا مرد اور اتنی سی بچی۔ تیرہ بیس پاؤں لٹکانے والا اپنی عاقبت دونوں خراب کا ہے کو کرنے لگا۔

پنچایت بلوائی گئی۔ خوف شہو بھا۔ بڑے جیسے حاشی آئے دونوں طرف سے بڑی بڑی تقریریں جو تیں اور جب پھر بھی اماں نے صاف صاف کہا کہ ان کو یقین ہی نہیں بلکہ اس بات کے شواہد بھی ہیں کہ خان بابا معصوم پر دین کو اپنی ہوس کا شکار بنا رہا ہے۔ تو یوں محسوس ہونے لگا جیسے سب لوگ خان بابا کے مخالف ہیں اور سب ہی حق کا ستھدیں گے۔ پھر بحث شروع ہو گئی۔

خان بابا بھاگے پھرتے سب کو گلاب کے پھول پیش کرتے۔ بے قرار میاں نے ان کے خلاف عاید کردہ الزامات کے جواب دیئے اور گرگرمی میں بحث کا اختتام ہوا۔ بالآخر پنچایت نے آخری فیصلہ نام شروع کیا لیکن ابھی آغاز ہی ہوا تھا کہ بھلی نفل ہو گئی تب لائیں کی روشنی میں پورا فیصلہ سنا گیا جسے سستے ہی مودی آپادھاڑیں ماما کر رہے تھیں اور پھر ان کے رونے میں عالیہ بوا بڑی بوا دوتے بی بی اور سب ہی نے ساتھ دینا شروع کر دیا۔ وہ رو کر ناظمہ آپادھاڑیں لگیں۔ اچھا ہوا جو اس بڑے وقت کا منہ دیکھنے سے پہلے آنکھیں بند کر گئیں۔

ایک پھر بھی اماں تھیں کہ خاموشی سے سینے میں اُبلتے ہوئے جذبات و باکرو گئیں اور آنکھوں میں ایک ذرا سا آنسو آیا تو اسے آنکھوں نے ضبط کر لیا اور لائیں کی جلتی ہوئی تہی کو گھور کر دیکھنے لگیں۔ اس وقت منہ سے کہہ کر کیا رہتا تھا۔ وہ جانتی تھیں اس

زمانے میں سونے کا ذرہ بھی سوراخ بن گیا ہے !!

ابھی خان بابا کے ہاتھوں زخم کھاکر کوئی سنبھلا بھی نہ تھا کہ ایک اندھ ظلم ہو گیا۔

دیوار پر سے والوں نے شمال کے تسانے پر مشتعل ہو کر پروین پر حملہ کر دیا !!

خود سے سوچو تو یہ فسادوں بڑھا کہ خان بابا کے ہاتھوں زخم خوردہ پروین دیوار پر
نڈھال ہو رہی تھی اور شمال والے جگڑے کی وقعت قدرے کم ہونے لگی تھی۔ کہ ایک روز
دیوار پر سے والوں نے شور مچا دیا کہ پروین دیوار پر سے پھلانگ لگا کر صدق تک پہنچی اور
ابھی اس کا ڈھلکا اٹھا کر شمال باہر نکالنے لگی تھی کہ انہیں خبر ہو گئی۔ سواغفوں نے اسے
مارنا پشیا شروع کر دیا۔ اس کی دل و دھڑکیں ٹس کر اس کے حاسنی آگے اور پیچھے جگڑا بڑھا
مگر جاننے والے جانتے کہ شمال کے اتھنائی قیمتی ہونے کے سبب ہر روز قربانی
حاصل کئے جاتے ہوئے ہیں ادا اب پروین کو نڈھال دیکھ کر دیوار پر سے والے موقع
سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے انہیں اس طرف جانے والے واقعات کی ساری خبر
تھی۔ سو شمال کا جو تھا حصہ بھی مل جائے تو اور کیا چاہئے۔

شمال کا جگڑا سب کے لئے اتھنائی اہم تھا۔ سو ساری بہادری نہاپنے اپنے
جگڑے بھول کر ایک جان ہو کر دیوار پر سے والوں کا مقابلہ کیا۔

سادوں کا کہنا تھا کہ سب ہی نے مقابلے کا حق ادا کیا اور پھر انہی دنوں میں
بے قرار میاں کو بھی معلوم ہو گیا کہ کتنے والے غلط نہیں کہتے تھے۔ خان بابا واقعی اس
معصوم پر ظلم کر رہا تھا۔

یہ خبروں ہوئی کہ زخمی پروین سترہ گھرے زخموں کے مارے کو ہستی اپنے چنگ
پر پڑی تھی کہ میاں بے قرار ڈاکڑے اس کے لئے دوا لے کر آئے اور اندر صحن میں

اگر دیکھا کہ سانسے ٹکڑے کا دروازہ بند ہے۔

دھکا دیا دروازہ کھل گیا مگر

وہ دیکھتے ہی جھکا کر قدم پچھے کو ہٹے۔

خان بابا بے خودی کے عالم میں دنیا و مافیہا سے بے پرواہ بدیسی دارو کے لئے
میں زخموں سے چور نازک سے بدن پر ٹھجکا ہوا تھا۔

زخمی اچھڑا دیں ڈوب رہا تھا "مجھے تنگ مت کرو بابا!"

"تنگ کہہ کر مرنے کا حق تو میری جان ہے۔"

"تم نے کیا کیا ظلم نہ کئے ہیں، بسکسی سی ابھری۔" اب تو کچھ خیال کرو۔

"ہم تمہیں خون دھجکے پاتا، کیوں گھبراتا؟ خان بابا بولا

"مجھے چھوڑ دو۔" اس نے گھس کر اپنے آپ کو سٹینا جاپا، پھول ایسے چہرے پر

بالوں کی لٹ بکھری پڑی غصے اور سینے کے اُتھار پر درد سفید کبود زخموں اپنی پیاز کی چوٹیں

چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ "مجھے چھوڑ دو خدا کے لئے!"

بنے قرار مہیاں کا مارے غصے کے بُرا حال ہو گیا۔ سارے جسم کا گرم گرم خون پارے

کی طرح چہرے پر آیا اندر زخموں پر پھلنے لگا، مسٹیاں بھیج کر انہوں نے زور سے یا

علی کا غرہ لگایا تو خان بابا کا سارا جسم کانپ گیا۔ گھبرا کر اس نے ہر دین کو بھٹ دیا اور

پلٹ کر بغیر ارمیاں پر حملہ آور ہوا۔

دوڑوں کو لڑنا دیکھا کہ پوری سسکیاں لینے لگی اور اپنے نیم برہنہ جسم کو جس پر بڑے بڑے

زخموں کے منہ کھلے تھے۔ ڈھانچے کی کوشش کرتی کرے کے کونے میں سمٹ کر لالہ

جلدوں والی کتابوں کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

لڑائی ہوئی اور خوب ہوئی مگر بقیہ آدمیاں کے ہاتھوں میں صرف دوا کی شیشی تھی اور خان بابا نے لپک کر کمرے کے کونے میں پڑی سمند پار بنی بندوق اپنے دائیں ہاتھ میں اٹھالی اور بائیں ہاتھ میں وہ دوائی پکڑی جو ابھی پچھلے دنوں ایک مزاح نے اسے بطور تحفہ پیش کی تھی۔

ظاہر ہے شکست بقیہ آدمیاں ہی کی ہوئی تھی۔
رومال سے ماتھے سے ہار کا پسینہ پونگھتے وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئے تو راستے میں مودی آپا مل گئی۔

دیوار پرے والوں کے ہاں جانے والی بی بی سے سارا سال سن چکی تھیں۔ بڑی طنز سے مسکرائیں، برقعہ کی اوٹ سے سلام کیا حال بوجھا اور یوں گویا ہونٹیں یہ بدل کہاں سے لیا۔ بڑا قیمتی معلوم ہوتا ہے۔

وہ کچھ نہ بولے تو پھر کیا کہتے میاں ہم تو پہلے ہی جانتے تھے تمہارا یہ حال ہوگا!
ادھر بھیڑ بھی اماں تھیں کہ سارا حال سنا اور ضبط نہ کر سکیں پہلے ہی نیم مردہ ہو رہی تھیں۔ اب جو ہر طرف سے آہتی ہوئی سرگوشیوں کی پھینکاروں میں گھیریں تو دل ہی دل میں پر دین کو ظلم کے شکنجے سے بچانے کی آرزو نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔
پھر چلے ہوئے دن سرگتے چلے گئے۔

پر دین نیم جان سی کمزور کمزور پہلے چہرے کے ساتھ اٹھ کر برآمدے میں آن بیٹھی مٹی کے تیل والا چراغ لٹکا کر خان بابا کے بیٹ بھر لے کا سامان تیار کرتی اور کھانسی کھانسی کر بے حال ہو جاتی اور کچے فرش پر ڈھس جاتی۔

دیوار پر پنے والے خوش ہو ہو کر نڈر بانٹنے کو پھر شام ان کے ہاتھ بھی ایک پر دین کی

لڑکی اگنی ہے جو زخموں سے چور محوک کے مادے جلتی آہیں بھرتی رہتی ہے اور وہ میں کہ شمال کے ذریعے اس کے زخموں کو ڈھانپنے کی کوشش کرنے کرتے تنگ آ چکے ہیں۔

مودی آپا کو یہ سنا کر عالیہ برا بولیں: ”میرا تو خیال ہے اب اللہ اللہ کیا کروں ہر وقت حساب کتاب کرتے رہنے کی عادت نے دماغ شل کر کے رکھ دیا ہے۔“

پرمودی آپا کے تو عزائم ہی کچھ اور تھے: ”ابھی سے جی ہار بیٹھیں؟ تم نے ساتھ نہ دیا تو کوئی ہاتھ تھامے گا۔“

”اے اب تو میاں بھیرا بھی تمہارے ساتھ ہیں۔“

”لو اید سنو: مودی آپا اتنے پر ہاتھ رکھ کر بولیں: ”جیسے تو وہ ایک آنکھ نہیں بھانپتا۔“

”اے وہ کیوں؟“

”اے ہوا۔ مجھے تو اس کی یہ جینی پسند کرنے والی عادت بالکل پسند نہیں غضب خدا

کا زیادہ جینی کھاؤ تو شکر کی بیماریاں جو نے کا احتمال رہتا ہے۔“

”کمال ہے مودی آپا۔“ عالیہ برا بولیں: ”پر میں تو تنگ ہو چکی ہوں۔“

”تھکاوٹ کی بات چھوڑو؟“ مودی آپا پرمودی سے بولیں: ”اے میری ماں تو اس

گنگا رکے لیتے لو۔ اللہ مدد کرے گا؟“

انہوں نے گنگا رکے لئے کیا لینے تھے۔ وہ تو اللہ نے ایسا سامان کر دیا۔

بھیرا رسیاں کا قریب حال تھا کہ گھر کے بھیدی تھے اس ڈر سے کہ کہیں لکنا نہ ڈھاریں

خاص باپانے وہ ایک باہر والا ندرہیں اندر معاملہ طے کرنا چاہا مگر پارے کی طرح پھلنا دل تھا۔

کہ ہر لمبے اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کو سوچا کرتا۔ یوں بھی دل کو پر دین اتنا بھائی تھی

کہ اب سوائے اس کے کچھ اور سوچتا بھی نہ تھا۔

وہ معموم سی صدمت، غم اور دکھ تلے زرہ زرد سی 'نوخیزی کی چمک اور بجتی ہوئی رات کے انگاروں ایسی آنکھیں۔ بسی لمبی مگر اجڑی ہوئی پلکیں اور سوکھے سوکھے سے ہونٹ جن کی بناوٹ اپنی مثال آپ ہے۔ بیقرار میاں کے ذہن میں اس کا ہر انداز جھلک دکھاتا اور چھپ جاتا ان کی بیقراری بڑھنے لگی۔

یوں بھی جب تصور ہی تصور میں وہ پردوں کے سرسید و پٹے کی جگہ پوری مثال اور صریح دیکھتے تو بے اختیار دل سے ہر ک نکل جاتی جس کچھ اور بھی نکھر جاتا۔ ! گھر کا بھیدی لنگا ڈھانے پر کمر بستہ ہو گیا بے قرار میاں نے باقاعدہ خان بابا کی حرکتوں کی ٹوا یعنی شروع کر دی اور پھر وہاں کے واقعات کا جب اپنے خاص انداز میں ذکر شروع کیا تو جو سنا بس سنا ہی رہ جاتا خان بابا کے دھول کے بول کھلنے کی دیر نہ تھی کہ دھاگوں کے گولے کی طرح وہ کھلتے چلے گئے۔

شال کے جھگڑے میں بیقرار میاں نے جو کردار انجام دیا تھا وہ سب کی نظروں میں تھا۔ سوائے اس ایک بی بی کے جو دیوار پر سے والوں کے ہاں آ جا کر جھگڑا پٹاتے پٹاتے جھگڑے کی شدت میں اپنی سٹی گم کر چکی تھیں۔ سب ہی سر نہکھوڑ پر بٹھانے لگے تھے۔

بیقرار میاں کی گوشیشیں رنگ لائیں۔ خان بابا کے خلاف ایک طوفان تیزی سے اٹھا اور پھر جیسے چاروں طرف سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

ادھر بے قرار میاں کی پاٹ واہ آواز تھی کہ نعرے پر نعرہ لگ رہا تھا۔

ادھر ناظمہ آپا کے جانشین مودی آپا کے ساتھ آئے۔ عالیہ بھائیں درتے

بی بی لک لک کر مشورے دینے کو موجود ہو گئیں بھیسراں بی بی تو اپنے سمیت

بیقرار میاں کی مدد کو آئیں۔ اور تو اور اصغری خانم جو کسی زمانے میں خان بابا کی معتقدوں میں تھیں، کچا چٹھا جان کر اپنے میاں سمیت بیقرار میاں کی مدد کو آئیں۔

بڑی بوا، بڑی بی، بڑی چودھریاں اور سب ہی دوسرے سردوں نے اٹھ اٹھ کر پھانا شروع کر دیا، بقول بیقرار میاں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جنگل میں شیر کے مرنے پر ہر طرف سے کثیرے مکڑوں نے یلغار کر دی ہو۔

اسی یلغار میں خان بابا کا دم گھٹ گھٹ گیا۔

اک صبح سب کو پیغام آیا، میزوں کے گرد بیٹھ کر دعوت اڑانے کی درخواست بہنوں کے منتھنوں میں قسم قسم کے کھانوں کی تھک اٹھی، سردی آپا سمیت کئی ایک مگر بیہوشوں نے جلدی جلدی نئے سوٹ سلوائے، رنگ ہر رنگ دوپٹے اوڑھے اور بے سوچے سمجھے دعوت میں شریک ہونے کو بھاگے۔

نہ گئے تو ایک بیقرار میاں اور ان کے رفیق لاثانی۔

دعوت سے بھی کوئی بھرم نہ رہ سکا تو ایک صبح سردی آپا یہ جان کر دم بخود ہو گئیں کہ خان بابا ہتھیار ڈال گئے۔!

”خان بابا بھاگ گیا؟ ایک ساخند کئی آوازیں اٹھیں۔

جائے کہاں گیا۔ کوئی کتا اپنے شرمیلے داہیں بھاگ گیا۔ جہاں سے غیور شاہیں پر خاک سمانے کو چل دیا۔ کہاں گیا کدھر گیا کب گیا کے شور میں عالیہ بوا کو فکر ہوا کہ وہ گیا تو خیر سے جانا ہی تھا مگر اب پردہ میں کہاں ہے؟

سارے کے سارے برقعوں میں لپٹے لپٹائے، شالیں اوڑھے، رنگیں دھڑوں کو لہراتے پردہ میں کے شرمیلے اپنے اٹھ دھرنے دڑے۔

مگر گھر کے باہر ہی روک دیئے گئے۔

خان بابا جاتے جاتے اپنے ایک بھائی ڈکڑا کو پردین کے پہرے چھوڑ گیا تھا!!
گھر کی دلیز پر قدم دھرنے کا اسانہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ بیسنے میں گھٹ کر رہ گیا۔
کولہوں پر ہاتھ دھرے منہ ٹٹا کر کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ جو بوڑھی بھائی تانے
انہیں روکے ہوئے کہہ رہا تھا: "فکرت کرو۔ پردین خبر پت سے ہے ہم اس کی مدد کرے گا؟"
عالیہ بولنے لگیں: "ہم پر ہاتھ تھا تمام لیا اور صاف کہہ دیا: اے سودی آپا! مجھ میں تو
اب بالکل بہت نہیں۔ میں تو گھر پہلی۔ اللہ اللہ کرنے کے دن آگئے۔"

صغریٰ خانم نے فوراً ہی ساتھ دیئے کا ارادہ ظاہر کیا مگر سودی آپا کی شرمشک
آنکھیں دیکھ کر فوراً ہی توبہ توبہ کر کے دوبارہ ہاتھ تمام کر کھڑی ہو گئیں۔
یوں بھی ابھی انہیں اس خاندان میں قدم دھرے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ کہ
توبہ توبہ کر لیتیں؟

باہر توبہ حال۔ اور اندر صحن میں پردین مٹی کے چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔
صبح سویرے کا وقت تھا۔ سورج ابھی نکلے کو تھا۔ جب پہلی کرن بیٹھنے لگی تو
سامنے اس دیوار پر پڑے گی اور پھر سارا گھر جگمگا جائے گا۔

پہلے تو ایک ہی گھر تھا۔ مگر جب جھکڑا اس سے بڑھا تو بیچ میں ایک دروازہ کھڑی
کر دی گئی اور پھر جوں جوں وقت گزرنے لگا بیت نے جھکڑے بڑھتے چلے گئے۔ ابھی
ابھی زینت بڑا اس کے پاس سے اٹھ کر باہر گئی تھیں۔

انہوں نے اسے سب کچھ بتایا تھا۔ سودی آپا کے ہاں سارے جمع تھے۔ سب
ہی اس کے بارے میں پریشان ہو رہے تھے مگر اس کے دل میں کیا ہے کوئی بھی تو

پرچنے نہیں آتا تھا۔

بچے فرش پر گشتِ شادیت سے اُٹھی سیدھی لکیریں کھینچتے اسے سب کے چہرے یاد آ رہے تھے۔ ان سب کے جو اس کے ہمدون تھے اور ان سب کے جو ہمدون کسونا چاہتے تھے، مگر یہ کیسی ہمدون تھی کہ ان کے چڑھتے سورج کی روشنی کرنیں بھی کا لاد پو دھا کر آتی تھیں۔

ابھی ابھی زینت بڑا اسے بتا کر گئی تھیں کہ ذکریا خان نے فریادیں بڑائی تھی اور وہ اس کی قسمت کا فیصلہ کرے گی۔

فیصلے کے لئے بڑے زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بیخارا میاں سے لے کر مودی آپا تک اپنا حق جانے کے لئے بھاگ دوڑ میں ہیں۔

جولے کے قریب اُلجے بالوں کو سنوارتے ہوئے بھڑیوں نے سامنے دیوار پر دیکھا۔ ابھی تک سورج کی پہلی کرن نہ جھلکائی تھی۔

اسے اس کرن کا انتظار تھا جو واقعی سنہری اور روشن ہوتی ہے!

”آدبِ لطیف“ لاہور

ما تم یک شہر آرزو

ہال میں دہلی دہلی سرگوشیاں مکتیوں کی بھنبھناہٹ کی مانند ڈوبتی اُبھرتی ہیں۔ کبھی کبھی کسی میز پر سے کوئی قہقہہ گونجتا اور پھر اپنے اچانک پن پر شرسار جلد ہی دھوئیں داڑ کافی کی جلی جلی خوشبو میں غائب ہو جاتا ہے۔ ابھی پردہ اٹھنے میں کچھ دیر باقی ہے۔ میرے سامنے کی کرسی پر پیشاب یہ شخص جو انسانی انہماک کے ساتھ پائپ پینے میں مصروف ہے۔ جیسے دنیا میں اس کے لئے اس سے زیادہ دلچسپ اور اہم کام کوئی نہیں۔ یہ میری بہن کا دلور ہے۔ میں اس کے پائپ میں انہماک اور اپنے وجود سے عدم توجہی پر چپکے سے دل میں مسکراتی ہوں۔ تو یہ طے ہے کہ تم عورتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تمہارا خیال ہے میں تمہاری آنکھوں کی زبان نہیں پڑھ سکتی۔ خوب! قاسم میاں آدم تمہیں ایک ناز کی بات بتاؤں بہنو کی تم نے کبھی شکاری کتوں کو دکھا ہے جب وہ اپنے نچھٹے ٹھٹھلا کر ہا میں اپنے شکار کی خوشبو سونگھتے ہیں اور کس قدر جلد اپنے شکار کو جالیتے ہیں۔ تو تمہیں اپنے شکار کو ان سے بھی جلد پہچان لینے میں بالیک

پہلی نظر میں وہ مرد کی آنکھوں میں اتر کر اپنا مقام تلاش کر لیتی ہیں میرا جی چاہتا ہے میں میز پر آگے کو جھک کر اسے یہ بات بتاؤں اور اس کے منہ پر ہنسوں مگر سیاں میں اکیلے نہیں بیڑے دائیں ہاتھ کی کسی پریشانی عورت جو آگے کی طرف جھک کر دے دے لیجے میں کوئی گفتگو نہ رہی ہے میری بہن ہے۔ میں اس کے چہرے کو پل کی بل غور سے دیکھتی ہوں وہاں دن بھر کے واقعات کا ہلکا سا سایہ بھی نہیں۔ یہ اس کا پبلک فیس "PUBLIC FACE" ہے، ابھی کلب آنے سے گھنٹہ بھر پیشتر یہی عورت ایک چھوٹی سی بات پر اپنے خاوند سے جھگڑی تھی اور دونوں نے امتحانی تلخ لیجے میں ایک دوسرے کو کھری کھری کہہ سنائی تھیں۔ مگر اب وہ چہرے پر مسکراہٹ طاری کئے اپنے خاوند سے یوں باتیں کر رہی ہے جیسے مدتوں سے ان میں لڑائی جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اور بائیں طرف بیٹھا مرد جو سنجیدگی سے اور دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا ہے، میرا جہنوی ہے میرا جی چاہتا ہے میں اس کے کان میں سرگوشی کر دوں کہ کیا آپ نے میری بد مزاج بہن کو معاف کر دیا تا صبر بھائی، مگر اس کے چہرے سے ایسا لگتا ہے جیسے سامنے بیٹھی عورت ہی اس دنیا میں اس کی واحد دلچسپی ہے۔ اسپرنگ وار دروازہ بغیر کسی شور کے کھٹنا بند ہوتا ہے۔ میز پر تقریباً ساری بھر چکی ہیں، بغیر ٹیکسوں نے اب سارے آداب پس پشت ڈال کر اونچے اونچے قہقہے لگانا اور تیز تیز باتیں کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہال کے وسط کی ایک میز اب بھی تنگ خالی ہے اور پردہ اٹھنے میں چند منٹ باقی ہیں۔ اچانک میری بہن کسانا اُدھوری چھوڑ کر دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایک لمحے کے لئے بدلتے ہیں مگر پھر وہ خوش باشی اور بے فکری کے ساتھ اپنے خاوند کی طرف نظر آتی

موزیٹی ہے۔ ”ناصر۔ ایک عجیب بات سفر۔ ڈاکٹر آفریدی اپنی ٹیم کی بجائے سلسلے کے ساتھ آیا ہے۔ اس نے بات کے دوران اپنے میاں کو اطلاع دی اور پہلانی بات شروع کر دی۔ میں نے آنکھیں اٹھائیں اور دیکھا بال کے وسط کی جو ایک میز خالی تھی اس پر ڈاکٹر آفریدی اور سلسلہ بیٹھ رہے تھے میں نے دائیں ہاتھ جھک کر سرگوشی میں پوچھا ”یہ سلسلہ وہی نئی ڈاکٹر ہے نا جس کے ساتھ آفریدی کا A F F A I R چل رہا ہے۔“ معظ نے گھور کر مجھے دیکھا اور تنبیہ کے انداز میں بولی ”بی بی کنواری لڑکیوں کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔“ قاسم نے منہ سے پاپ نکال کر معظ کو مسخرے دیکھا لگتا ہے ابھی وہ اپنا فلک شگاف قہقہہ لگا کے لگا کر وہ صرف سکرا نے ہوا تھا کرتا ہے پھر پاپ منہ سے نکلتا ہوئے ٹک کر اپنا منہ معظ کو مخاطب کرتا ہے۔ ”اور کنواری لڑکیوں کو ایسی جگہوں پر آنا چاہئے۔“ کہیں بھابی؟“ اس کا لہجہ کچھ کچھ سوالیہ ہے مگر چہرے پر سوائے تسخیر پسینہ جی کے اور کچھ نہیں۔ معظ پچھلے میری طرف دیکھ کر میرے چہرے کے تاثرات سے کچھ جاننے کی کوشش کرتی ہے اور اطمینان سے کہتی ہے۔ ”لیکن یہ کوئی ایسی ایسی جگہ تو نہیں نام؟“ ابھی خاصی شریف لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ اب کے قاسم قہقہہ لگاتا ہے مگر اس کا قہقہہ معمول کی مانند بلند نہیں۔ میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنے بارے میں ان کی بحث سنتی ہوں۔ ”قواب کے خیال میں ڈاکٹر آفریدی شریف انسان نہیں۔ اب معظ قاسم کی بات پر تقریباً جھنجھلا کر صر کی طرف دیکھتی ہے اور ناھر کچھ کہنے کو لب کوٹتا ہے۔ کمرورانی اہانگ بار کا پردہ ہٹا کر نمودار ہوتا ہے اور اسٹیج کے قریب کھڑے ہو کر انانوس کرتا ہے۔“ خاتین و حضرات۔ اب ہمارا پردہ گرام شروع ہوتا ہے۔“ اور اس کے بعد وہ پردہ گرام کی تفصیل بتانے لگتا ہے قاسم اپنی نشست کا رُخ اسٹیج کی طرف

کر لیتا ہے۔ میں اپنی دونوں کھنیاں مینڈرنگا کر گئے کی طرف جھک جاتی ہیں میں مصر میر پہلی بار بیٹے ڈانس دیکھ رہی ہوں اور اُسے ہوری طرح دیکھتا اور اس سے پورا لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔ مگر میرے سامنے کی مینڈر آفریدی کا بڑا سا سر ہے جو مڑکا رقاصہ کی بجائے سلسلہ کے چہرے کا طواف کر رہا ہے۔ میں منظر کی آستین کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اسے مخاطب کرتی ہوں۔ "آفریدی کی عمر کتنی ہوگی۔ منظرہ باجی۔" وہ ناگواری سے مجھے گھورتی ہیں۔ "یہ تم ڈانس دیکھنے کی بجائے لوگوں کے زائچے کیوں بنا رہی ہو نہیں خفت مٹانے کو مہنس دیتی ہوں اور پھر ایک دوسرے شخص کے گانوں سے اپنے تھمتے کو بال میں اُبھرتا، گوجتا اور پھر ڈوبتا سنتی ہوں، قاسم گردن مڑ کر مجھے دیکھتا ہے۔ پریشان سی نظر کہ آخر سنسنے کی کیا بات تھی؟"

مصری رقاصہ کا نیم عریاں جسم درد دھیاؤ شینوں میں جھلکا رہا ہے۔ اس کے سیاہ بال اس کے شاندار بکھرے ہوئے ہیں اس کے جسم میں ہلا کی پھرتی ہے مرد اپنے ہاتھوں میں چلتے سگرٹ ٹنک بھلا بیٹھے ہیں میرا جی چاہتا ہے میں اس وقت تمام کے برابر کی نشست پر ہوتی اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتی۔ ایک نیم عریاں جسم رقص میں۔ ہے مجھے مصری رقاصہ کا رقص بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ میں کوئی موسم نہیں لیکن شبانہ زندگی کی ہر بات دیکھ کر مجھے انتہائی صدمہ پہنچا ہے، آج سے پہلے کبھی کسی نے میں بھی عورت کو اتنا ذلیل نہیں کیا گیا۔ عورت پہلے حرم میں ناجی، پھر غلاموں کی منڈی میں ناجی، لیکن اب — اب عورت ہر جگہ عریاں ہے۔ ہر شے پر ہر شہر میں عورت ہے اور عریاں ہے۔ یہ عورت کا سراسر تجارقی وحش استعمال ہے میرے منہ کا ذائقہ انتہائی گڑوا ہوا جاتا ہے۔ میں اپنی توجہ مٹانے کو سلسلہ کے چہرے کی طرف ہکتی

ہوں پھیں چھبیں کے لگ بھگ ایک خوب صورت چہرہ اس کے چہرے کا حسن پکار
 پکار کر اس کے ایرانی نسل ہونے کا یقین دلاتا ہے میں نے اسے کل سہ پہر میں روڈ پر
 دیکھا تھا۔ وہ سفید اسٹائل ایک بازو پر ڈالے دوسرے میں پرس لٹکانے بڑے مزے
 میں اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے اپنا سر خاصہ چونکا دینے کی جھنگ اُپر
 اٹھایا ہوا تھا۔ جیسے اسے اپنے ارد گرد چلتے لوگوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ جیسے اس
 کا مقام وہاں آسمان کی وسعتوں میں تھا۔ تب غلطی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ ڈاکٹر سلمیٰ ہے
 آفریدی کے پاس ایک Vase andy اس تھی اس پر آئی ہے۔ اور آفریدی نے
 اس پر ایک نظر ڈالتے ہی اپنی بیوی کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا آج کا یہ اس
 بات کی پوری گواہی دے رہا تھا۔۔۔ مصری رقاصہ اپنا رقص ختم کر کے جا چکی ہے
 آفریدی سلمیٰ کی طرف دیکھ کر کچھ کہہ رہا ہے اور وہ شرمیلی سی مہنسی مہنسی رہی ہے ہنستے
 میں اس کی گالوں میں نچنے نچنے سے گرہ لے چڑھاتے ہیں۔ تاسم نے اپنی نشست کا رخ
 ٹھیک کر لیا ہے اور مینز پر پائپ رکھ کر جیب سے تمباکو کی ڈبیا نکال رہا ہے۔ ناصر مصری
 رقاصہ کے رقص کے بارے میں غلطی کو کچھ بتانے کی کوشش کر رہا ہے غیر ملکی جن میں
 زیادہ تعداد امریکیوں کی ہے مل کر خاصا شور مچا رہے ہیں۔ فساد و سرگرمی اور کافی کی خوشبو
 سے بوجھل ہو رہی ہے۔

دوڑانی پروگرام لسٹ نکال کر پھر اسٹیج کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے اب مصری
 حسینہ عربی کا ایک گیت سنائے گی۔ تاسم نے گردن ہودھ کر اپنا رخ پھر اسٹیج کی طرف
 کر لیا ہے۔ میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھی ہوں۔ مصری حسینہ
 کا گیت بھی مجھے اپنی طرف میں کھینچ سکا۔ میں بے بسوہ کے احساس کے ساتھ کھیں

بند کر لیتی ہوں۔ اور اچانک وہ کوچہ جسے میں کوسوں پہلے چھوڑ آئی ہوں میری آنکھوں میں روشن ہو جاتا ہے۔ میں یہاں سب کے درمیان اپنی گنہگارنا چاہتی ہوں مگر میرا اندر کا جی دور درو کر بلکان ہو جاتا ہے میں کیا بات کروں۔ میں تم کو کیا سناؤں آدمی کبھی کبھی اس کیفیت سے بھی گزرتا ہے کہ جہاں دل میں صرف ایک بے نام سادرد ہی رہ جاتا ہے۔ نہ اُمید نہ مایوسی۔ نہ کسی چیز کی اُس۔ نہ کسی شے کی لگی نہ جنت نہ نفرت۔ انتظار بھی نہیں۔ سفید آنکھیں۔ سرد اور بے جان جسم جس کو تھک کی اوندھ بے رہ جاتی ہے۔ یہ میں ہوں۔ یہ میں ہوں۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی تیز کپکپا دینے والی لہر دوڑ جاتی ہے۔ میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی ہوں۔ میری پیشانی پر پسینے کی نمی ہے۔ میں چاہتی ہوں معظّمہ کو آواز دےں مگر آواز میرے گلے میں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ میں چاہتی ہوں معظّمہ کی آستین پر کوسوں مگر میرا ہاتھ کانپ کے رہ جاتا ہے میں اپنے بے جان جسم کو کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں پُندی کھول دیتی ہوں۔ اور مصری حسینہ کی طرف دیکھنے لگتی ہوں۔ شاید اس کا حسین چہرہ مجھے شانتی دے سکے۔ مگر نہیں۔ مصری حسینہ کے ہتے لبوں میں بھی شانتی نہیں۔ آفریدی کے جذبات سے بھرے چہرے اور سلمیٰ کی شرمیلی ہنسی میں بھی تو شانتی نہیں۔ کبھی تو میری توقع کے خلاف بھی کچھ کرو۔ کبھی کچھ لئے بغیر بھی کچھ دینا سیکو۔ میں ازل سے انتظار میں ہوں۔ عیث انتظار۔

معظّمہ کے چہرے پر سکون ہے اور وہ طمانیت سے چہرہ موڑے گا نا من ہی جسے کیا یہ سکون یہ اطمینان میرے مقدر میں نہیں مگر یہ معظّمہ کا پلک نہیں ہے کیا تم نے کبھی گھر میں اس کے چہرے پر سکون یہ شانتی دیکھی ہے؟ — بی بی میری جان

ہم سب تنہا ہیں۔ ازل سے تنہا، تنہائی ہمارا مقصد بن چکی ہے۔ کوئی اس تنہائی کو توڑنے کی خاطر کسی کی دوسرا ہمت قبول کر لیتا ہے۔ (کیا سہلی یا فریدی سے شادی کرے گی؟) مگر یہ دوسرا ہمت اس کے اندر کی تنہائی کو توڑ نہیں کر سکتی۔ میں آگے جھٹک کر میری بہ کسبیاں ٹپکا کر آفریدی کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوں ہال کی دو درحیا روشنی میں اس کا سرخ و سفید چہرہ چمک رہا ہے گھٹی موٹھچوں کے تلے موٹے موٹے ہونٹ سامنے بیٹھی لڑکی کے دل میں یقین و اعتماد کے جذبے جگمگا رہے ہیں۔ کیا اس سامنے بیٹھی لڑکی کو یقین ہے کہ یہ شخص اور صرف یہی شخص اسے خوشیاں دے سکتا ہے۔ ہنوشی! میری چاہتا ہے زور سے قہقہہ لگاؤں خوشی۔ یہ لفظ کس نے نہیں سنا؟ کوئی کہہ دیا، کس نے؟ کوئی مجھے بتاؤ کہ میں اس سے اس لفظ کا مضمون مانگوں۔ سہلی بی بی کیا ختم آفریدی کی دوسرا ہمت اپنا کر خوش پالکی۔ تم نے دیکھا ہم تبرنیا کام کرنے سے بہتر کس درجہ پُر اعتماد ہوتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ہم ضرور خوشی پالیں گے۔ مگر خوشی کس نہیں۔ ساری عمر اس کی تلاش میں گزر جاتی ہے اور خوشی پھر بھی دوسرے کنارے پر کھڑی ٹسکرا کر ہاتھ پھیرتی ہے۔ میں اب اس کے پیچھے ہرگز نہیں بھاگوں گی۔ میں اب قہقہہ چمکی ہوں۔

مصری حسینہ گانا ختم کر کے ہانچکی ہے، قاسم ابھی تک اینٹج کی طرف رخ کئے بیٹھا ہے۔ مجھے پروگرام سے فائدہ بھر بھی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی۔ میں پھر اٹھ کھین بند کر لیتی ہوں۔ اور بند آنکھوں میں اپنے وجود کو بیٹے گاتے ہال میں اندر وگی سے بیٹھا دیکھتی ہوں۔ میں ہوں کہ پاس کو ہاتھ لگاؤں، کوئلہ بنے۔ خوشی کے قریب سے گزروں وہ دھاروں روئے۔ ہوا مجھے دیکھو کا پنا رخ پھیرے۔ باول اپنا سایہ چھوڑ دے۔

ٹوکیا جب اگر لوگ تنہائی میں اکیلے ہیں میں کہیں: تم ہو۔" مگر جو ہم میں میرے شہادت کو فنی میں بدل دیں۔ آج مجھے ہزاروں بار اس کا تجربہ ہوتا ہے اور میں سچ کہتی ہوں نہ اُداس ہوں نہ دل گرفتہ۔ صرف حلقے سے لے کر دھڑکے تک شدید بد مزگی کا احساس ہے ایک اینٹھن۔ کیا نام دوں اس کو؟؟؟ — اپنے اندر کے سناٹے اور باہر کی تنہائی کو (شکلیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ہے) کا ماتم کرتے برس بیت گئے کوئی چارہ نہیں بخلا میں کوئی کب تک تجھے۔ بس اپنے ہی بال دپر تو چھتے ہیں۔

قاسم اچانک پائپ رکھنے یا لینے کے واسطے میز کی طرف مڑتا ہے۔ اور اس کی نظر دانستہ یا نادانستہ میرے چہرے پر پڑتی ہے۔ میں اپنی نظریں ہٹا لینا چاہتی ہوں مگر اس کی نظریں لٹھ بھر کے لئے میری نظروں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں ان نظروں میں حیرت بھی ہے اور پریشانی بھی — وہ سوالیہ بھی ہیں اور کسی حد تک CONSOLING بھی۔ پھر وہ ہلکے سے مسکرا کر چہرہ ایلیج کی طرف مڑا لیتا ہے۔ میں پھر آنکھیں بند کر کے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیتی ہوں۔ یہ محض تنہائی کا زہر نہیں ہے جو میری رگ رگ میں سرایت کر رہا ہے۔ یہ محض بے مقصدیت تو نہیں۔ عائشہ بی بی۔ یہ تو لا حاصل کاڑکھ ہے۔ یہ تو نازِ مائی کا زہر ہے۔ میں جب غم کو دیکھتی ہوں تو میرے اندر کبھی تو ہے۔ میرے آنسو اندر گرتے ہیں گلے میں قطرہ قطرہ۔ دل پر متواتر گرتی بارش۔ اور وہ کہتا تھا اگر بولنے کو جی نہیں چاہتا تو مت بولو، اگر منہ سے کو جی نہیں چاہتا تو مت منہ سے مت ہونٹوں کو پھیلاد، خود کو بھی کہیں دھوکا نہ دو، جہاں جس وقت تھکدا جی جس بات کے لئے، کام کئے بھی کرتا ہے وہ کرو۔ اگر کچھ نہیں تو چپ چاپ بسز پر لیٹ جاؤ اور آنسوؤں کو خاموشی سے چھتے دو۔ اور سنو۔ اگر تمہیں کوئی میسر ہے تو اس سے

کہو۔ آؤ اپنا ہاتھ ہمارے سپرد کھو، آؤ ہیں پیار کرو۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے میں نکلیں
 کھول کر مار دو گرو دیکھتی ہوں۔ ہر کوئی مصری حسینہ کے گانے میں مجھ ہے۔ گانے میں بھی
 اس کے صرف ہونٹ ہی جذبش نہیں کرتے بلکہ اس کے ابرو یا اس کے ہاتھ حتیٰ کہ
 اس کے جسم کی چمک بھی بسا اوقات اس کے گانے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔
 ایک سناٹا ہے جو سارے ہال پر طاری ہے۔ سوائے مصری حسینہ کی آواز اور پس منظر
 ساز کے — میں پچھرا نکلیں بند کر لیتی ہوں۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے عاشقہ بیگم کو وہ نہیں
 سمجھتا، وہ سمجھنا نہیں چاہتا، اتم شکست خوردہ، تب مر جاؤ مگر خود پر ترس مت کھاؤ۔
 اور وہ جو یہ سب باتیں مجھے سکھاتا تھا مجھے سمجھ نہ سکا۔ مگر کیا یہ سچی ہے؟ کیا حقیقت
 یہ نہیں کہ وہ مجھے سمجھنا نہ چاہتا تھا — سائن بی بی، نہیں اچانک آنکھیں کھول کر بال کے
 وسط میں اُسے تلاش کرتی ہوں، تمہیں آفریدی کی بانوں میں سمانے کے لئے اس
 کی پہلی بیوی کی قبر سے گزرتا ہو گا، کیا تم ایسا کر سکتی؟ کیا ایک لمحے، ایک لمحے کے
 ہزارویں حصے میں بھی تمہیں یہ خیال نہ آئے گا کہ وہ عورت جس کے سینے پہ پاؤں رکھ
 کر تم اس کے خاندان اور اپنے محبوب کے پاس جاؤ گی وہ بھی تمہاری طرح گوشت
 پرست کی ہے۔ اس کی نسوں میں بھی تمہاری مانند گرم گرم شرف خون دھتا ہے۔
 اس کے سینے میں بھی زندگی کی آن گنت مسرتیں خیمہ زن ہیں — نہیں تم ایسا
 نہیں سوچو گی۔ تم ہمارے جو، تم کو صرف اپنی خوشیوں کے حصول کی چاہ ہے۔ اپنا وجود
 ختم کو عزیز تو ہے۔ اور نہیں — میں چپکے سے ہنستی ہوں۔ بے آواز ہنسی — بے بسی
 کی ہنسی — مغلطہ اگر جان لے کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ مغلطہ اگر میرے پاس بھی
 نیرے جیسا ایک پبلک فیس ہوتا، میں اس کے شگفتہ چہرے کو دیکھ کر رنج سے

سوچتی ہوں اور دفعتاً چونک اٹھتی ہوں۔ ناصر میری کرسی پر جھپک کر کچھ کہہ رہے ہیں جی۔ میں گھبرا کر ان کی طرف دیکھتی ہوں، بی بی: تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ان کے لہجے میں اپنائیت ہے میں شکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلا دیتی ہوں۔ میں مزے میں ہوں آپ فکر مت کیجئے۔ میں اپنی آواز حتی الامکان خوشگوار بنا کر کہتی ہوں اور نظریں ایلیج پر گاڑ دیتی ہوں۔

میں نے آنکھیں ایلیج پر گاڑ رکھی ہیں مگر مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا سا ماسا حول دھندلا رہا ہے میں گوش برآواز ہوں مگر میرے کانوں میں کوئی آواز نہیں آ رہی میرے اندر باہر سناٹے کی حکمرانی ہے۔ آفریدی اور سلمیٰ کے چہرے بھی اسی دھند میں گم ہو چکے ہیں۔ میں اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کی خاطر آنکھیں موند لیتی ہوں اور وہ کوچہ اپنی تمام تر روضینیوں سمیت میری آنکھوں میں اتر آتا ہے۔ میں اس سے بھاگ کر کہاں چتا، پائوں گی؟ مغلہ بہنا تو مجھے یہاں لے کر آئی ہے کہ میں اس رنگ بھرے ساحل میں اپنی تلخ اور ناکام زندگی خوشگوار بنا سکوں۔ اپنے زخم ٹھلا سکوں۔ ناصر کہتے ہیں وقت ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ وقت۔ میں اپنے جسم میں تناؤ سا محسوس کرتی ہوں مگر۔ بھائی میرے یہ وقت ہے کیا۔ کیا ہے وقت؟؟؟ وقت اندھے کی لاش ہے جس سے وہ راستہ پاتا ہے۔ راستہ پاتا بھی ہے راستہ کھوتا بھی ہے مگر وقت ٹھنڈا اندر ہے یا تم وقت کے اندر ہو؟۔ وقت ایک جال ہے اور تم صید ہو۔ کون جال ہو اور وقت صید؟ وقت تمہارا غلام ہے یا تم وقت کے غلام ہو؟۔ مگر تم کون ہو اور وقت کیا ہے؟ اور وقت کیا ہے اور تم کون ہو؟ اور تم مر جاؤ گے اور وقت یونہی رواں دواں رواں رہے گا۔ پھر تم میں کون فاتح ہے اور کون مغتوح؟ اور کون

حاکم ہے اور کون محکوم؟ اور جو مر جائے گا وہ مفتوح ہو اور جو زندہ رہے وہ خلع۔ پس وقت قارج ہے!! امیراچی چاہتا ہے میں ناصر کاندھا کی طرح کراں سے کہوں میں نے وقت کو پایا۔ میں نے وقت کو پایا۔ خود اپنی بے آواز سوچ میرے کانوں میں گرجی کی پیدا کرتی ہے وہ خوبصورت کشادہ گھر وہ بھاگتے کھیتے بچے۔ وہ دن وہ لوگ۔

— کہاں گئے ۹۹۰؟

(وہ پریشانی سے کمرہ گھر گھومتی ہے سارے میں ایک چپ ہے ایک سناٹا۔
 ویرانی یہ بھرا پڑا آگن اب کیسا سنسان ہو رہا ہے کمرے کیسے خاموش کوئی دھڑک
 نہیں کھٹکا کسی کمرے سے کوئی آواز نہیں ابھرتی۔ یہ گھر ہے یہ گھر ہے پاکستان۔
 وہ ماں کے کانوں کے پاس جا کر ڈھاڑتی ہے۔ بڑھی عورت سفید پلو سے مٹھائی
 تخت پر بیٹھی ہے، سپاٹ بے رنگ آنکھیں لئے۔ آوازانی میرے پاس بیٹھو، بھڑک
 سے بھاری آواز رانی۔ ہنہ۔ وہ طنز سے ہنستی ہے اور ہنسے چلی جاتی ہے۔ پھر
 نڈھال ہو کر تخت پر گر جاتی ہے۔ ایک دم وہی سکوت وہی خاموشی وہی سناٹا۔
 آنکھیں بند کئے کیا سکون ملتا ہے، سکون۔ ہنہ سکون کیا ہے، آنکھیں کھول کر وہ
 بڑھی عورت کو دیکھتی ہے۔ ماں کیا ہے میرے سینے میں معدوم جہاں خفقہ وقت سے
 بھی خاموشی قبر نہیں ٹوٹتی۔ اور آگے بڑھ کر ماں کی گود میں سر رکھ کر بچکیوں میں نہنے
 لگتی ہے۔)

منظفہ مجھے پھر کہہ رہی ہے میں نے آنکھیں کھول دی ہیں میری آنکھوں میں
 میرے کوچے کی گرد اڑ رہی ہے منظفہ اسے دیکھ لے گی۔ میں نے جلدی سے دروازہ
 نکال کر اپنی آنکھیں صاف کی ہیں۔ منظفہ باہمی آپ کے کلب کی روخیاں میری

انکسوں کو خیرہ کئے دے رہی ہیں۔ میں اپنی آواز میں بشارت پیدا کرتے ہوئے کہتی ہوں۔ وہ ہاتھ بڑھا کر میرا شانہ تھپتھپاتی ہے۔ ہولے ہولے ختم ان روشنیوں کی عادی ہو جاؤ گی بانو۔ اس کے لمحے میں مانتا ہے میرا گلہ رند جاتا ہے (کیا ہے میرے سینے میں معدوم۔ کیا ہے) میں اقرار میں سرطانی ہوں۔ مظہر پھر اسٹیج کی طرف چہرہ مڑ لیتی ہے عربی حسینہ DAGGER DANCE پیش کر رہی ہے اس کے دونوں ہاتھوں میں چمکتے ہوئے خنجر ہیں اس کی حرکات میں بلا کی پھرتی ہے اور وہ اس تیزی سے اپنے ہاتھوں کو داتیں بائیں اوپر نیچے گھماتی ہے کہ خنجر نظر تک نہیں آتا اور صرف بجلی سی کوئٹھی نظر آتی ہے۔ میری توجہ لمحاتی طور پر حسینہ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ تمام انگلیوں سے میری جانب دیکھتا ہے۔ میرے چہرے پر دلچسپی پا کر خود بھی خوش ہوا اٹھتا ہے لیکن آفریدی کا سراپا یک بار پھر میری توجہ اُچک لیتا ہے آفریدی اُسے یہاں لے کر کیوں آیا ہے؟ کل رات ڈنر پر خواجہ دے دے کہہ رہا تھا کہ آفریدی پہلی بیوی کو طلاق دے کر سہیلی سے شادی کرے گا اور دونوں مل کر ہسپتال کھولیں گے میری خواہش ہے میں ان کے قریب بیٹھ دوں اور ان کی باتیں سنوں۔ آخر آفریدی سہیلی سے کیا کہہ سکتا ہے؟ سہیلی نے کیونکر اس کی باتوں کا یقین کر لیا ہر گز سہیلی لی بی تو کس قدر معمولی ہے انگلیں میچے اس شخص پر اعتبار کر رہی ہے جس نے تیری خاطر پانچ سالہ رفاقت کو ختم کر دیا۔ کیا وہ تیری رفاقت سے کسی بھی وقت ایسے ہی مزہ نہیں موڑ سکتا؟ میں چاہتی ہوں سہیلی کو یہ سب باتیں بتاؤں، اسے اس فعل سے باز رکھوں وہ ابھی معصوم ہے اسے بھگت نے عیاری سے اسے اپنے جینگل میں پھانس لیا ہے۔ مگر ابھی وقت ہے وہ اس جال کو توڑ سکتی ہے۔ اگر میں اس کی مدد کروں۔

قاسم اسپانک پائپ رکھنے کے بہانے میز پر ٹھیک کر میری طرف دیکھتا ہے، اگر میں غلطی پر نہیں، یہ پروگرام آپ کی معمولی سی توجہ بھی نہیں کھینچ سکا۔ میں مختصر مٹانے کو ہلکے سے مسکراتی ہوں یہ حقیقت ہے قاسم میاں، غم کچھ کچھ سمجھ دار قسم کے آدمی ہو مگر میں اسے اپنی رائے سے باخبر نہیں کرتی، بس ہلکے سے مسکرا کر بات ختم کر دیتی ہوں۔ اسٹیج پر پردہ چڑا ہے، رقصہ جاچکی ہے، خدا کی بار کی طرف سے نکل کر پروگرام کے ختم ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ کرسیوں کا شور، باتوں مقصود کا غل، امریکی سرواپنے پائپا سنبھالے بار میں گھس جاتے ہیں۔ عورتیں، پروگرام پر اپنی باریک آوازوں میں تجرہ کرتی، باہر نکل جاتی ہیں۔ آخری اور سہمی، بھی اسی بھیڑ میں گم ہو چکے ہیں، سٹک لے گھر چلنے کو کہتی ہے گھر۔ میز گھر کو نسا ہے ۹۹۹

(اور وہ بالکنی میں کھڑی، اکیلی، تنہا اور اداس، اپنے غیر محفوظ ہونے کا احساس میرے سینے میں وہی ایک عزم، ایک خطہ۔ اے گراں بار سکوت۔ ٹوٹ جا، بالکنی سے نیچے جھانکتے ہوئے، اس نے سوچا، نیچے کوڑ جاؤں۔ تب کیا ہو گا، اگر میں یہاں سے کوڑ کر نیچے جا کر دوں اور سرخ سرخ بھری پریٹ کوڑ جاؤں تب کیا ہو گا؟ اس کے بعد میں کہاں جاؤں گی؟ کیا پھر یہی تنہائی یہی اداسی، یہی اکیلا پن۔ اور جو اس بالکنی سے نیچے کوڑ جاؤں تو نیچے بچے وہی خدا ٹے گا جو میری ماں کا خدا ہے۔ نہیں نہیں بچے تیری ضرورت نہیں۔ میں زندہ رہوں گی۔ میں زندہ رہوں گی)

معتزلہ نے میز پر اتنے تمام لیا ہے، تا صوبہ ہی طرف، باغیچہ پشت پر باندھے سر جو گائے پل رہے ہیں۔ میری سرچیں آپس میں گٹھ جوڑ رہی ہیں، میں پروگرام کے بارے میں سوچنا چاہتی ہوں کہ اس کی تعریف، مصر کے رو برداروں اور دشمنوں کے ادا کردوں کے آج

کی شام بڑی دلچسپ گزری مگر مجھے آفریدی کا جذبات سے شریخ چہرہ اور سلی کی جھینپی جھینپی سی ہنسی یاد آجاتی ہے۔ اور جب میں آفریدی کے بارے میں کچھ کہنے کو بٹھولتی ہوں تو قاسم کے بوٹوں کی چاپ ہتھوڑے بن کر میرے ذہن میں گونجنے لگتی ہے۔ قاسم ہم سب سے چار قدم پیچھے اکیلا چلا آ رہا ہے۔ اچانک میں اتھنائی بھونڈے پن سے مغفلہ سے کہتی ہوں: ”مغفلہ باجی۔ قاسم کی بیوی کب آئے گی؟“ نامہ کا ٹھکڑا سر اودھ بھی جھٹک جاتا ہے قاسم کے بوٹوں کی چاپ کہیں ڈور گرم ہونے لگتی ہے اور مغفلہ سرگوشی کے لہجے میں کہتی ہے: ”ان کی تو SEPERATION ہو چکی ہے باؤ۔ پھرتو دے“ اُمّی آواز میں مجھے بتاتی ہے کہ وہ بے انتہا بد مزاج اور پھوٹ کر قسم کی عورت تھی میرا جی چاہتا ہے فقہہ لگاؤں۔ ایسا فقہہ جو ساری کائنات کو اپنے گھیر دیں لے لے جے ہر کوئی سر اٹھا کر ٹھنسنے۔ یہ سارے دھوکے ہیں مغفلہ کسی کو کسی کی ضرورت نہیں۔ کوئی دوسرا مت ابدی نہیں۔ سارے رشتے ٹوٹ جانے والے ہیں کسی کو ثبات نہیں۔

— کسی کو ثبات نہیں —

آیا نے بچوں کو سٹلا دیا ہے۔ ہم چاروں خاموشی کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ نامہ کبھی کبھار ایک آدھ بات بھیڑ دیتے ہیں۔ قاسم ہمارے میری طرف دیکھتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے ہمیں سب کے درمیان اس سے پوچھوں۔ تم بویوں نظروں نظروں میں مجھے اُن گنت پیغام دے رہے ہو۔ کیا تمہارا خیال ہے میں تمہاری بد مزاجی جھگڑاؤں قسم کی جوی سے بہتر ثابت ہوں گی۔ تم غلطی پر ہو قاسم۔ یہاں کوئی کسی سے بہتر نہیں۔ اور پھر نہیں تو رشتوں ناطوں پر ایمان بھی نہیں رکھتی۔ نہ مجھے کسی کی دوسرا بہت کی ضرورت ہے۔ تنہائی میرا مقصود بن چکی ہے۔ مگر میں اس سے کچھ نہیں

کتنی میں اس کی نظروں کی زبان سمجھنے سے انکار کر دیتی ہوں اور مجھ کا کرکھانا کساتی ہوں۔
مجھے کھانے سے بھی نفرت ہے مجھے ہر اس شے سے نفرت ہے جو مجھے زندہ رہنے پر
اکساتی ہے لیکن میں مرنا بھی نہیں چاہتی۔ کیونکہ مرنے کے بعد مجھے وہی خدائے کوس
نے زندگی بھر مجھے کچھ نہیں دیا۔ اور وہ مرنے کے بعد مجھے کیا دے گا ؟

میں پرانی پڑھی ہوئی ایک نظم کو دل میں دہرانے لگتی ہوں :

زیست اور موت کا چکر ! جینا

موت اور آگ کی خوراک میں ڈھلنا۔۔۔ مرنا

اور پھر زیست کی تکلیف اٹھانا۔۔۔ خود کو

اس سوالات کی غور و فکر بنانا۔۔۔ کیا ہے ؟

تاسم نے کافی کی پیالی میز پر رکھ کر مجھے ہلکی ہلکی سیر کے لئے کہا۔ یقیناً تھوڑی
سی سیر کے آپ کو قطعاً نقصان نہیں پہنچے گا۔ مگر میں اس کے ساتھ باہر نہیں جانا چاہتا
میں اس کا پیغام نہیں سمجھتا چاہتی۔ مجھے تمہاری قطعی ضرورت نہیں تاسم۔ وہ میرے انکار
پر دل برداشتہ ہو جاتا ہے اور کافی کی ایک اور پیالی باؤ جوڑو مسئلہ کی مخالفت کے پانی کر جانے
کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ پچھلے زمیں میں رہتا ہے اور رات کا کھانا اکرہ مسئلہ
کے ہاں کھاتا ہے۔ ناصر اور مسئلہ مجھے میرے چھوٹے سے بیڈ روم میں چھوڑ کر اچھی سی
یشمی نیند لینے کی ہدایت کر کے اپنی خواب گاہ میں چلے جاتے ہیں۔ سیاہی بھلتی ہے
تو شام ٹپتی ہے اور روشنی بھلتی ہے تو دن۔ اور دن گزرتے ہیں تو سال گزرتے ہیں
تو۔۔۔ مجھے موت کیوں نہیں آتی۔ مگر میں مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے زندہ رہنا ہے اور مجھے
زندگی سے نفرت ہے۔

”ماں‘ رات کیوں ہوتی ہے؟“ بڑھی عورت چہرہ لحاف سے نکال کر اسے دیکھتی ہے
 ”سو جاؤ بیٹی“ وہ آنکھیں چھپت پر گھاڑے لیٹی ہے۔ ”ماں اگر ہم دن کو سو جائیں اللہ ماں
 کو کام کریں تو پھر رات کو دن اور دن کو رات کہیں گے نا“ بڑھی عورت عاجزی سے
 کروٹ بدل کر اسے دیکھتی ہے۔ ”بیٹی‘ سورۃ الرحمن پڑھ کر اپنے سینے پر بھونک مارو اور
 سو جاؤ۔“ تب وہ یکدم لحاف پر سے پھینک کر اٹھ بیٹھتی ہے اور چلا کر کہتی ہے ”ماں
 اپنے خدا کا نام میرے سامنے مت لیا کرو۔ مت لیا کرو۔“ چلاتے چلاتے اسے کھانسی
 آجاتی ہے اور وہ بے ذم سہی ہو کر بستر پر گر جاتی ہے۔ خاموش ’ویران گھر‘ سناٹا بند کمرے
 بند دروازے۔ کسی کمرے سے کوئی آواز نہیں ابھرتی، اسکت و جامد چیزیں۔ کوئی بولے
 کوئی کروٹ بدلے، کوئی سسکی، کوئی آہ، کراہ!!! پھر کوئی ہوتا یہ ہو۔“

سب کچھ ٹھہر گیا ہے۔ سب کچھ سو گیا ہے۔ میں شاید مرد ہی ہوں!
 ”سیپ“ کراچی

رشتہ

گوالی بین کے ایک طرف آگے کوچل کر جہاں بائیں ہاتھ کو ٹرتا ہوا راستہ نکلتا ہے
 بنایا کرتا تھا، وہاں اور دیکھا ہوا لوگوں کی پھٹی پڑائی جوتیوں میں تکیاں، ایڑیاں اور اسٹینج
 کے چپلوں کے ٹوٹے ہوئے تسموں کو لڑکیوں کی طرح کے نازک اور نرم گورے گورے
 ہاتھوں سے ٹانگے لگایا کرتا۔ یاد دو آئے، چار چلے آنے میں بحری اور گرد کے کھائے
 ہوئے جوتوں کے چمڑے کی چلہ کو از سر نو لال یا کالا کرتا رہتا، گویا لوگوں کے پچھے پرانے
 جوتوں میں ٹانگے نہ لگا رہا ہو، خستہ جوتوں کی چلہ کو لال کالی پالش سے چمکانہ رہا ہو
 بلکہ اپنی اُدھڑی ہوئی زندگی میں ٹانگے لگا رہا ہو اور اس کی کمر بہ اور مسخ شدہ جلد
 کو بنا سنوار رہا ہو۔

دو پہر ہوتے ہوتے جب وہ جوتوں میں ٹانگے لگاتے دکاتے غٹک جاتا اور
 سوچ سامنے کی تین منزلہ بلڈنگ کو کھپلا نگ کر اس کے سامنے پڑے ہوئے پیٹے
 پرانے موکے ہوئے چمڑے کے جوتوں کے ڈھیر بھیل جاتا اور دوپتے نئے ہاتھوں

کے سہارے اٹھا کر کھڑی ہوئی کپڑے کی چادر سورج کی تپش میں مزاحم نہ رہتی تو وہ روٹی دکھانے یا پانی کا ٹھنڈا گلاس پینے، ساری گلی کو عبور کر کے آخری کونے کے بھٹیاریخانے میں چلا جاتا جہاں کالک چربی میں پکائے ہوئے سالن کو حلق میں جما دینے کی غرض سے برف کے پانی کے پہلوانی گلاس مفت ٹا یا کرتا تھا۔ پلٹے ہوئے وہ راستے میں بڑتی دکانوں سے کسی کا ہوتا پالش کرنے، ایڑی لگانے یا اٹھوڑا ہوتی جگہ ٹانگے لگانے کے لئے لیتا آتا۔

گلی کے بچوں بیچ محمد حنیف پنراڑی کی دکان بڑتی تھی۔ محمد حنیف پنراڑی نے زندگی میں کبھی سیر نہیں گھرے گھر سے نشان ڈالنے والی نری کی لال لال مچوٹی کے علاوہ کوئی چیز نہ پتی تھی۔ اور اس کا جوتا گھسنے کا نام نہ لیا کرتا کیونکہ جوتا تو جب گھستا ہے جب آدمی کی ٹانگیں چلتے چلتے ٹھک جاتی ہیں اور اگر ٹانگیں نہ ٹھکیں تو جوتا بھی نہیں ٹھکنا۔ اور محمد حنیف تھا کہ صبح کو جوتا گردکان کی گڈی پرالتی پالتی مارے میٹھتا تھا تو رات گئے ہی اٹھتا۔ لہذا جوتی سدا کی بہار دکھائی دیتی گویا ابھی ابھی دکان سے اٹھا کر لائی گئی ہو۔ ہفتہ کے ہفتہ اس کی جوتی باجوہ بڑے چاؤ کے ساتھ محمد حنیف کی دکان بند کر کے رات کو گھر آنے پر گھائی کے خالص سرسوں کے تیل سے اجاس کا چھٹا جوتی برانے جانے والے کے ہاتھ گاؤں بھیجتا رہتا تھا۔ گودڑ جھگو جھگو کر جوتی کو چمکاتی رہتی تھی۔ مگر ہوا یہ کہ محمد حنیف کا بڑا سالہ ایک دفعہ اپنی بہن سے ملنے آیا تو سہوٹی کے لئے چمک دیک دکھاتی ایک گرگابی لیتا آیا۔ جب گوجرہ کی بہن ہوئی تبسہ کوٹا کوں کے گرد پیٹے اور پاؤں میں چرم چرم کرتی گرگابی کو پہن کر محمد حنیف دکان جائے کو نکلا تو زندگی میں پہلی بار اسے یوں محسوس ہوا گویا پیر کے نیچے کوئی دیبر قالین بچھا ہوا ہے اور

چاروں طرف سے اس کے پیروں کو نرم و نازک گرفت میں لے رہا ہے۔

گارے مٹی سے بچاتا اس گرگابی کو حنیف، کان کے پٹریے پر سپر رکھتے ہی تھامتیا اور اسے بڑی احتیاط سے جیسے ڈبیر ساری تعداد میں چاندی کے قندق لگے پائوں کا پیکٹ تیار کر رہا ہوا تھا کراپنے بیٹھنے کی گڈی کے قریب ہی رکھ دیتا۔

جب گرگابی کی کالی جلد روز بروز کے استعمال سے اپنی چمک و بک کھونے لگی تو اسے پالش کی ایک ڈبہ اور برش خریدنے کا خیال آیا مگر وہ خود تو پالش کرنے سے رہا! پالش کون کرے گا؟ اسے باجرہ کا خیال آیا جو ابھی تک نرمی کی پرانی ہوتی گوہر روز اگرچہ وہ پھنا تو نہیں کرتا تھا لیکن صاف ضرور کیا کرتی تھی مگر باجرہ....

باجرہ انگریزی جوتے کے ساتھ برتاؤ کرنا کیا جانے۔ وہ تو گاؤں کی رہنے والی سیگا سادھی، صبح اٹھ کر پانچ سیر گندم چکی میں پیسنے اور باجڑے کی موٹی موٹی روٹیاں پکھنے والی عورت، ایک دوسرے میں آٹے سیدھے کر کے اڑا کر رکھیں ہوتی گرگابی کی طرف دیکھتے اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے سانچے پانچ پرکھنے کی تہہ جھانے ہوئے اس نے سوچا۔ اس سالی کو کیا تسبیح (تمین) باپ دادا اسد انری کی جوتی پہنتے اور سرسوں کے تیل میں ڈبوئے آتے؟ دل میں ایسا سوچتے ہوئے اس نے نرمی کی جوتی پہننے کے الزام کو باجرہ کے باپ دادا پر لگاتے ہوئے خود کو صاف صاف بچالیا۔ جیسے رہ ہمیشہ سے یہی گرگابی پھنسا چلا آ رہا ہو۔

استاد دلز کا ایک پیکٹ دینا۔ ساتھ موہنی تہا کو دالا ڈبل کتے چونے کا پانچ۔ ایک مہاری اور کرخت آواز نے اسے جوتوں کے چکر سے نکال دیا۔ اور پھر گاہکوں کے آنے جانے میں طرح طرح کے پانچ لگاتے، سگریٹوں کے پیکٹ دیتے،

وہ اپنے جوتے کو بھولے رہا۔

سہ پہر کا وقت تھا جب اوٹھکے اور ٹھکے ہوئے چھڑ کر اس کی نگاہوں کے سامنے کھک گیا۔ وہ جلدی سے اپنی گتھی سے اتنا اوزیر آبادی لگے کوتاہ لگایا۔ جوتوں کو آہستہ آہستہ جیسے کاپڑ کے ہوں مرکز پر جا کر رکھا اور پہن کر سوچی کی دکان پر چلا گیا۔

انور سر جھکائے، ہاتھ میں مٹی پکڑے ایک بوت میں اٹھری لگا رہا تھا کہ محمد حنیف ایسی نگہ آتی ہوئی چال سے کہ جب آدمی دیر تک اتنی پانتی مار کر بیٹھنے کے بعد چلتا ہے، اس تک پہنچا۔

اسٹینج کی ایک خلی اور ایک لال چل کو پاؤں میں ڈال کر اس نے جب اپنی نگاہ کو داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے پکڑ کر اس کے پاس رکھا تو محمد حنیف کی نظریں انور کی میٹھی کی پھٹی ہوئی شلوار کے اندر سے چمک دھمک دھمکاتی سنہرے سنہرے ریشے سے بُندان پر جا پڑیں۔ گلاب کی موجودگی سے باخبر ہو کر جب وہ اپنے خوب صورت چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ لایا تو اس کے پتلے پتلے اور لال لال ہڈیوں کے درمیان موتی کی طرح چمکتے ہوئے سفید دانت ایک لمبے کو یوں لگے جیسے گلابی میٹھی پرکھن کی سفید سفید تہ جی ہوئی ہو۔ اور پھر خدا جانے یہ ڈھلتی دو سپر انور کے چمکتے ہوئے جسم کی چاندنی تھی یا محمد حنیف کی اونگھتی آنکھوں کا تصور کہ اس کے منہ میں پانی بھرا آیا اور اس پانی کو جلدی جلدی ثروت کے شیریں گھونٹ کی طرح حلق سے نیچے آتے ہوئے اس نے کہا۔ ارے جوتہ پر ایک لمبر پاس کر دے مجھے دے جائیو، مجھے آن؟

پھر ایک مسکراہٹ اس نے انور پر ڈالی۔ دوبارہ وہی مسکراہٹ جواب میں چمکی، اور اس نے ماتھے پر پڑی ہوئی جھوٹے بالوں کی لٹ کو جھٹکا دیتے ہوئے نمبروں پالش

کایتین دلایا۔ اس ڈھلتی دو پہر میں محمد حنیف جب واپس آ کر اپنی گدی پر بیٹھا تو اُسے یوں لگا جیسے وہ بہت تیز دھوپ میں چل کر آ رہا ہو اور اسے زور کی پیاس لگ رہی ہو۔

اور ایک صبح جب اس گلی کا یہ چھوٹا سا بازار کھلا تو عبدالرسول بساطیہ، بمشاید خانے کا مالک، آگاہ گندھنے والے فقیرے اور لمبے لمبے بازوؤں کو اکڑا کر چھنے والے چھوٹے اور اسٹیشنری بیچنے والے کے سامنے، سوچی اند کو محمد حنیف کی دکان میں اس کی گدی کے مقابل ایک نئی بنی ہوئی گدی پر بیٹھا ہوا دیکھ کر جیسے ہم کارگر چٹ گیا اور گردن اکڑا کر گھٹکریا لے بال بنا کر اسی تسلی کے کھٹے ہوئے گریبان میں لگے کار کو گردن کے پیچھے ڈھکا کر چھنے والے چھوٹے کا زبانتہ کی سپاٹ سٹح سے آگے کو جا کر گول گول طاقتور کلائی کے چوچوں بیچ رہی کے لگے ہوئے منڈل زخم میں جیسے پھرے کھدبہ ہونے لگی۔ اند کی رہی سے لگے ہوئے زخم کے نشان والے ہاتھ کو کڑنے کی جیب میں ڈال کر بگے کی سکرٹ نکالتے ہوئے اس نے بمشاید خانے کے آگاہ گندھنے والے فقیرے سے جس کے بدن کا میل پسینہ ہو چو کر آٹے میں شامل ہوتا جا رہا تھا کہا۔

”اُسے فقیرے محمد حنیف سالہ کوئی بہت ہی جوان ہے جو یہ.....“

فقیرے نے چھوٹن کی بات کو درمیان ہی سے کاٹتے اور ماتھے پر اُسے ہوئے پسینے کو اٹے ہاتھ کی دو انگلیوں سے بچا بچھ کر اٹے میں چھٹکے ہوئے ہنس کر جواب دیا۔

”اُستاد اس میں کوئی بات نا ہے۔ تیرے سے جیادہ درزیدہ، جوان تو میں نے اپنی جندگی (زندگی) میں نا دیکھا پر.....“ اور وہ پھرتلوں کو یوں ٹھہرا ٹھہرا کر ادا کرتے ہوئے گویا وہ چھوٹن کے دل پر لگے زخم کی پٹی آٹا رہا ہو بولا۔ ”پسند اپنی اپنی سکرٹ

ساکش کھینچ کر دھواں چھوڑتے ہوئے اپنے بدن کے کڑیل پن پر نظر پھسلاتے ہوئے اس نے غرور سے گردن اٹھا کر کہا۔ ”پر میں بھی اپنی ماں کا نا ہوں جو.....“ اور یہ کہہ کر گھیر وار شہوار کے پھیر درست کرتا وہ صنفِ خنواڑی کی دکان کی طرف ہولیا۔ سامنے انور بوسی کی کریم کمر تیشی اور سفید شہوار بیٹے، ہونٹوں پر پان کا لاکھا جمائے انارڑی کی طرح چوٹے اور کھٹے کی گٹھیوں میں لکڑی کا گول گول چھپ چلا رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اس نے پتے لوگوں کی طرح خنواڑی کی نظریں جھکالیں۔ شاید ابھی تک اس کی نظروں میں وہ بے حیائی نہیں آ پائی تھی۔ چھوٹن زور سے پنجابی کے بول۔

تیرا پچھا نہیں اودھ چھٹنا اے

بادریں پہ جہان ہنٹکڑیاں

(تیرا پچھا نہیں چھوڑنا۔ بچا ہے ہنٹکڑیاں پڑ جائیں)

اپنے انور بوسی میں گوتا ہوا دکان کے سامنے سے گزر گیا۔ پنجابی وہ اکثر انوری بے میں بولا کرتا انوریوں اپنے ساتھ لائے ہوئے کچھ کو اس زمین کے کچھ سے ملانے کی کوشش کیا کرتا۔

خنکڑیوں کا چھٹنا چھوٹن کی آواز میں کریم صنف کے کانوں تک پہنچ گیا۔ کیمپشن کے بیکٹ کو کھولتے ہوئے اس کی انگلیاں جہاں تھیں وہیں رہ گئیں۔ ایک تھرا کوڈ نظر کے ساتھ اس نے چھوٹن کی طرف دیکھا جو آگے نکل چکا تھا۔ اندر جس کی چوڑی چکی پیٹھ نظر آرہی تھی۔ پھر وہی تھرا کوڈ نظر پیار میں بندلی اور وہ اپنے سامنے بیٹھ ہوئے انور کو دیکھنے لگا۔ انور نے جس کی گوری گوری انگلیاں چوٹے کھٹے میں رنگ دار ہو گئی تھیں، نظریں جھکالیں، گویا کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ پہلے یہ ہاتھ پالش کی

سیاہی میں کالے ہوا کرتے تھے ادا بگتھے چرنے میں لال۔

گلی کی ساری دکانوں میں انور اور محمد حنیف کی نئی دوستی کے بارے میں طرح طرح کی خبریں فضا میں چھوڑے جانے والے گیس کے غباروں کی طرح چھوڑی جاتی تھیں۔ اب انور کے پاس دو گھوڑا بوسکی کی قمیص اور پتلے میں مکڑ گھر مگرتے ہوتے سفید لٹھے کی شلوار کے علاوہ کلائی میں کبھی گھڑی بھی چکنے لگی تھی۔ اور دائیں ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی میں لال رنگ لگی سونے کی انگوٹھی بھی اپنی مہار دھلاتی رہتی۔

چھوٹن ایک دن ڈبل پتی کا پان اور ولز کی ایک سگریٹ لینے آیا۔ پیسے دیتے وقت اس نے دس کے کراسے نوٹ کو انور کی تہہ کی ہوئی ران پر دکھا اور دوسرے ہاتھ سے پان سنبھالا تو محمد حنیف کی مونچھوں کے بال غصے کے مارے تھرکنے لگے اور اس کی پان مچی ہوئی باجھوں میں غصے کے مارے سفید سفید جھاگ نکل کر لال رنگ میں تبدیل ہونے لگی زندگی آواز میں اُس نے کہا۔

”دیکھ بے چھوٹن اب کی تو تو نے بدلتی (بدلتی) کر لی پر آگے کو کان رکھو۔ اپنی سگریٹ بٹری کو لے جا اور کھیر دار (خیردار) جو آئندہ اس دکان سے سودا کھیرنے (خریدنے) آیا، تیرے نہ آنے سے میری دکان چوٹ نہ ہو جائے گی۔ سمجھا۔ اور چھوٹن نے پیسوں کو گرتے کی جیب میں ڈالتے ہوئے بے حیائی سے کہا۔

”اُستاد نے نئے سکاری (شکاری) جو مل بانٹ کر کھاؤ۔ سمجھے؟“

”چل بے تیرے مل بانٹ کے کھانے والے کی....“ محمد حنیف نے چھوٹن کو ایسی رنگ دار گالی دی کہ پاس سے گزرتا ہوا خیرات مانگنے والا بوڑھا بھکاری تیز تیز قدموں کے ساتھ بغیر سوال کتے ہی آگے کو نکل گیا۔ چھوٹن نے ڈھٹائی سے محمد حنیف

کو دیکھا اور پھر ذریعہ بڑبڑاتا ہوا ہلکار کو گردن کے پیچھے دھلکا تا، اکڑتا چلا گیا۔

نہ جانے اس میں چھوٹن کی بواہو سی کو دخل تھا یا لگی کے کسی دوسرے دکان دار کی رقابت اور حسد کو کہ محمد حنیف کے اس نئے شوق کا پتہ ہاجرہ کو بھی چل گیا۔ پہلے تو ہاجرہ کے کانوں کو یقین نہ آیا مگر جب بتانے والے نے ہراسرا پر سے پردہ سرکا یا اور وہ خود جوری چپے جاکر دکان پر بیٹھے ہوئے انور کو دیکھ آئی تو اس کا بدن سن سے رہ گیا۔

وہ تو محمد حنیف کے راتوں کو باہر رہنے کو کسی کوٹھے سے وابستہ کئے چلی آرہی تھی اور اس بات کو صبر و شکر کر کے یوں تسلیم بھی کر چکی تھی گویا مرد کا اور کوٹھے کا رشتہ انہی بدیہی ابدی ہے جس کی راہ میں کوئی جوی مزام نہیں ہو سکتی مگر..... مگر اس بات کا کوئی

جواز نہیں تھا۔ جب وہ یہ سارا اثر مناک منظر دیکھ کر گھبرائی، لجائی، شرم میں ڈوبی ہوئی گرمی میں نہائی گھر واپس لوٹی اور برقعہ اتار کر چھپکا تو گرمی کے سبب بالوں کی لٹیں ادھیڑ عمر کے چہرے پر چپک رہی تھیں۔ سامنے کا درخت پردہ سے آئینے میں اس نے اپنی صورت دیکھی اور دل ہی دل میں اپنا اور قیب کا موازنہ کرنے لگی۔ اپنا اڑھٹ ہونا اور جلدی تناؤ کٹھناتہوا جسم اُسے میاں کے سامنے بیٹھنے والے لڑکے کے مقابلے

میں بالکل بے معنی سا لگا اور جب اس نے اپنے ڈھلے ہوئے سینے چھو سات بچے جتنے کے بعد جن میں زندہ ایک ہی لڑکی بچی تھی، اپنے پیٹ کی ملائیت کے ختم ہو جانے کے بعد اس پر پڑی ہوئی سفید سفید چمکتیوں اور آڑی تر چھی لکیروں کی طرف دیکھا، اور اپنی راتوں کا جائزہ لیا جو کبھی درخت کے تنے کی طرح سیدھی اوڑھت تھیں مگر اب..... ڈھلے ہوئے بغیر استری والے کپڑے کی طرح شکن دار ہو گئی تھیں تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ساری زندگی اکارت چلی گئی ہو، اور وہ

مقصد پورا نہ ہوا جس کے لئے اسے اتنے سارے لوگوں کے درمیان محمد صنیف ڈھولک ادا باجوں کی تیز تر آوازوں کے درمیان گھنٹری کی طرح اٹھا کر لایا تھا۔ برو کی ہوس کی کوئی حد نہیں ہوتی شاید..... اور پھر اُس نے زندگی کی بہت سی دوسری مکروہ اور ناگوار باتوں کی طرح اس بات کو بھی تسلیم کر لیا کہ اُس کا ایک اور رقیب بھی ہے جو اب اس کے نسبت 'خاوند' سے زیادہ قریب ہے۔

نکلی یوں ہی رہی چھوٹن اب اس گلی کو بھوڑ کر کہیں اندر چلا گیا محمد اوز کی چھاتی اب بوڑی قد لمبا اور چہرے پر سبزہ آگ آیا تھا۔ محمد صنیف نے اب اتنی لمبی دائرہ سی رکھ لی تھی گویا زندگی بھر اسے منڈوانے کا کفارہ ادا کر رہا ہو گئی کی اسی ٹکون والی جگہ پر جہاں کبھی وہ بیٹھ کر جوتیاں اٹھا کرتا تھا۔ اس کا پان بٹری کھینا کیبن، لگ چکا تھا۔ کیبن کے اندر مگر یٹوں کی ڈبیوں کے بیچوں بیچ لگے شیشے کے سین اور پر آیتہ، لکڑی سے تراشہ شیشہ لگے فریم میں اوپر کٹنگی ہوئی تھی۔ اور اس کے نیچے محمد صنیف اور اس کا ایک فوٹو ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے آویزاں تھا۔ ایک رات باہر کے پٹنگ کے برابر والے پٹنگ پر لیٹے ہوئے محمد صنیف نے کہا: میں نے اپنی سیم (ٹیم) کے واسطے چھوکر ڈھونڈ لیا ہے۔ ری۔ اپنی ہی بیسے (پیشے) کا ہے میری دکان سے جرا (ذرا) ہٹ کر اس نے نئی نئی دکان کھول ہے۔ لڑکا سریف (شریف) ہے اور فرما نبردار۔

محمد صنیف کے منہ سے یہ بات سن کر بارہ کے دل میں نہ جانے کون سی دہنی ہوئی، ویسے ویسے سلگتی ہوئی چنگاری نے سزا اٹھایا مگر پھر صبر کا ہتھیار استعمال کرتے ہوئے اُس نے اُسے آگ میں تبدیل ہونے نہیں دیا۔ اور ہاں ناں میں کوئی جواب

دیئے بغیر بنی گزشت چڑھی پڑی چکی کمر کو محمد حنیف کی طرف سے پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

اگلے دن صبح ہوتے ہی محمد حنیف کے دکان پر جانے کے بعد وہ اس ٹیڈ کم کو دیکھنے اور اپنے ٹیڈے کی تردید کرنے لگی۔ لیکن وہاں جا کر اس کا دل دھک سے رو گیا۔ انور بے تردید حقیقت بنا پھرتی سے انگلیاں چلا چلا کر گاہکوں کو گھوڑیاں دے رہا تھا۔ اس کے دل میں کئی جذبوں نے سُراٹھ ایا مگر مدتوں پہلے کی طرح اس نے اس فیصلے کو بھی بے یون و چرا تسلیم کر لیا۔

ہاجرہ کو نے میں بنی ہوئی گیارہ کے قریب پلنگ ڈالے بے سندھ پڑی سو رہی تھی۔ چاند نے اب اتنا سفر طے کر لیا تھا کہ وہ اس کے مکان سے آگے کے دو منزلہ مکان کے پیچھے جا کر بچھلے گھر کے صحن سے اپنی چاندنی سمیٹ کر لے جا چکا تھا۔ ضمیم کے کمرے سے ایک لمبا تڑنگ سیاہی دے پاؤں نکلا۔ باہر آ کر اس نے سانس روک کر ایک نظر پڑھی ہاجرہ کی طرف دیکھا اور پھر دے قدموں سے چلتا ہوا برابر کے کمرے میں چلا گیا۔

محمد حنیف اور ہاجرہ اب برابر برابر پلنگ بچھا کر نہیں سوتے تھے۔ کیونکہ گھر میں ایک تو داماد تھا اور دوسرے اب وہ دونوں عمر کے اس مرحلے میں تھے جہاں کوئی کہیں پڑ رہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔

”اگلیں نلتے ہوئے محمد حنیف نے جوتنگ کر پوچھا۔

”کون؟“

لپٹے ٹرنگے سانس نے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

تیر تیز سانسوں کے آنے جانے کے دوران جیسے اندر سے کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا ہو، اس نے منہ کا حقوک نکلنے ہوئے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا: میں ہوں انور۔“

”انور جا کر سو جاؤ اب تم میرے داماد ہو۔“ نیند کے خماری سے بھری ہوئی آواز نے کہا۔

”نیا دور“ کراچی

فنکار

میں نے اس کو بارہائی بس اسٹاپوں پر دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا۔ جد سے زیادہ پہلی گڈری میں بیٹھے ہوئے گندی دارھی والے ایک پر گھٹنے سے غائب اور ستر آہوا لیے بجک سنگوں پر قوس آنے کے بجائے مجھے گھس آیا کرتی تھی۔ مگر آج بجک لائن کے بس اسٹاپ پر میں اس کے پاس سے گزرا تو اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا جو گندی دارھی میں قریب قریب چھپا ہوا تھا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ چہرہ ایک جوان کا تھا اور میرا لا شعور اس سے مانوس معلوم ہوتا تھا۔

”ادھر آئیے“ اس نے کہا اور بس اسٹاپ سے وہ اپنی بیس کھیوں پر اچلتا ہوا کچے کنارے چلا۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے گھینا جاتا تھا مگر اس وقت وہ کچھ اس طرح سے دلچسپ ہو گیا تھا کہ میں اس کے پاس پہنچ ہی گیا۔

”میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ“ اس نے ایسے لمبے میں کہا جو مجھے مانوس معلوم

ہوا۔ اور پھر اس نے آیت کے بجائے آؤ کہا جس سے مجھے محسوس ہوا کہ یہ مجھے
برابری بتانا چاہتا تھا

وہ آگے آگے اور میں اس سے کچھ دُور پیچھے دیکھتے بڑھتے رہے۔ وہ پھر پھر
مجھے دیکھتا رہا اور پچلے آؤ کہتا رہا۔ اس کا وہانا وار بھی مرنے والوں میں چھاپا ہوا تھا
مگر نہ کہیں برابر شکر اور ہی نہیں میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون ہے اور کچھ کچھ یاد کر رہا
تھا کہ اسے یا اس کے سے کسی کو کہاں دیکھا تھا۔

کوئی چالیس قدم جا کر وہ ایک گلی میں ٹرا اور پھر میری طرف مڑ کر بولا۔ زیادہ
دُور نہیں جانا ہے چلے آؤ۔

اس گلی کو پار کر کے وہ ایک اور گلی میں ٹرا جو بہت تنگ تھی ایسی تنگ جیسی کوئی
میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس گلی میں وہ ایک دروازے کے پاس پہنچا
اور اپنی گڈی میں سے ہاتھ نکال کر دروازے میں لگے ہوئے قفل کو کھولا۔ اور پھر
دروازہ کھولا۔ میں نے دیکھا کہ دروازے سے ایک زینہ اُپر کو جا رہا تھا۔ اس پر وہ
بیا کھیاں ٹکاتا ہوا چڑھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چڑھا گیا۔ اس نے دہانے
کو ایک دروازہ کھولا اور بولا: تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ آؤ یہاں کمرے میں بیٹھو
میں ابھی آتا ہوں؟

میں اس کمرے میں داخل ہوا جس کو اس نے کھولا تھا۔ یہ کمرہ نہایت عمدہ
سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا۔ وہ اس میں سے ہوتا ہوا برابر کے کمرے میں چلا گیا اور
صوفے پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دروازوں پر بہت
اچھے پردے تھے۔ زمین پر نہایت عمدہ قالین تھا جس کنارے دو صوفے سٹ

گئے تھے۔ بیچ میں دو چھوٹی میزیں تھیں جن پر سگریٹ اور سگار کیس اور وائس ٹرسے تھیں۔ میں ان چیزوں کو بے خیالی میں ہی دیکھ رہا تھا کہ برابر والے کمرے کے دروازے سے ایک جوان صاف مٹل کاکرٹ اور ساٹن کا پاجامہ پہنے ہوئے ہنستا ہوا آیا۔

میرے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا: ”اب تم نے مجھے پچھانا کہ نہیں؟ میں نے غور سے دیکھ کر کہا: ”تم وہی بھکاری ہو جو مجھے یہاں تک لا گئے؟“

”بس اتنا ہی پچھانا اور کچھ یاد نہیں آتا۔“ اور یہ کہہ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسا میں نے اسے پچھاتے ہوئے کہا: ”ارے تو جتنی ہے، دھتی؟“

”ہاں۔“

”مگر تو نے یہ سب کیا لگا رکھا ہے۔ تو تو امپیریل سکریٹریٹ میں آگیا تھا پھر

تجربے سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ یہاں کب آیا؟“

”میں نے پاکستان آپٹ کر لیا تھا۔ یہاں آکر دو ہی برس میں میئرمنڈنٹ ہو گیا

تھا مگر...“

”ملازمت چھٹ گئی۔“

”ہاں مجھے بھی اسکیپ بکروا گیا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک سال گزر ا، کموشادی

نہیں کی تھی بچے نہیں تھے ورنہ ناقوں پر فوب آجاتی؟“

”مگر اب ختم یہ کیا کر رہے ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس گندے ٹائیگ کٹے

بیساکھیوں پر چلتے ہوئے بھکاری کے بھیس میں تم ہی تھے؟“

”بھکاری کریپل بیگرا“ کہہ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا: ”یہ میرا فنی سمجھو میری

برنس۔ میری شاپ۔ ہم تم کوئی چودہ برس کے بعد ملے ہیں۔ میں نے بارہا تمہیں دیکھا

مگر تم نے میری طرف رخ ہی نہیں کیا۔ آج جا کر متوجہ ہوئے۔ آتی ڈونٹ تاک فزید
اس کو چھوڑو۔ اب میں وہی ہوں جو تمہارا ہم جماعت تھا۔ کتنے برس ہو گئے۔
۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۶ء جو وہ برس ہو گئے۔“

”تم ۱۹۳۶ء ہی میں امپریل سکریٹریٹ میں آ گئے تھے اور دہلی چلے گئے تھے۔
۱۹۳۶ء میں میں نے پاکستان آپٹ کیا اور ۱۹۳۸ء میں آسکرین ہو گیا۔“
”اور پھر یہ بھکاری بن گیا۔ کیا تو ہی بھکاری ہے یا کوئی اور؟ یقین نہیں آتا۔
اتنی گندگی لادتا ہے۔ تجھے گھن بھی نہیں آتی؟“

”میں کہتا ہوں دماغ پر گندگی لاد لینے سے جسم پر گندگی لاد لینا بہتر ہے۔ کیا
بتاؤں تجھ سے پہلے پہلے یہاں محسوس ہوا کہ بہت اچھا ہوں مگر پھر لاق علی خاں
کے قتل کے بعد ہر مذہب پر ایسے ایسے احمق سوار ہونے لگے۔ ایسی ایسی حماقت زدہ
باتیں کرنے لگے کہ دماغ بل ہل جاتا۔ اور ان۔ ان۔ سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ کوئی
احمق کے ماتحت آجاتے۔ سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ گدھوں کے ہاتھ میں تھکا
چلا جائے۔ کیا بتاؤں میں کیسا کھول کھول کر دبا۔ مگر برداشت کرتا رہا۔ اور پھر گدھوں
نے مجھے اسکرین کرا کے ہی چھوڑا۔“

”ہاں یہ تو میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ احمق کی ماتحتی میں کام کرنا کیسا جہنم ہے
مگر میں نے احمقوں کو چلانا بھی سیکھ لیا ہے۔“

”میں بھی سیکھ جاتا شاید۔ مگر اسکرین ہی ہو گیا۔ اس فلیٹ پر میں نے پہلے
ہی قبضہ کر لیا تھا۔ بس یہ میرے پاس تھا اور میں سڑکوں پر پھرنے لگا۔ کئی فرموں میں
ڈوگری کی مگر وہی احمق راج، حجازت کے لئے پیسے پاس نہ تھا۔ ایک دن رات گئے

اس گلی میں آیا تو دو آدمی باتیں کرنے سُنائی دیئے۔ ایک آواز آئی۔ ”میری تو پتیلیں
کی رہی آج۔“ دوسری آواز آئی۔ ”مجھے پورے باون ملے۔“ میں ان کے قریب آیا تو
دیکھا کہ دونوں بھکاری تھے۔ میں نے دل میں کہا، ”آئیں۔ ان بھکاریوں کو اوسطاً
پچاس روز مل جاتے ہیں۔“ ٹر بڑھ ہزار روپیہ مہینہ اد میں ہوں کہ پانچ چھ سو کی نوکریوں
کی تلاش میں پھرتا ہوں۔ چونے کھاتا ہوں، کھوتا ہوں۔“
”تو تو بھی بھکاری بن گیا۔“

”میرے دل میں بھی آئی کہ بھکاری بن جاؤں تمہیں یاد ہے کہ ایک وہ محمود
نٹھانہیں اپنے ساتھ جوتی۔ اسے کے بعد ساٹھ روپیہ کی نوکری پر گیا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا
کہ اگر سو روپیہ ماہوار پر سڑکوں پر جھاڑو دینے کی نوکری مل جائے تو اسے کروں مگر
سڑکوں پر جھاڑو دینے والے کو اس وقت کوئی دس بارہ روپیہ ہی ملتا تھا۔ میں نے
وہ ساٹھ روپیہ کا کلرک ہی رہا۔ ہمارے یہاں قیروں کو بھی زیادہ سے زیادہ آٹھ
دس آنے روز مل جایا کرتے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہاں بڑا شہر ہے دو چار روز مل
جاتے ہوں گے حد سے حد پانچ۔ مگر یہ سُن کر کہ ان دو بھکاریوں کو چالیس سے
پچاس کے درمیان ملے تھے میں سوچنے لگا کہ مارا مارا پھرنے کے بجائے اگر یہی
کرنے لگوں تو کیا ہو۔ مگر اس کام کے لئے مجھے اپنے کو اچھی طرح چھپانا ضروری تھا
ورنہ پہچاننے والے بہت تھے۔ جڑی وقت ہوتی۔“

”تو تو نے یہ سب گندہ سامان اُڈھ لیا اور اس میں چھپ گیا۔“

”نہیں یاد یہ کام بھی اکدم سے نہیں ہو جاتا ہے اس کے لئے بھی تعلیم سیکھنا
اُستاد، ٹیلنٹ سب ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور کافی دیر میں یہ فن آتا ہے۔“

میں کہتا ہوں کہ شاعری کے فن کی طرح یہ بھی ایک فن ہے۔“
مگر شاعر بھبک منگا تو نہیں ہوتا۔

”بڑے شاعر اپنی خودداری پر قائم رہے مگر اصل میں وہ بھی دستِ نگرہی تھے۔ میر صاحب آصف الدولہ سے اکڑے۔ گمراہ آصف الدولہ بڑے نیک بادشاہ تھے نہیں تو بھوکوں مر جاتے۔ مگر اشدِ غیروہ کو دیکھو۔ دل چڑھے بھبک منگے نہیں تھے تو کیا۔ خیر ان سب کو جانے دو جن کے نام تاریخ میں آگئے ہیں۔ میں اپنی طرف ہر تعلقہ دار کے میاں ایک شاعر بھی دیکھتا تھا جو کسی طرح بھبک منگوں سے حشک نہیں ہوا کرتا تھا۔ بہر حال میں نے پہلے خود کرنا شروع کیا کہ اس پٹے کی زلت سے دل کو جو بھبک محسوس ہوتی تھی اس پر قابو کر لوں۔ سوچے سوچتے یہ سمجھ میں آیا کہ دنیا بھر میں اتنی فی صد لوگ بھبک منگوں کی ذہنیت رکھتے ہیں۔ ہر دہائی ہر ادارے۔ ہر کام میں بھبک دینے والے اور بھبک لینے والے ہی نظر آئے۔ ہر ایک اپنے اوپر والے سے یہاں بھبک ہی مانگتا ہے اور اپنے سے نیچے کو بھبک دیتا ہے۔ اگر میری ذہنیت بھبک منگے کی ہوتی تو کبھی اسکرین نہ ہوتا۔“

”بات تو کوہِ سچ ہی کہہ رہا ہے۔ مگر اس میں مبالغہ بھی شامل ہے۔“

”مبالغہ بالکل نہیں۔ بیاں قانونِ قاعدے اور انصاف کا خیال نہ ہو دہاں سب یا توڑا کر ہو جاتے ہیں یا فقیر؟“

”تو تو بجائے فقیر کے ڈاکو بنتا۔ اس میں لاکھوں کے دارے نیارے ہوتے۔“

”اس میں بڑی جلدی پکڑا جاتا۔ سب کھائی لٹک جاتی۔ ڈکیتی جرم ہے۔“

بھبک۔ لٹک جرم نہیں ہے۔ ڈکیت سے ہر شخص غت ہوتا ہے۔ فقیر پر شخصِ ترم

کھاتا ہے۔ فرض ایک ہفتہ کے اندر ہی میں نے اپنے دل کو بھیک منگوانے پر راضی کر لیا۔ اب سوال آیا عمل کو تو میں اب برس اسٹاپ پر جا کر کھڑا ہوا اور وہاں سے گزرتے ہوئے ہر فیکر کو عبور دیکھا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ اسی فی صدی بنے ہوئے ہیں۔ اپنے کو گندہ بنا رکھا ہے تاکہ کوئی غور سے نہ دیکھے۔ مجھے بھی ان کی گند کی پر پہلے پہلے ہڑی گھن آئی مگر بعد میں محسوس ہوا کہ خوشامدی اپنے دھن اور دھن دونوں کو پست یا گندہ بنائے رہتے ہیں تاکہ ان کو دینے والا ان سے خوش رہے ہر قسم کی دہنی کثافت اور جتنے ہیں تاکہ ان کے اندر چھپی ہوئی روح دکھائی نہ دے۔ پھر دوسری چیز یہ نظر آئی کہ جتنی ترس ناک صورت بنائی جائے گی اتنا ہی زیادہ بھیک ملنے کے امکان میں۔ میں نے اس سلسلے میں بھی خوشامدی لوگوں کا فقروں سے مقابلہ کیا۔ وہ بھی بوس کو خوش کر کے اپنا دوتا رونے لگتے ہیں اور اپنے کو ترس کے قابل ثابت کر دیتے ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے مگر تجھے یہ ظاہری سامان کہاں سے بلا؟

”خیر جب میں نے طے کر لیا کہ بھیک منگا ہی جنوں گا تو پھر ایک اُستاد کی ضرورت ہوئی اور وہ بھی مل گیا۔“

”کسی بھیک منگنے سے تجھے یہ سب سیکھا پڑا۔ خود نہیں کر سکتا تھا؟“

”مگر رمل ہوں تجھ سے کہ یہ فن ہے ’فائن آرٹ‘ ہے۔ ایسے ویسے ہی آجاتا؟ خیر سن تو مجھے اُستاد بھی کیسا ملا۔ تجھے بڑا تعجب ہو گا۔“

”تعجب کی کیا بات؟“

”وہ اُستاد نہیں اُستاد فی حق۔ مرد نہیں عورت تھی۔“

”عورت؟ عورت جب صاف ہو تو اس سے زیادہ صاف چیز ممکن نہیں۔ اور

جب گندی ہو تو اس سے زیادہ گندی نو کوئی گندی گرٹیا بھی نہیں ہوتی۔ کوئی بھڑکے
گندی بڑی ہی گندی عورت ہوگی، اس کا ذکر نہ کر مجھے سوچ کر ہی گھس کر ہی ہے۔
”میں تو سہی۔ میری فن کاری تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک کہ میری مستانی
کے فن کو نہ جانے۔ یہ لکھیہ تو ہم نے سانغہ پڑھا تھا تاکہ فنکار کی روایت کا مطالعہ
ضروری ہے؟“

”اچھا خیر تاؤ۔ وہ کون تھی اور کیسی تھی؟“
”مجھے دکھا بھی دوں گا کہ کون ہے اور کیسی ہے؟“
”میں دیکھنے سے باز آیا۔ اپنا تھوڑا سا“

”جس وجہ کا تو نے مجھے دیکھا بالکل اسی طرح کا ایک فقیر تھا اور اس کے
ساتھ ایک عورت چھرتی تھی۔ سا نولارنگ، منہ ہر قسم کے میلے دجے۔ ناک پر
ایسا نشان، جیسے کسی نے ناک کاٹنے کی کوشش کی ہو، انکھیں چڑھائی ہوئی اور پانی
بہتا ہوا، بال بکھرے ہوئے اور بٹیں پڑی ہوئی جو منہ پر لگتی تھیں۔ کپڑے حد سے
زیادہ سیلے۔ ناک بھی ہتھی ہوئی تھی۔ اور بار بار اپنی حد سے زیادہ سیلی پیادہ سے
پونچھ لیتی تھی فقیر بہت بڑھا تھا۔ اور بس اسٹینڈ پر آکر گر جاتا تھا۔ فقیروں کا
مطالعہ کرنے میں میں نے ان کو بار بار غور سے دیکھا۔ شاید اس لئے اور بھی ان
کو ضرور دیکھا کہ ان سے زیادہ گندے ممکن ہی نہیں تھے۔ عورت کی حد سے زیادہ
گندگی کے پیچھے مجھے کوئی پر اسرار بات نظر آئی۔ میں ان کو ہر پھر کر دیکھنے آتا۔ اور
ایک دن جب وہ جانے لگے تو ان کے پیچھے ہولیا۔ بڑھا بڑی شکل سے چل پاتا تھا۔
عورت اسے سہارا دیتی تھی۔ آخر کو انہوں نے رکشہ کی۔ میں نے بھی ایک رکشہ کی

اور کہا کہ ان کے پیچھے پیچھے چلو۔ دونوں رکنے آگے پیچھے چلتے رہے اور ڈی سلواناؤن پہنچے۔ میری جیب میں کل پانچ روپیہ کا نوٹ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر رکشہ کا کرایہ زیادہ ہو گیا تو کہاں سے دوں گا اور پھر واپسی کیسے ہوئی۔ مگر میں نے دیکھا کہ آگے کا رکشہ ایک ادھ بنے بغیر پلاسٹر کے بنگلے پر جو سب سے اگلا تھا ڈکاوڑ دونوں اتر ہی رہے تھے کہ میں نے اپنا رکشہ بھی رکوادیا۔ کرایہ کوئی چار کے قریب ہوا تھا۔ وہ میں نے ادا کیا اور لپکتا ہوا ان دونوں کی طرف بڑھا۔ وہ بنگلے میں چلے گئے۔ میں سسٹاپٹا کر رہ گیا۔ دہاں اس وقت تک بہت ہی کم آبادی تھی۔ اور بس لینے کے لئے کافی دور جانا پڑتا تھا۔ کچھ دیر میں سوچتا رہا کہ اگر ان لوگوں سے ملاقات نہ ہوئی تو پھر کوئی بات نہ ہوئی۔ مکان سے کچھ دور پر میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا پھر خیال آیا کہ بھیک مانگنے کا عمل شروع کرنے کے لئے اچھا موقع ہے۔ میں اٹھا کر اس ادھ بنے بغیر پلاسٹر کے گھر کی طرف بڑھا اور جدھر سے وہ دونوں گئے تھے وہاں پہنچ کر آواز لگانے کی کوشش کی مگر وہاں سے آواز نہیں نکلی۔ کئی دفعہ کوشش کر کے میں نے کہا: ”اٹھ کے نام پر...“ اور پھر آگے سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں خیر امتی ہی آواز کا گرہ نہ گئی۔ سامنے کی طرف ایک گھر کی تھی اس میں سے ایک جوان لڑکی سانولی رنگت کی جھانکی۔

”یہ وہی گھنٹی عورت تھی؟“

”اس وقت بالکل یقین نہیں ہوا کہ وہی تھی۔ اس کی سانولی رنگت میں عجیب کیف تھا۔ چہرہ پر کہیں کوئی دھبہ یا نشان نہ تھا۔ ناک پر کٹے کا نشان بھی غائب تھا۔ آنکھیں کٹورا ایسی کھلی تھیں اور وہ ایک ہی جھلک میں مجھے صفائی اور

نفاس کا محسوس نظر آئی۔ میں پھر آواز لگانا بھول ہی گیا۔ وہ کھڑکی سے غائب ہو گئی۔ پھر اس جگہ سے آواز آئی جو مکان کا خاص دردناک ہونے والا تھا اور جس میں ابھی دردناک نہیں لگتا تھا۔ ادھر آجائے ہمیں ادھر گیا وہ دیوار کی آڑ میں رہی اور کہتی رہی۔ "میں اس وقت بڑی مشکل میں ہوں میرے والد کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ دوا کی سخت ضرورت ہے۔ آپ پر ہیں اعتبار کر کے روپے اور نسخہ دیجیے ہوں۔ جلد سے جلد جا کر دوا لائیجئے مجھے آپ کی صورت دیکھتے ہی آپ پر اعتبار ہو گیا اور آپ یہ کام ضرور کر دیں گے جلدی؟ اور یہ کہہ کر اس نے نسخہ اور پچاس روپیہ کے نوٹ آڑ سے ہاتھ بڑھا کر مجھے دیئے؟

"تو وہ روپیہ لے بیٹھ رہتا تو وہ کیا کر لیتی؟

"کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ مگر یا کچھ باتیں بڑی پر اسرار ہوتی ہیں اور انسان کو بڑی

طرح باندھ لیتی ہیں اس کے اعتبار نے میرے دل سے ہر خیال نکال دیا۔"

"اور یہ بھی تو کہہ کہ اس کے حسن نے باندھ لیا؟

"ایک حد تک یہ بھی ہو سکتا ہے مگر اس وقت میرے اندر وہ انسان جاگ

گیا جو اعتبار کرنے والے کو دھوکہ دینے سے گریز کرتا ہے اور پھر میرے اندر ایک

عزم بھی پیدا ہو گیا جس کے ماتحت میں لپکتا ہوا بس اسٹینڈ کی طرف چلا۔ اتفاق

سے ایک رکشہ بھی جاتی دکھائی دی اور اس پر بیٹھ کر ناظم آباد تک پہنچا جہاں اُنٹر کورڈ انڈر

کی دکانوں پر میں نے نسخہ دکھایا چھتیس روپیہ کی دوا ملی اور میں اسے لے کر پھر

رکشہ پر روانہ ہوا اور اس گھوڑے پہنچ گیا۔ جب میری رکشہ اس گھر پہنچی تو وہ کھڑکی

پر آئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی مگر مجھے دیکھتے ہی وہ کھل کر بولی۔ "پہلے آئیے؟

میں دردانہ پر پہنچا اور جگ گیا۔ پھر آواز آئی، ”اندرا آجائے نا“ میں اندر گیا ایک اوجھلے کمرے سے ہو کر دوسرے کمرے میں پہنچا جو ہر طرح مکمل تھا۔ یہاں مسری پر جس پر نہایت صاف بستر تھا ایک بڈھا پڑا بڑی لمبی لمبی سانس لے رہا تھا۔ دو این نے اس لڑکی کو دے دی تھی۔ اس نے مجھے مسری کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود دوانا پنے لگی۔

”آپ انہیں سنبھال کر اٹھا لیجئے“ اس نے کہا

میں نے بڈھے کو پیٹھ کے نیچے ہاتھ لگا کر اٹھایا اور اس نے اس کے منہ میں دوا ڈال دی۔ بڈھے نے کچھ منہ بنا یا اس کے سانس میں کچھ فرق آیا۔ میں نے بے ٹاویا اور وہ سونے سا لگ گیا۔ ہم دونوں بستر کے پاس کھڑے ہوئے کافی دیر تک اس کی حالت کو دیکھتے رہے پھر وہ غافل ہو گیا۔ اس نے پھر مجھے پیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ بڈھا خراٹے لینے لگا۔

”اب ٹھیک ہو گئے۔“ وہ اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بولی۔ میں نے رقعہ اٹھا کر دوا لینے کے لئے جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ آپ کی آواز آئی۔ آپ کیا چاہتے تھے۔ اب بتائیے“

”میں بھک منگا بننا چاہتا ہوں اور اس کی پہلی کوشش میں نے آپ کے دردانہ سے پرکھی“

”مگر ناکام رہے ہیں بڑی مشکل سے آتا ہے“ وہ مسکرا کر بولی اور اپنے سفید دوپٹے کو جو اس کے رنگ پر کھیل رہا تھا سر پر سنبھالا اور اور کہتی رہی۔ ”آپ کئی دن سے ہم لوگوں کے پاس آ کر جاتے رہے اور آج آپ نے ہمارا صاف ہیچ کیا۔“

میں نے ابا سے کہا کہ یہ مرد ہم لوگوں کے پیچھے لگا ہے۔ انہوں نے اپنے تجزیے سے کہا شاید وہ بھی ہمارے پیشے میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ اچھا اگر اور قریب آیا تو اسے راہ سے لگائیں گے۔ یوں باتیں کرتے کرتے ان پر دوردہ پڑا میں نے دوا کی پیشی دیکھی سب دوا ختم ہو چکی تھی میں نے برقعہ اٹھایا یہی تھا کہ آپ کی آواز آئی۔

”آپ کو یہ خیال نہیں ہو اگر میں پچاس روپیہ لے کر بھاگ جاؤں گا؟“

”ہرگز نہیں۔ آٹھ برس سے چہرے دیکھتے دیکھتے مجھے آدمی کی پہچان ہو گئی

ہے اور آپ کا پریشان چہرہ کھویا کھویا کسی تلاش میں۔ روز ہی دیکھا کرتی تھی۔ مجھے

یقین ہو گیا تھا کہ آپ ہم لوگوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ کیوں ہے نہیں؟“

”میں نے کہا بات یہی ہے؟“

”اچھا تو پھر آپ میرے ان والد کی جگہ لے لیں۔ یہ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔

میں آپ کو ان کی طرح سجادوں کی، کل صبح تڑکے ہی آجائیے؟“

”میں نے سوچا کہ میری جیب میں قریب بارہ آنے ہی ہیں۔ اس وقت جہاں کل

پھر آنا پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ خیر گھر پر یعنی یہاں میرے پاس پیسے تھے اس نے

میں نے اس سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس نے خود کہا۔ پیسے نہ ہوں تو میں

دس دوں؟ مگر میں نے کہا۔ ابھی اس حد کو نہیں پہنچا ہوں۔ اور اس کے بعد میں

اس کے یہاں سے چلا آیا۔

”واہ میں تو سمجھا تھا کہ رات کو تو وہیں رہ گیا اور اس طرح سے اختلاط ہو گیا۔“

”اور کوئی تڑکی ہوتی تو یہ ممکن تھا۔ مگر وہ تڑکی عجیب چیز تھی اور اب بھی عجیب ہے

میں تجھے دکھاؤں گا۔ وہ بالکل آسانی ہے بالکل۔ آٹھ برس بھیک مانگنے نے

اسے بڑا پنگا کر دیا تھا۔ اور تو اس سے باتیں کر کے دیکھے گا کہ اس کا ذہن کس قدر بخت ہے۔ خیر دوسرے دن میں آگیا۔ بڑھا ٹھیک تھا۔ لڑکی گستاخانی میں چلی تھی۔ اور مجھے دیکھ کر ہنسی، اس نے اپنے باپ کے فقیروں والے سب کپڑے مجھے پہنائے میری ٹانگ ٹیڑھی کر کے اس پر قہما اور جعلی بانڈھی۔ بیساکھیاں دیں۔ فرض میں نے قیادام آئینے میں جو اس لڑکی کے کمرے میں رکھا تھا دیکھا تو میں بالکل فقیر معلوم ہوتا تھا اپنے کو پہچان نہیں سکتا تھا۔“

”گھاس بٹھے کے چہرے پر جھڑپاں ہوں گی اور تیرا چہرہ تو صاف ہے۔“
 ”وارھی مونچھوں، گندے دھبوں، ناک انگول، ماتھا سب ہی پر میل لگا لینے سے میرا خیال بھی اس طرف نہیں گیا کہ میرے چہرے پر جھڑپاں ہیں بھی کہ نہیں۔ اور بھیک دینے والوں میں چہرے کو کون غور سے دیکھتا ہے۔ اور میری دلچ دیکھ کر لوگ منہ بھی لیتے ہیں اور زیادہ تر منہ پھیر کر ہی پیسے پھینکتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ پہلے ہی دن مجھے چشمہ ٹرن کا وہ قول یاد آیا جو میں نے اور تو نے ایک ساتھ پڑھا تھا کہ لوگ ایک دوسرے کو غور سے دیکھتے ہی نہیں اور خاص پیشیوں کے آدمیوں کی تو محض وردی ہی دیکھتے ہیں۔ یا نہ ہے نا تجھے وہ ناقد براؤن والا قصہ اور اس شخص کا کیا نام ہے اس کا جو ڈاکٹری وردی پہن کر صاف نکل جاتا ہے اور کوئی اس پر شبہ بھی نہیں کرتا کہ یہ مجرم ہے۔“
 ”ٹھیک ہے میں تجھ سے بار بار ہلا کر کہتی تھی تجھے غور سے نہیں دیکھا۔“

”تو خیر کئی دن تک میں اور وہ لڑکی ساتھ ساتھ بھیک مانگتے رہے میں اسے یہاں بھی لایا۔ مجھے اس سے محبت ہو گئی اور میں نے اس کے باپ کی اجازت سے اس سے نکاح کر لیا۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ نہیں آئی۔ میں خود رہاں ہو گیا

ہول ہر صبح اُٹھ بجے سے کام پڑاتا ہوں۔ دو بجے تک کم سے کم پچاس کما لیتا ہوں کبھی اس سے پہلے ہی پچاس ہو جاتے ہیں تو یہاں آکر وہ کپڑے اُٹا دیتا ہوں اور گھر چلا جاتا ہوں۔ یہ فلیٹ میرا اسٹوڈیو سمجھو گھر وہی ہے چل میں تجھے دکھاؤں؟

وہ فلیٹ کے اندر والے کمرے میں گیا۔ اور وہاں سے پورا آپ ٹوٹین جھٹکین بن کر آیا۔ ہم دونوں فلیٹ میں قفل ڈال کر باہر نکل پڑے۔ وہ ایک گراں پرہیزا اور وہاں گراں والوں کو پیسے دے کر ایک نہایت نفیس فوکس داگن کار میں بیٹھا۔ اور مجھے ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ وہ بولا: "کار میں یہاں چھوڑ دیتا ہوں۔ ان سے حساب ہے کچھ پیسے اور دے دیتا ہوں فلیٹ پر پہنچ کر دروازے بند ہوں اور کام ختم کر کے پھر یہاں آجاتا ہوں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں کسی بڑے دفتر میں ملازم ہوں۔ غرض ہم دونوں ٹوی سلواؤن پہنچے اور ایک مکمل سینگل پر مقررے اُس نے گراں پر گاڑی کھڑی کی اور باہر آکر کہا: "یہ وہی سینگل ہے جس سے میرا قصہ شروع ہوتا ہے۔ اب ہم نے اسے مکمل کر لیا ہے۔ چار برس میں۔"

دسی نے مجھے ڈرائنگ روم میں بیٹھایا اور خود اندر چلا گیا تھوڑی دیر کے

بعد وہ میرے پاس آکر بیٹھا اور آواز لگائی: "آج آنا سمینہ شرم کا ہے کی؟"

سمینہ داخل ہوئی اسے دیکھ کر مجھے اپنے ذہنات کی وہ لوکیاں یاد آئیں جن کا ناک نقشہ بس واجبی واجبی اچھا ہوتا تھا۔ مگر سادہ رنگت کا تنگ خاص طور پر جاذب نظر ہوا کرتا تھا۔ مگر سمینہ ان سب سے ان معنوں میں بہتر تھی کہ اس کے چہرے پر ایک خاص ذہانت معلوم ہوتی تھی کہ زندگی کے تجربے نے اس میں ایک بردباری اور ایک توازن پیدا کر دیا تھا جو دیکھتی پن کا بالکل متضاد تھا۔ وہ کھانے کی میز پر

کھانے کا سامان ٹھیک کرنے لگی اور میں نے دسی سے کہا: ”تو برا خوش قسمت ہے ایسی بیوی کہیں ڈھونڈنے نہ ملتی اور تجھے آسمان سے ٹپک کر مل گئی۔“
 ”بیوی نہیں، ہر بات میں میری آسانی ہے۔“

سمینہ کے ساتھ ہم مینو پر بیٹھے وہ مسکرائی اور بولی: ”جلد سے جلد میں ان سے یہ کام چھڑانے والی ہوں۔ ایک زمین اور لے لی ہے۔ اس پر مکان بن جائے بس اسکے کرلیہ سے اس مکان میں رہا کریں گے۔ وہ فلیٹ بھی جو ان کا بچہ کام ختم کرنے پر یکجائے گا اس کے روپیہ سے بھی کوئی آمدنی کر لیں گے۔ انہوں نے موٹر لے لی تھی، ورنہ اب تک سب ٹھیک ہو جاتا، خیر اچھا ہوا موٹر بھی ضروری چیز ہو گئی ہے۔ آج کل۔“

”مگر فن کار اپنا فن کبھی چھوڑتا ہے۔ اس پر چلنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔

دسی نے کہا: ”گریفن ایسا نہیں ہے۔ ان کے والد نے یہاں آکر اختیار کیا۔ بور ہو گئے تھے۔ میں ان کا نمائندہ بنا۔ وہ ایک دن چل بیسے سمینہ بھی بور ہو گئی تھی کیوں سمینہ۔“

”ہاں جن کاموں کی عادت ہو جاتی ہے انہیں کرتے اچھا لگتا ہے، مگر یہ کام ایسا ہے کہ عادت نہیں چڑتی اور طبیعت اس سے الگ ہو جانے کو چاہتی ہے اب مرحوم نے موقع ختم ہی چھوڑ دیا۔ میں نے بھی موقع ملتے ہی چھوڑ دیا اور ابھی دل پر جبر کر کے ہی کر رہے ہیں۔ جتنا ہم لوگ خرچ کرتے ہیں اتنی آمدنی کا جس دن مستقل سلسلہ ہوا۔ بس یہ کام چھوڑا۔ ادھر شریفوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگیں گے۔“

”تو یہ فن نہیں پیشہ ہے۔ ہر پیشے کے لوگ اپنا کام نبھاتے ہیں اور جب موقع ملتا ہے کام سے شکر و شکر ہو جاتے ہیں۔“

”نہیں! میں تو اسے فن ہی کہوں گا اور پھر ہر پیشے کو ٹھیک طور سے کرنے کے لئے فن ذکر کر رہے۔ گو فن کے معنی پیدائشی فن کے لئے رہا ہے ان فنون میں یہ نہیں ہے مگر بغیر فن کے یہ چل نہیں سکتا۔ سمیٹنے کے والد نے اسے فن کی طرح برتا۔ اس نے بھی یہی کیا اور مجھے بھی فن کی طرح سکھایا اور میں فن ہی کی طرح برتا رہا ہوں۔“

• سیپ کراچی

مواد

پھٹی اس وقت مویشیوں کو چارہ ڈال رہی تھی۔

میں بے پاؤں اُس کے قریب پہنچا اور اُسے اپنے بازوؤں میں بھنچ لیا۔
 مویشیوں کی بو میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک خوب صورت گائے عورت بن کر
 میرے سینے سے لگی ہے۔ میں نے پیادری سی گائے کے ہونٹ چوم لئے۔ شاید اس
 کے ہونٹ پہلی بار کسی کے ہونٹوں سے مس ہوئے تھے اور وہ نہیں جانتی تھی کہ
 چومنا کیا ہوتا ہے کیونکہ جب میں اُسے چوم رہا تھا تو اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔
 میری آنکھوں کے سامنے بدترین آگئی، جسے زندگی میں پہلی بار میں نے چومنا
 تو اُس نے پیادری سے متنبہ ہوتے ہوئے کہا: ”تو برا جنگلی چومنا بھی نہیں آتا۔“
 — اور پھر دوسرے ہی دن اُس نے مجھے ایک کتاب دی تہہ بند ڈیرن کنگڈم
 — مگر اُس وقت خوب صورت گائے کو سینے سے لگائے سو طرفین کے
 ایک ہی سیٹے سے چرچے نے ہونٹوں میں زندگی کی وہ میٹھی سی حرارت پیدا کر لی

جو سارے جسم میں بھیلنے لگی۔

یہ ایک جسم میں ایک ٹھنڈی سی ہوئی۔ آہٹ فہر جو نکال دیا۔ پلٹ کر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ ٹھنڈی سی کی چاپ قریب تر آئی گئی۔ یہاں تک کہ ماسی دودھ آدے سامنے آگئی۔ اس کے آنے سے پہلے ہی میں سنبھل چکا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں میں اپنے آپ کو اپنے ہی آپ میں چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے بے ساختہ بے ہنگم بچے میں کہا: ”دیکھا ماسی یہ پھٹی مجھے کلاڑی بنا کر نہیں دیتی“

ماسی نے اپنی سب پر اتراتے ہوئے کہا: ”تمہاری ماں ٹھیک ہی کہتی تھی کہ ختم نہیں بدلتے۔۔۔ تو میں اپنے بیٹے کو ابھی کلاڑی کھاتی ہوں؟“

یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی بس کی مشکی اٹھائی۔ ہمیں ساتھ چلنے کو کہا۔ آگے میں پہنچے تو میں چار پانی پر بیٹھ گیا اور پچھلی سمٹی سمٹی مویشیوں کو چارہ کھلانے کے بہانے وہاں سے کھسک گئی اور اس کے ساتھ ہی میرا دل بھی۔ خود ہی کھسکنا چاہتا تھا مگر ماسی آنکھوں کے سامنے تھی، اس نے تسی دنگی میں اٹھ لی اور دنگی جو لیسو پر چڑھا دی۔ یہ چوہا ہمیشہ گرم ہی رہتا۔ چوہے میں آگ نہ ہو تو خیال کیا جاتا کہ گھر میں غوسہ ہے۔ پھوڑی ہی دیر میں ماسی نے تسی میں دودھ ملایا۔ دودھ کے چھٹ جانے پر پانی آگ ہوا تو اس سے ایک پوٹلی میں چھان لیا پوٹلی میں جو بچ رہا اس کی روٹی سی بنا دی یہی کلاڑی تھی، پنیر سے ملتی جلتی۔

”لو بیٹے کھالو“ ماسی نے نام چینی کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ پلیٹ سامنے رکھ لی اور کلاڑی کھاتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ کلاڑی کھانے سے ماسی یہ سمجھتی ہے کہ میں نہیں بدلا۔ اسے کیا معلوم کہ میں اور ڈیڈی کہتے بدل چکے ہیں۔ بالکل اسی طرح

جیسے دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ بدل چکا ہے۔ ہاں ایک اسی ذرا ابھی تک وہی میں
 تو کیا ہوا ہم تو بدل چکے ہیں۔ ٹیڈی مئی کھنے والے یہاں سے گئے تو میں اپنے بابا اور
 امی کو امریکی بجے میں ڈیڑی اور مئی کھنے لگا۔ یہی لہجہ اختیار کرنے پر ٹیڈی کی شان
 بڑھی۔ شان پیسے سے بڑھتی ہے اور اس کے ساتھ ہی آن بھی۔ اسی آن بانی
 سے اپنے ٹیڈی لیڈر بھی ہو گئے۔ آزادی کشمیر کی تحریک کے سرگرم کارکن شہدائے کشمیر
 کا یوم آنے یا آزاد کشمیر کا، ٹیڈی بھرے جلسے میں دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں۔
 غاصبوں کے خلاف زہرا اٹھتے ہیں اور آخر میں ہمیشہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ دن
 قریب آ رہا ہے جب فرزند ان نو حید قہر گیار کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔۔۔۔۔
 ٹیڈی کی یہ تقریریں سننے سننے میں جوان ہو گیا۔ اس دوران میں نے ہی دیکھا کہ
 ایک ایک اینٹ جمع کر کے میرے ٹیڈی نے پہلے آزاد کشمیر میں پھر راولپنڈی اور
 اب لاہور میں کئی کوٹھیاں کھڑی کر لی ہیں۔

میرے خالو کا کابیر بچا کتر کہا کرتے ہیں کہ تمہاری ہر کوٹھی نصیر گیار ہے تم کبھی
 نہیں چاہتے کہ کشمیر کو آزادی نصیب ہو تمہیں خطرہ ہے کہ کہیں تمہارے نصیب ہی
 نہ بدل جائیں۔ یہاں کابیر بچو نہیں بدلے۔ ٹیڈی ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ وہ نرسے
 جذباتی آدمی ہیں کشمیر کی سرحد پر وہ کشمیر لینا چاہتے ہیں۔ اقوام متحدہ کا تقوُّ
 لم نہیں مسئلہ کشمیر وہیں ملے جو گا مگر وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ اٹا جیسے طعنہ دیتے ہیں
 کہ مسئلہ کشمیر کی بدولت ہی تمہاری شان و شوکت ہے۔

ٹیڈی ٹھیک ہی کہتے ہیں مگر جانے کیوں ابھی تو دیکھ کر یوں محسوس ہونے
 لگتا ہے کہ کابیر بچو سچے اور خلص مزود ہیں۔ اسی لئے انہوں نے آزاد کشمیر کے

کچے کوٹھے ہی میں اپنے کردار کو چھتہ بنائے رکھا۔ آزاد کی کشمیر کے لئے جنگ ہوئی تو وہ اپنے جوان بیٹے نور الدین کے ساتھ محاذ پر لڑتے رہے۔ محاذ پر نور الدین شہید ہوا۔ وہ آج بھی بڑے فخر سے اُس کی شہادت کا واقعہ بیان کرتے ہیں تو دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا ہوں کہ میرے ڈیڈی نے جنگ کے دوران مجھے امیٹ آباد بھجوا دیا تھا اور خود خانہ بندی کے بعد بڑے شہروں میں تقریریں کرتے ہوئے سرحد پار سے آئے ہوئے صاحبزین کے لئے کپڑاٹا اور چندہ جمع کرتے رہے۔ اُس وقت ایک امیٹھیں جو ابھی تک کچھ دیسی ہی ہیں۔ مجھ سے کہا کرتیں "کاش تو بھی سُندا ہوتا؟" نور الدین کو پیار سے سُندا کہتے تھے۔

میں بچلا سُندا کیسے ہو سکتا تھا۔ کانٹ میں تعلیم پائی یسوع مسیح کا پیر و کار نہ بنا تو مسلمان بھی نہ رہا۔ سکول سے کالج تک ایسے ماحول میں رہا کہ اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو گیا۔ نور الدین میری طرح نہیں بدلا تھا۔ اُسے کا کاکیر جو ہمیشہ یہ کہتے کہ دیکھو بیٹے زندگی یہی ہے کہ اپنی سرزمین کو آزاد کرائیں! — اور میرے ڈیڈی مجھے قائل کر لیتے کہ دیکھو بیٹے جذباتی ہونے سے زندگی کسی کام کی نہیں رہتی۔ دیکھو تمہیں میری طرح اپنا اثر و رسوخ جو خانہ ہے قوم کی راہنمائی کرنی ہے۔ بڑے لیڈروں کی تقریریں پڑھو — اور پھر ملکی اور غیر ملکی لیڈروں کی تقریروں پر مبنی کتابوں کا پھاڑ میرے سامنے کھرا ہو جاتا اسی پہاڑ کی اوٹ سے میں وادی کشمیر کے پہاڑوں پر نظر رکھتا لیکن سُندے کے سامنے کتابوں کا ایسا کوئی پہاڑ نہ تھا۔ سرحد اُس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ وادی کشمیر اور اس کے پہاڑ اُس کی آنکھوں میں سمائے ہوئے تھے۔ وہ غاصبوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھتا اور دل کی استغاثی گہرائیوں میں

اپنے بابا کی یہ آواز سننا رہتا یہ بیٹے زندگی یہی ہے کہ اپنی سرزمین کو آزاد کروائیں!“
 بن بھلا سندا کیسے بن سکنا تھا۔ اس کا باپ سپاہی بن کر میاں آباد ہوا۔ اُس
 نے تقریریں نہیں کیں۔ الاٹ منٹیس نہیں کرائیں۔ تجارت نہیں کی۔ وزارت نہیں کی
 سدارت نہیں کی۔ دولت جمع نہیں کی۔ کوٹھیاں تعمیر نہیں کیں۔ ایک ہی کچے کوٹھے
 میں رہ کر وہ اپنی بات کو پکا نکالا۔

مسی دُروانہ نے بات پکی کرنے کے لئے کا کا کبیر پو سے کہا۔ بہن پیغام لے کر
 آئی تھی تو کیوں نہ پھر.....“

کا کا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”بھتی کی شادی کی بجائے؟“

”ہاں تو اور کیا۔۔۔ آخر یہ بھی ایک فرض ہے!“

کا کا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ہمارا فرض تو بس یہی ہے کہ ہم آزادی کے لئے
 قربان ہو جائیں!“

مسی دُروانہ نے بے اختیار دونا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ ایسی
 باتیں کر دیں کہ کا کا کبیر پو نے اس فرض کو بھی محسوس کر لیا اور شاید اسی احساس پر
 وہ کہنے لگے ”جہاں بے کبوں مجھے یوں لگتا ہے کہ۔۔۔ اپنے ہو کر بھی اپنے نہیں رہے۔ وہ
 تو اپنے ہی سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔۔۔ مگر تم کہتی ہو۔۔۔!“

کا کا کبیر پو رک گئے اور اس کے ساتھ ہی دروازے کی اوٹ میں کھڑے
 کھڑے مجھے یوں محسوس ہوا کہ اپنے دل کی دھڑکن بھی غم گئی ہے مگر پھر آواز آئی۔ ”نہم
 کتنی ہو کہ بھتی خوش رہے گی۔۔۔ اچھا تو یوں ہی سہی۔۔۔ پر سوچ لو تمہارے بہنوئی

بڑے لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں۔ بڑے نام والے ہیں۔ دولت، عزت، سبھی کچھ سمیٹ کر بیٹھ گئے۔ اور ہمارے پاس کیا ہے؟
 کا کاکیر جو گری خاموشی میں کھو گئے۔ اسی خاموشی میں جیسے کسی نے مجھ سے یوں کہا کہ اصول پرستوں کے پاس پیسہ نہ ہو تو وہ ایمان کی بدولت سمیٹ کر دکھستے ہیں۔

دکھ ستنے ستنے ہی پھپھتی جوان ہو گئی تھی کسی چٹان میں سے ترشی ہوئی یوں لگتا تھا کہ بنانے والے سنگ مرمر کو ٹھکالی پھولیوں میں گوندھ کر اس کا توانا جسم تیار کیا۔ صحت مند، سرخ و سپید اور ہلکا ہوا میرا دل چاہتا تھا کہ وہ بادلوں میں تحلیل ہو کر شہر شہر برس پڑے اور وہاں کی نو جوان برہمنیں اس بارش میں نہا کر صحت مند، حسین، بھٹاکش اور سادہ ہو جائیں۔

پھپھتی اور میں کوئی بارہ ہزار فٹ کی بلندی سے شیشہ ٹکلی کی چوٹی پر سرحد پار وادی کشمیر کو دیکھ رہے تھے کہ آن کی آن میں کالے بادل اتر کر آگئے اور چھا چھم برسے لگے پھپھتی نے میرا ہاتھ پکڑا اور بارش سے بچانے کے لئے قریب ہی ایک غار میں لے گئی پہلی بار جم دونوں کو مکمل تنہائی نصیب ہوئی تھی۔ دونوں ایک پتھر پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں جذب کرنے لگے۔ یکایک بھلی کڑکی تو میں بے اختیار اس سے پٹ گیا۔ وہ مسکرائی تو میں آپ ہی آپ شرمایا۔

پردہ بین کے سامنے بھی فرزندہ ہوا تھا اپنے جنگلی پن کے احساس پر ارد میں دھنکا کبھی نہیں بھول سکتا جب سینہ دیکھ کر کانٹنی نیشل گئے۔ کچھ پیا، کچھ کھایا۔ گھر لوٹے ویڈی ارد مٹی آنا دشواری میں تھے۔ گھر میں فقط میز راج تھا۔ پردہ بین نے گھر میں قدم رکھا تو ایک خاص اداسے انگڑائی لیتے ہوئے کہا: ”اے سچی میں خفا گئی ہوں یہ منہ دار میتہ دوم کہاں ہے؟“

— ارد ہم دونوں آخر اُس منزل پر آ گئے جس تک پہنچنے کے لئے میں نے کئی موڈ کاٹے تھے۔ کسی نہ کسی موڈ پر تنہائی میں موقع پاتے ہی بوس و کنار سے دونوں کے جسم غائبانہ طور پر ایک دوسرے سے متعلق ہو چکے تھے مگر یہ مکمل تعارف تو نہیں تھا۔ میتہ دوم میں داخل ہوتے ہی پردہ بین نے خود ہی وہ کوٹ اُتار پھینکا جو اُس نے فرمائش پر سال روڈ کے اُس درزی سے سلوایا تھا جس نے کوٹ پہناتے ہوئے اُس کے کان میں آہستہ سے چھونکا تھا: ”ماشا اللہ کوٹ کیسافٹ آیا ہے۔ کتنی سہاٹ لگتی ہیں آپ!“

یہ کہتے ہوئے وہ کوٹ پردہ بین پر یوں بُرش پھیرنے لگا کہ اُس کا اپنا سارا جسم بُرش کے ہر مال میں سمٹ آیا اور اس طرح وہ بُرش بن کر کوٹ کو صاف کرتے دسے لٹکیں حاصل کرنے لگا۔

کوٹ ایک طرف پھینکتے ہوئے پردہ بین نے اپنے آپ کو میتہ پر گرایا اور پھر پھل کر بیٹھ گئی۔ اُس کی چُپت قیص نے اُسے بھینچ رکھا تھا۔ اس سے غارت ہو کر اُس نے انگڑائی لی اور شادی اور مہنی حون کی باتیں کرنے لگی بھائی ہو نو لہو نیا گرا مال اور ڈنڈنی لہند میں کھو کر وہ میرے بازوؤں میں یوں بھیل گئی جیسے وہ عورت کی بجائے مرد تھا

”میں سر سے پاؤں تک سب ہو گیا مجھے بت کی طرح بے حس پاکر وہ بولی تو بنگلا

”تم بارش میں بھیگ گئے ہو تمہارے ہاتھ ٹھنڈے ہیں! پچھتی نے مجھے چوکھوایا۔
وہ بہت پیاری لگ رہی تھی میں نے اس کے سر سے کسبے کی ٹوپی اتاری تو
اُس کی بینڈھیاں اُس کے شانوں پر بکھر گئیں میں نے اس سے کہا: یہ سانپ اُٹونے
ٹوپی میں ٹھپار کھے تھے۔“

اُس نے ساوگی سے کہا: یہ تو بینڈھیاں ہیں۔ سانپ تیرے دل میں ہے!“
یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا دی تو میں نے اُس کے چمکیلے سفید دانت دیکھ کر پرجھل
”کون سی پیٹ استعمال کرتی ہو؟“

اُس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تو کہنے لگی: کیا کہا؟

”یہی کہ تمہارے دانت پچھے موتی ہیں!“

یہ سننے ہی اُس کے گلابی رخسار سُرخ ہو گئے۔ اُس کے گلابی رخسار اور باتوں
ہونٹ دیکھ کر اگر میں یہ پوچھ لیتا کہ تم کون سی روم اور کون سی لپ بشک استعمال کرتی
ہو تو وہ شاید گونگی اور بھری لڑکی کی طرح میرا منہ بگھتی رہ جاتی۔

یہی گونگی اور بھری لڑکی میری بیوی ہے۔

اور میں — ؟

— میں اپنی دوسری بیوی پتہ میں کے ساتھ سوسائٹی میں موڈ کرتا ہوں۔

ٹریڈی نے مجھے قائل کر لیا تھا کہ پچھتی سے تمہاری شادی تمہاری ماں کی مرضی اور قومی

خدمت کے جذبے سے ہوئی مگر تم موسائی کے ایک محرز فرد ہو۔ اپنا اثر و رسوخ بڑھانے اور موسائی میں موہ کرنے کے لئے تمہیں سو فی صد بولتی پردہ کی ضرورت ہے اور جب میں دو لہا بن کر پردہ کی کوئی آگیا تو براتیوں کی محفل میں ایک بھانڈے دوسرے بھانڈے کے نیچے شائع پر چڑھا اس مارتے ہوئے پر چھا "تو کیا فیصلہ ہوا؟"

"بس ہو گیا؟"

"اور میں — آ کر ہوا کیا؟"

"بس ہو گیا کشمیر کا فیصلہ؟"

"کس نے کیا؟ — ہندوستان نے؟"

"نہیں — ہندوستان کہتا ہے کہ کشمیر بھارت کا نہیں بھارت کشمیر کا لگ ہے؟"

"تو پھر فیصلہ پاکستان نے کیا؟"

"نہیں — پاکستان کہتا ہے کہ کشمیر کا فیصلہ کشمیری عوام کریں گے؟"

"تو یہ فیصلہ کشمیری عوام نے کیا؟"

"انہیں موقع نہیں دیا گیا؟"

"اور میں — تو پھر یہ فیصلہ کس نے کیا؟"

"امریکہ اور روس — دونوں نے مل کر کیا ہے؟"

"کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"فیصلہ یہ کیا ہے کہ کشمیر ہندوستان کو اور کشمیری پاکستان کو ملیں

گے؟"

— محفل کا ہر فرد مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گیا۔

میرے ڈیڈی کے چہرے پر بھی سُکراہٹ کھیلنے لگی۔
 قصہ گوکار کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے اُن کو نئی تقریر کا مواد
 مل گیا تھا۔

”فنون“ لاہور

واپسی

جیل کی نفا بالکل خاموش تھی۔

یہ سکوت اور بھی گہرا ہو گیا۔ جب اُس نے سنا کہ اُس کی پریل نامعلوم ہو گئی ہے اور
بچاؤ کی سزا کی توثیق ہو گئی ہے مگر یہ سکوت اس کے دل کے اندر اتنا باہر زندگی
حسب معمول تھی سامنے والے درخت کے پتے اب بھی ہوا سے ہلکا شور کر رہے تھے۔
دور سے لگنے کی آواز آج بھی سُنانی دے رہی تھی۔ سلاخوں والے دروازے پر چڑیا
آج بھی کسی وقت بیٹھ کر چوں چوں کر دیتی تھی مگر یہ سب آوازیں آج عجیب رنگ لئے
ہوئے تھیں۔ ان کا شل ہوتا ہوا دماغ ان آوازوں میں عجیب سی اجنبیت محسوس کر رہا
تھا جیسے نئے بدلتے موسم کی سہ پہر ہو، دھوپ کا انداز بھی بدلا ہوا اور سائے بھی اپنی
جگہ سے کھسکے ہوئے۔

دس مرتبہ فٹ کی اس کو ٹھٹھری میں وہ اس روز آیا تھا۔ جب سیشن جج نے پوچھی
کی سزا سُنانی تھی۔ اب وہ پچھلے تین ماہ سے اپریل کے فیصلے کے انتظار میں یہاں

گھڑیاں گن رہا تھا۔

موت کی سزا پانے والوں کی کوٹھڑیاں جیل میں علیحدہ تھیں جہاں کڑی نگرانی اور زیادہ دیر انداز تھا۔ دوسرا فرق یہ تھا کہ یہاں قیدیوں کو ایک قرآن مجید دیا جاتا۔ جو وہ سارا دن پڑھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ کئی دفعہ پڑھتے پڑھتے اس نے سوچا کہ اسی کمرے میں اس سے پہلے کئی لوگ بھی قرآن پاک پڑھ چکے ہیں، جو اب اس دُنیا میں نہیں تھے۔ کئی صفحوں پر اُسے آنسوؤں کے نشان نظر آئے۔ کون جانتا ہے کہ یہ آخری وقت کے آنسو تھے یا چند روز پہلے کے۔ کیا پتہ یہ مجرم پر پھٹتا دے کے آنسو تھے یا کسی بے قصور کی بے کسی کے۔

قرآن کریم اس کے سامنے ہوتا اور وہ ایسے خیالات میں کھو جاتا۔ کبھی یہ سوچتا کہ یہ مقدمہ کتاب تو دُنیا میں زندگی گزارنے کے ڈھنگ بتاتی ہے تو اب ایسے وقت اسے کیوں دی جا رہی ہے جب دُنیا کے دروازے اس پر بند ہو رہے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے اس کے دل میں کوئی خیال سر اٹھاتا تو وہ سوچنے لگتا کہ کیا ان لوگوں کے احساسات بھی ایسے ہی تھے، جو اس سے پہلے اس کو ٹھٹھی میں رہے اور چند روز بعد پھانسی پا گئے۔

خود اسے اپنے مجرم پر کبھی افسوس نہیں ہوا تھا۔

اُس نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا۔ دن دہاڑے اجمع عام میں۔ اور وہ اپنے والدین کا اکھوتا لڑکا تھا۔ بہت سلجھا ہوا اور نیک جس کی زندگی میں کبھی کوئی جذباتی طوفان نہیں آیا تھا۔ اس لئے کہ اس نے اخلاق اور اقدار کی تیسوڑ توڑنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی بلکہ بچپن میں اچھا بچہ بننے کے جو اصول اُسے سکھائے گئے

تھے وہ زندگی بھر ان پر قائم رہا۔ اور بائیس سالہ جوانی میں اچھا بچہ بنا رہا۔
گڈوں سے دسویں پاس کو کے وہ شہر میں ملازمت کرتا تھا کئی دفعہ شہر کی
ریمینیوں نے اُسے اُکسایا تھا لیکن اُس کی تربیت اُسے روک لیتی۔ اور یہ خیال ستا
کہ ماں کو پتہ چل گیا تو وہ کیا کہے گی۔ ماں جو اُسے دنیا میں ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی۔
اور جس کا دل دیکھانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

وہ تین ماہ سے موت کے دینگ روم میں پڑا ہوا زندگی کے متعلق سوچتا رہا
گزدی ہوئی زندگی کے متعلق اس کو ٹھٹھری کے دیران دور و دیوار اُداس تھے جو
دامخ کو سکون دینے کی بجائے گھٹس دیتے تھے اس کی فضا میں دھیرے دھیرے اپنے
والی موت کی سرسراہٹ تھی اور اس کے سلائخ دار دروازے سے نظر آنے والے
بھگی جیل اسٹاف نگہری پڑیا اور چوڑے گردی ہوئی زندگی کی یادوں کے پت کھولتے
جاتے۔ اس وقت اس کی سابقہ محرومیاں کھلنا لگیں تھیں پائی سنی جواہر
قندیکر بن جاتیں، دفن شدہ دلہرانے لگتے۔ مزید زندگی کی خواہش ترپنے لگتی اور
قسمت کے خلاف لگے شکوکے قطار اندر قطار اُٹھنے لگتے۔

اس کو ٹھٹھری میں قرآن کے صفحوں پر خالی فوٹی نظر میں جائے اس دن میں کئی
کئی دفعہ سارے واقعات ذہن میں دہرائے تھے جو قتل سے متعلق تھے۔
سب سے پہلے اُسے ماں کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ اب اس کا باپ جھنگرنا
رہتا ہے۔ خط میں نہ کوئی خاص وجہ لکھی تھی اور نہ جھنگرے کی نوعیت بتائی تھی۔ اس
نے یہی سوچا کہ ماں کے پاس خط لکھنے کو اور کچھ نہ تھا۔ اس لئے اس نے اس غیر
چیز کا ذکر کر دیا ہے ورنہ ماں باپ میں جھگڑے کہاں نہیں ہوتے۔

اگلے ایک دو خطوں میں خاموشی تھی۔ اس نے جب باپ اسے ملنے آیا تو اس نے یہ موضوع نہ چھیڑا۔

چند روز بعد وہ گھر گیا تو ماں باپ کے پڑچڑے پن کا سرسری سا ذکر کیا اور بس۔ اس کے اپنے مشاہدے میں کوئی پریشان کن چیز نہ آئی۔

پھر ایک دن اُسے ماں کا مفصل خط ملا۔ جس میں اُس نے لکھا تھا کہ اس کا والد پچھلے کئی دنوں سے اُسے نزد و کو بکرا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ نئے قانون کے تحت میں اسے دوسری شادی کی اجازت دے دوں۔ اور دوسری شادی میں بددعیا کر دوں پھر ماں نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ دوسری شادی سکینہ سے کرنا چاہتا ہے جو ماں کی خال زاد بہن تھی اور اپنے باپ کے مرنے کے بعد بہت سی زمین کی اکھوتی وارث تھی۔ ماں نے لکھا تھا کہ تمہارا باپ جائیداد کی حرص میں اتنا دیوانہ ہو گیا ہے کہ اپنے سے آدھی عمر کی لڑکی سے شادی رچانے پر تیار ہوا ہے۔ وہ مجھ سے تحریری اجازت بھی چاہتا ہے اور یہ بھی کہ میں ان لوگوں پر زور ڈالوں کہ وہ یہ رشتہ دے دیں۔

وہ یہ خط پڑھ کر بھونچکا رہ گیا۔ میرا باپ اور شادی؟ اس کا سر جھک گیا۔ باپ کی عمر پچاس کے قریب تھی اور ماں کوئی چالیس کی تھی اب سے بیس اکیس سالہ لڑکی سے شادی؟ اسے ایسے لگے جیسے وہ خواب یا نشے کی حالت میں ہو اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو لیکن جب بار بار خط دیکھتا تھا تو اس کا دل ڈوبتا ہی جاتا۔

اسے اپنی ماں سے بے پناہ محبت تھی اور ماں کا دکھ پہنچا ہوا تھا آگ ہی کرنا

کے لگ وپے میں گھٹنے لگا اس نے حالات کا تجربہ کرنے کی کوشش نہ کی اور اس نے ساری بات کو جس انداز سے لکھا تھا اس نے من و عن قبول کر لیا۔ ماں کی ذات اس کی نظر میں اتنی بلند تھی کہ اس کا سارا غصہ باپ کی طرف منتقل ہو گیا۔

یہ کیسا باپ ہے؟ جو گھرتا ہوا کرنے پڑتا ہوا ہے ہمارے اپنے گھر میں کس چیز کی کمی تھی جو وہ مال و دولت کی حرص میں اندھا ہو رہا تھا۔ اکھوتے بیٹے کے لئے کیا یہ ساری زمینیں کافی نہ تھیں؟ جو وہ گھر کا ٹھہرا ہوا پیکوں کا حوالہ دے کر اڑانا چاہتا تھا۔ اور وہ باپ ہی کیا ہو یہ نہ دیکھ سکے کہ نیلے پیلے آنچل تو اس کے بائیس سالہ جوان بیٹے کے خیالوں میں لہرا رہے ہیں اس کا فرض تو بیٹے کے خیالوں میں بھاگتا تھا لیکن وہ خود ہی ان آنچلوں کے پیچھے بھاگنے لگ گیا۔ اٹھتے بیٹھے وہ جتنا ہی سوچتا اس کے دل میں باپ کے خلاف نفرت بڑھتی جاتی۔ اس باپ کے خلاف جسے اس نے ساری عمر بھاریا کیا تھا اور غالباً اسی وجہ سے اسے باپ کے طرز عمل سے صد پرہیز تھا۔ چنانچہ وہ ساری محبت اب مکمل طور پر مظلوم ماں کی طرف منتقل ہو گئی اور باپ کے لئے سوائے نفرت کے اور کوئی جذبہ باقی نہ رہا۔

جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوا تو غم اور غصے سے نیم پاگل ہو رہا تھا۔ وہ خوب اندازہ کر سکتا تھا کہ معاملہ یونین کو نسل تک جانے سے ان کی کتنی جگ ہنسائی ہو گی خصوصاً جب کہ یونین کو نسل کا چیرمیں ان کی مخالف پارٹی کا تھا اس سے انصاف کی توقع تو بالکل نہ تھی۔ البتہ یہ یقین تھا کہ وہ اس معاملے کو بلاوجہ اچھالے گا مگر کما ذریعہ بنائے گا اور ان کو روک دے گا کہ مزہ لے گا۔

جیسے جیسے گاؤں قریب آتا گیا وہ سوچنے لگا کہ میں گاؤں میں کیسے داخل

ہوں گا؟ میں لوگوں کا سامنا کیسے کر سکوں گا۔ پہلے تو ہونگی پرہی و درپار خیر صلا و پختہ والے ہوں گے۔ آگے اڑے پر بھی دکھنا اور خواہنے والے جانتے ہیں اس سے آگے مسجد کے مولوی صاحب بچے پڑھانے کے ساتھ ساتھ باہر جھانکتے رہتے ہیں جن سے بات کئے بغیر آگے جا نکلنا ممکن نہیں اور پھر اس کے بعد تو بازار ہے جہاں سونے والے ہوں گے۔ وہ ان سب کی طنزیہ نظروں کا مقابلہ کیسے کر سکے گا۔ اور نہ معلوم گھر کا کیا حال ہوگا۔ ماں کس حال میں ہوگی اصحاب کا مژد کیا ہوگا؟

باپ کا خیال اتنے ہی اس کے خون میں نفرت کے اُبال اُٹھنے لگے۔ آخر بابا کو کیا پڑی تھی بیٹھے بھائے بھٹس میں تیلی پھینکے کی۔

اور پھر گاؤں آگیا۔ بھرموں کی طرح نیچے دیکھتے ہوئے وہ چلتا رہا۔ کسی سے نہیں بچائے کسی سے جسم چرائے۔ بازار سے گزرتے کی بجائے اس نے پچھلے قبرستان سے لبا راستہ اختیار کیا۔

گھر کا دروازہ نظر آیا تو نہ خوشی سے اس کا دل مچلا نہ یہ خواہش ہوئی کہ گھر والے باہر ہی بل جائیں۔ بلکہ اس کا دل بھاری بوجھ سے بیٹھنے لگا۔ نہ معلوم گھر میں کیا نظر آئے گا۔

دلہیز پر وہ لمحہ بھر کو ٹھٹھا... اور پھر اندر داخل ہو گیا۔

صحن خالی تھا۔ ماں ہمیشہ کی طرح شہتوت کے نیچے بیٹھ کر سبزی نہیں کاٹ رہی تھی۔

وہ بڑے کمرے میں گیا۔ وہ بھی خالی تھا۔ صند قوں کوتالے لگے تھے جو باہر جانے کی نشانی تھی۔

وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اندر سے میرا شن بجلی۔ اُسے دیکھا اُو
ٹھٹک گئی۔ پھر گڑ بڑا کر سلام داغ دیا۔

گھر خالی دیکھ کر اس کا ذہن تتاؤ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ سلام کا جواب دینا
اور حال احوال پوچھنا بالکل بھول گیا۔ قریب چھ گھنٹے گزر گئے۔

”ماں کدھر ہے؟“

میرا شن نے اسے غور سے دیکھا۔ اور بولی ”یونین کونسل کے دفتر میں سو رہی۔
طلاق کے مقدمے کی تاریخ ہے۔“

اس نے جست لگائی۔ زن سے باہر نکلا اور تقریباً بھاگتا ہوا دفتر کو چلا۔ راستے
میں کسی نے آواز بھی دی مگر وہ رکا نہیں اور پلٹتا چلا گیا۔

دفتر کے باہر میدان میں مقدمہ پیش تھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ جب وہ ان کے
قریب آ رہا تھا تو اسے بالکل ایسا لگا جیسے عاری کا تماشہ ہو رہا ہے اور اوگروگ
جمع ہوں۔ شرم اور خفت نے ایک دفعہ پھر پاؤں پکڑ لئے اور وہ مجمع کو چر کر آگے بڑھنے کی
 بجائے دم سادھ کر پیچھے سے جھانکنے لگا۔

چیرمین اور صاحبی کشی کے دو ممبران کرسیوں پر بیٹھے تھے، سامنے اس کی با
ہوار پائی پر بیٹھی تھی اور چہرے پر پتھر رکھے زار و تظار رو رہی تھی ماں کو برسرِ دام ہلڑیوں کی
طرح روتا دیکھ کر وہ غصے سے نیم پاگل ہو گیا۔ اس کا باپ بلند آواز سے بول رہا تھا۔
”میں اسے اتنے عرصہ سے سمجھا رہا ہوں مگر یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی نہ پائی
بھی سمجھایا، جھگڑا ابھی کیا۔ مارا بھی، مگر اس کی حرکتیں بڑھتی ہی گئیں۔ میں بڑے پختہ
کر سکتا ہوں مگر چلنی بدداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے فصل

گھر پر۔ ماں کی چھینٹیں سن کر اس نے کلباڑی پھینک دی۔ اور کئی بازوؤں نے اُسے جکڑ لیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بالکل کوشش نہ کی۔ جب نور افسور تھا تو اُس نے چیرمین کی طرف دیکھ کر تھوکا اور تحارت سے بولا۔

”ج صاحب! میلا فیصلہ تمہارے فیصلے سے زیادہ باعزت ہے؟“

اس لمحے سے لے کر آج تک اسے اپنے جرم پر ذرہ بھر بھی ندامت نہ ہوئی تھی، مندر چلا پھانسی کی سزا ہوئی، اپیل کی گئی وہ نامنظور بھی ہو گئی اس میں کافی دقت لگا لیکن اس دوران وہ لمحہ بھر بھی نہیں بچتا یا۔ آج اسے بتایا گیا تھا کہ دونوں کے بعد اسے پھانسی دی جائے گی اور پچھلے دو گھنٹوں سے وہ ان سارے واقعات کو یاد کر رہا تھا۔ جن سے گزر کر وہ یہاں پہنچا تھا۔ مگر اس ساری یاد میں باپ کے لئے کوئی ہمدردی نہ تھی جس نے اس کی ماں پر محض اس لئے بہتان لگا یا کہ وہ اپنے مقاصد کو چھپا سکے۔ وہ اس کی نظر میں بدترین دیا کار تھا۔ اس کے منہ سے نہ ایک گالیاں اُبھریں پھر وہ سنبھلا اور بل پل کر قرآن مجید پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ سو یا نہیں تھا۔ ویسے ہی آنکھیں بند کر کے رات کے اندھیرے میں گم تھا اور سبچ رہا تھا کہ پھانسی میں کس قسم کی اذیت ہوگی جب اسے کوٹھڑی سے نکال کر لے جائیں گے تو اس کا رد عمل کیا ہوگا۔ کیا وہ ڈرے گا؟ لرزے گا؟ پھر اس کے چہرے پر تو برہ چڑھا دیا جائے گا اور نگلے میں پھنسا ڈالا جائے گا۔ سب چہرے چھپ جائیں گے۔ اندھیرا چھپا جائے گا۔ کیا دل نہیں گبرائے گا۔ تب تو ایک ہی انتظار رہ جائے گا کہ کب تختے زور سے آکر گر دیں پَر ٹکراتے ہیں۔ زندگی اور موت کے درمیان

تکے والے وہ آخری لمے کیسے گزریں گے؟ اور جب وہ مر جائے گا۔

”مگر کیا واقعی میں مر جاؤں گا؟؟؟ اس نے ہنسنے لگا۔ ”مگر اگر انکھیں کھول دیں مگر نظر اندھیرے سے مگر اگر کندہ ہو گئی۔ کوٹھڑی کا دبیز اندھیرا بھی، اسے موت کا پرہ محسوس ہوا۔ گھبراہٹ سے ایک دم جی متلانے لگا۔ کہیں سے روشنی کی ایک ہی کرن مل جائے۔ اس نے تڑپ کر چلو بدلا۔ سلاخوں والے دروازے کے پار پلنڈ کی روشنی میں دیواروں اور درختوں کے نقوش دیکھ کر اس کی ہمت بندھی اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا مگر وہ خود بخود تھا اور جس طرح پیاسا جانور پانی پر ٹوٹ پڑتا ہے وہی طرح وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاندنی کو ٹھنڈا رہا جیسے یہی اس کی زندگی کا واحد ثبوت تھا اور جوں ہی وہ آنکھ بند کرے گا تو پچاسی کے تختے زن سے گردن پر اڑیں گے۔

ماٹھے پر سے سرخس ہٹ چلتی ہوئی رخسار تک آئی۔ وہ من سے ذرا نیچے گرا۔
سے ہوتی ہوئی کندھے ہیں گھس گئی اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ اٹھایا۔ انگلی سے کندھے کو چھوا تو وہ گیلی ہو گئی۔

”پسینہ“ وہ زریب بڑبڑایا، اور تھکے اعتماد سے چہرے پر ہاتھ ملا

”اے خدا“ وہ ٹھٹھے پسینے میں شرابید تھا۔ بغیر محسوس کے۔ اس کی تپن گیلی ہو کر کر کے ساتھ جپک گئی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور جسم سے چپکے ہوئے کپڑے دست کرنے لگا تو ایک دم اس کا ہاتھ گرم نمی میں جا۔ خون زدہ ہو کر اس نے ٹھٹھا تو ٹھٹھی آہ بے اختیار اس کے ہون سے نکل گئی۔

اُس کا پاچا پریشاب سے تر تھا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دروازے کے قریب ہوا تاکہ وہاں میں کپڑے سوکھ جائیں۔ تب اس نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ وہ سوکھے پتے کی طرح کھڑکھڑا رہا ہے۔

اس نے چند لمحوں کے بعد اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر بے سود جسم کا ہر حصہ علیحدہ انداز میں دھڑک رہا تھا اور وہ بے بس ہو کر دوبارہ لیٹ گیا۔ چاندنی کو کھینے کی خواہش کے باوجود اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگیں۔ غیب سے نہیں بلکہ نقاہت سے۔

ایک دم اُسے کسی نے جھنجھوڑ ڈالا مگر بڑا کروں اُٹھنے لگا تو جیسے کسی نے سختی دی تھی اور وہ چکر اکر سلاخوں والے دروازے سے جا لگا۔ نکلے کھڑا رہنے کے انداز میں اس نے سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ادھر چپ چاپ کھڑے رہا۔ لیکن ابھی بمشکل کھڑا ہی ہوا تھا کہ ایک دم زور کا جھٹکا آیا اور دروازہ ایسی جھکٹ سے نکل کر باہر کی طرف گرا۔ وہ بھی سلاخوں سے چپکا ہوا مشہور چھیل گیا اور سنبھلنے سے پہلے ٹانگوں پر دو چار اینٹیں آن پڑیں۔ وہ اندر سے کراہا۔ اور سر کو سلاخ پر ڈھیلا جھنجھوڑ دیا۔ اس کے ہاتھوں اور رخت میں گرو کے بادل گھٹنے لگے۔

”جھنجھوڑ چال“ وہ بڑبڑایا۔

اور بے ہوش ہو گیا۔

جب اُسے دوبارہ ہوش آیا تو چاندنی میں سائے پہلے جیسے ہی تھے۔ فضا میں گرو اور دھول بھی بدستور تھی اور چیل کے دوسرے حصے سے شوق کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ اس نے اندازہ کیا کہ وہ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا۔

اس نے گردن ہلاتی۔

پھر باری باری بازوؤں کو حرکت دی۔

ڈرتے ڈرتے "انگلیں ہلائیں۔"

کہیں کوئی دردِ اعضاء نہ محسوس کر دیکھا تو اہٹائیں جسم سے لگ کر پڑے گریڑتی تھیں۔
وہ اچھ کر بیٹھ گیا کہ میں خدا سا درد محسوس ہوا مگر جب جسم کو ادھر ادھر دھرایا تو وہ معمولی
چوٹ لگی۔

اب اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔

موت کی سزا پانے والوں کی قربت ابھی کی کوٹھڑیاں گرمی پڑی تھیں۔ ساتھ دالے
کمرے کا قبیلہ تراپڑ اٹھا۔ بلبے میں اس کا بھیجا پیک گیا تھا باقی چیزیں واضح اور
صاف نہ تھیں کیونکہ گرد کا بادل پھیل چکا تھا۔ چاندنی کو چاٹ گیا تھا۔ جیل کے دوسرے حصوں
سے چیخ پکار کی آواز نہیں آرہی تھیں۔

انچانگ اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ اس کی زندگی کے دونوں بانی تھے۔
اگر وہ اس موقع سے فائدہ اٹھالے تو شاید اسے دوسری زندگی مل جائے۔ دوسری
سوچ کے بغیر وہاں سے چل دیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی پکڑا
جاؤں کو تو کیا فرق پڑے گا۔ وہی تو دن ہیں زندگی کے۔ اور وہ بھی قید تھائی ہیں۔
پکڑ کے قید کریں یا گولی ماریں۔ پھانسی سے بڑی سزا تو کوئی نہیں۔ وہ بھی سوچنا
چلا گیا۔

جیل میں افراتفری تھی۔ ایک دو بارکیں گرجھئی تھیں۔ اور سبھی لوگ زخمیں کھینچتے
رہے تھے۔ کچھ لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے کسی کی مدد کے لئے۔ کسی کو بلانے کے

لئے کوئی چیز اٹھانے کے لئے۔ ان میں سے اکثر گارڈ کو پکار رہے تھے۔ وہ بھی ان میں خلط ملط ہو گیا اور کہیں رکتا، کہیں بھاگتا کہیں دوسروں کو پکارتا اٹلکھ مچلی سی کھینتا رہا۔ اور ایک دفع موقع پا کر جیل کی بڑی دیوار تک جا پہنچا۔ جہاں تھوڑی سی تلاش کے بعد گرنا ہوا حصہ نظر آیا۔ اس نے رک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا نیز نہ چلتا ہوا وہ باہر نکلا اور گیٹ بھاگنے لگا۔

شہر کا حال یہ بالکل بدل گیا تھا مگر یہی ہونی عمارتیں۔ بیڑے میڑے بجلی کے کھمبے ٹوٹی ہوئی تاریں کہیں درخت سرنگوں کہیں سڑک میں وڑاڑیں فضا میں گرد ہی گرد گلیاں اور راستے پہچانے ہی نہ جاتے تھے۔ لوگ بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے کہیں زخمیوں کے کراہنے کی آواز میں خفیں کہیں ادا دیوں کو بلانے کا شور تھا بالکل حشر کا سماں تھا اور نفا نفسی کا عالم تھا چاند کی بھیگی گرد آلود روشنی میں اور بھی ہراساں لگتا تھا۔

وہ اب ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اس قتل کے علاوہ اس نے کبھی کوئی اور جرم نہ کیا تھا مگر اب مجرموں کی صحبت میں رہتے رہتے اس نے کافی سیکھ لیا تھا اور اب قسمت نے موقع بھی جیسا کیا تھا۔ کیونکہ اس نے جیل میں جتنا تھا کہ ہرگز نہ کی تواریخ بتاتی ہے کہ اس کے فوراً بعد جرائم میں ایک دم اضافہ ہو جاتا ہے اور زلزلہ زدہ لوگ اپنے نقصان کو بھول کر اپنے ہی جیسے مصیبت زدہ لوگوں کو ٹوٹا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے پر تل گیا۔

ایک آدمی کی ٹانگ بے میں دب گئی تھی اس کا اوپر والا دھڑلے میں تھا۔ اور وہ بے ہوش تھا۔ یہ بظاہر اس پر سے طے پاتا رہا لیکن دراصل اس کی قمیض نامردم تھ

تھوڑی ہی دیر بعد وہ کامیاب ہو گیا۔ اپنی قیدیوں والی قمیض اتار کر تار تار کر دی اور دوسری پہن لی۔ اپنے لئے دوسری زندگی لینے کی محنت میں وہ زخمی کی زندگی خطرے میں ہی چھوڑ کر چل دیا۔ ایک اور جگہ سے اس نے صندوق اٹھایا جس میں کچھ کپڑے اور نقدی تھی۔ اس کی اسکیم مکمل ہو چکی تھی اور وہ شہر سے باہر والی سڑک پر ہوا۔

نئی زندگی واقعی مختلف تھی۔ اس نے اپنا نام تبدیل کر لیا۔ ڈارحی بڑھالی چہرے پر خود ہی استرے سے زخم لگا کر بڑا سا نشان بنالیا۔ سڑک کے بال خرچہ کر پٹے بنائے۔ لوگوں سے الگ تھلک رہتا۔ نہ کوئی دوست تھا نہ ہمارا۔ وہ کہیں ایک جگہ جم کر کام نہ کرنا۔ چند روز ایک جگہ مزدوری کر لی۔ پھر کہیں اور خواجہ گانے لگایا کسی بیکیڈ کے پاس ایک جانا۔

یہ بہت ہی بے اور اکتا دینے والی زندگی تھی تنہائی اور خوف اس کے احساب کو ہر وقت بھاری بوجھ کی طرح دباتے رہتے زندگی کے میلے اپنی چوڑی آن بان سے رونق کے خباہٹ اٹھاتے مگر وہ شہر کے قاصر تھا کیا معلوم کس بگ قسمت کیا گل کھلا دے اور وہ پہچانا جانے وہ کھل کر تھکے گانے کو نہ سنا تھا۔ اس کو دل کسی ہمارا سے بے تکلفانہ بے حجابانہ باتیں کرنا چاہتا۔ مگر مجبور تھا۔ دوسروں کو سنتے دیکھ کر وہ ابھی بھرتا اور شاداں و فرحان لوگوں کی آنکھوں میں مارے دیکھ کر اس کی اپنی آنکھیں جھپٹے لگتیں۔

تین چار ماہ میں وہ تنگ آ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خاموشی سے جا کر اپنی ماں کو کال لائے اور دونوں کسی دور کے علاقے میں جا کر کھل کر زندگی گزاریں۔

سہ پہر کے سات بجے ہو رہے تھے جب وہ گھاؤں کے قبرستان پہنچا اس کا راز

تھا کہ اندھیرا ہونے لگا وہیں چھپا رہے اور رات کو جا کر ماں سے ملے۔ ماں کے لئے کے خیال سے ہی اس کی آنکھیں ٹوٹا دیا آئیں اور اس نے فر سے سوچا کہ میں نے مشکل وقت میں اپنی جان پر کھیل کر ماں کی حفاظت کی ہے۔

جہاں چھپا ہوا تھا اس سے کچھ دُور باپ کی قبر تھی۔ لیکن وہ ادھر نہیں گیا۔ اس نے فاتحہ بھی نہیں پڑھی۔ وہ ابھی تک اسے معاف نہیں کر سکا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے ان کا پردہ گھر اذیتا ہوا۔ اسے پچھانسی کی منرا ملی اور اگر خدا یہ عیب سے نہ بھیجتا تو وہ اب تک مرجھا ہوتا۔ اس کی نیک دل اور فرشتہ سیرت ماں کو گناہوں میں شرمناک نکتہ کی ذلت اُٹھانا پڑی اور ان کے اذلی دشمن جیسے ہیں کو ان پر جہنم کا موقع مل گیا۔ وہ سوچنے لگا سال بھر پہلے بھی وہ گناؤں آیا تھا اور محفوظ ہی دیر بعد کس ذلت سے گیا تھا۔ ہاتھوں میں مبتکڑی جسم پر خوں کے چھینٹے چھپے لوگوں کا جھوم۔ ساتھ ساتھ اس کی ماں روتی چلا تھی بین کرتی۔ بچے اس کی ہتھکڑیوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر گر تے ہوئے۔ اور وہ نامہوار قدموں سے چلتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ باپ کی ہوس نے اسے کہاں پہنچا دیا ہے۔ آج وہ پھر اپنے گناؤں میں آیا ہے لیکن چوروں کی طرح چھپ کر وہ بچپن کے ساتھیوں سے گئے نہ مل سکتا تھا۔ وہ ہر گھر کے سامنے ٹرک کر گھر والی بوڑھی سے دعا میں نہ لے سکتا تھا۔ وہ کسی مہمانے کے بچے کے سر پر پیار کے ساتھ ہاتھ نہ پھیر سکتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ہی گھر کھلے بندوں نہ جاسکتا تھا۔

حسروں کا گولہ اس کے حلق میں پھنسنے لگا۔ اس کی آنکھیں ٹوٹا دیا آئیں اور غیلی آنکھوں میں نفرت بھر کے اس نے اپنے باپ کی قبر پر بڑی ہی کڑی نگاہ ڈالی

اور پھر اس کے خیالوں میں ماں آگئی۔ نہ معلوم وہ کس حال میں ہوگی۔ روتے روتے اس کا صلیب بگڑ گیا ہوگا۔ لوگوں کے طعنوں کے تیروں نے اس کا سینہ چھلنی کر دیا ہوگا۔ وہ پیسے کی وجہ سے بھی تنگ ہو سکتی ہے۔ معلوم نہیں خوشیاں مزاح اسے حصہ دیتا ہے یا نہیں۔ نہ معلوم گاؤں والوں کا سلوک اس کے ساتھ کیسا ہے۔ اس کے ذہن میں ماں کی جو تصویر بھری تھی وہ انتہائی سوگوار اور لاغر تھی۔

شام ہونے لگی۔ ادھر ادھر سے فاختہ کی آواز آئی۔ بابا حاکم کے کنوئیں کی ریل میں سنائی دی۔ جہاں وہ اکثر شام کو نہایا کرتا تھا۔ طوطوں کے غول کے غول نہیں کرتے اس کے اوپر سے گزرنے لگے۔ بیزاری دور کرنے کو وہ ادھر ادھر مڑھٹے لگا۔ ایک جگہ وہ دیوار خدائوٹی ہوئی تھی۔ اس نے جھانکا تو گاؤں سے آنے والا اجاڑ راستہ صاف نظر آتا تھا۔ اپنے آپ کو اوٹ میں رکھنے کا مناسب انتظام کرنے کے بعد وہ وہیں بیٹھ کر رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

یہ راستہ ہمیشہ کی طرح آج بھی سسنا تھا کیونکہ یہ صرف گاؤں سے قبرستان آتا تھا اور پری سڑک دوسری طرف تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اس نے دیکھا کہ کماؤ کی فصلیں تیار ہونے کو تھیں جہاں کسانوں کو گندم کی کاشت کا تھی وہ کھیت خالی تھے کہیں کہیں کیا کاشت تھی مگر باقی سب گتا ہی تھا۔ ابھی فصل میں کچھ دیر تھی اس نے لوگوں نے رس نکالنے والے پیلے نہیں لگائے تھے ورنہ تو شام کو اس رستے پر غیب رونق ہوتی تھی۔ وہ کافی دیر خالی سڑک کو دیکھا رہا۔ کئی دفعہ کماؤ کے بے جان کھیتوں پر نظر ڈالی اور بالآخر اٹھا گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پیچھے مٹ کر آرام کرے کہ دُور سے اسے ایک شخص آتا دکھائی دیا۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک اور شخص نمودار ہو گیا۔ تماشے سے نابلد

خوف زندہ ہو کر وہ انہیں دیکھنے لگا۔ کیونکہ ادھر آنے والا یقیناً قبرستان آئے گا۔ اور اس کی موجودگی بھی نہ رہ سکے گی۔ جلدی سے ادھر ادھر چکر لگا کر اس نے چھپنے کی جگہ تلاش کی اور پھر گردن نکال کر دیکھنے لگا۔

چند ہی ثانیوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ عورت نے دیہاتی لوگوں کی مخصوص دھواں بھنی ہوئی تھلی جو نیل میں بار بار رنگنے سے کالی ہو جاتی ہے مگر اس کا کنارہ سُرخ تھا اور دیا ہی کرتہ تھا اور سر پر کھٹے ہوئے سُرخ رنگ کی چادر تھی۔

وہ کون ہو سکتے ہیں؟ اس نے کتے ہی اندازے لگائے۔

وہ سوچتا کہ یہ فلاں لوگ ہونگے یا کس ان کی کوئی حرکت یا چال دیکھ کر:

خیال بدل لیتا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے مگر تنہا دیر میں نزدیک آگئے

اور آتے گئے۔

وہ ایک دم ہڑخرا کر اٹھ بیٹھا۔ جیسے اُسے بجلی کا جھکا لگا ہو۔ حفاظتی حدود

سے اندر ہی اندر وہ جتنا اُگے جھک سکتا تھا جھک کر باہر آگیا اُس نے آنکھیں

پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ چال پر غور کیا۔ جسم کے حجم کو دیکھا۔ کپڑوں کا اسٹائل پرکھا۔

اس نے کبھی دیوار کو اتنے نزدیک سے پکڑا کہ انگلیاں مٹی میں دھنسے گئیں اور اس

کے منہ سے دلی گھٹھپین نکل گئی۔

شماں! اُ!

اس کی آنکھیں گریبا ہر آ رہی تھیں۔

چلتے چلتے دونوں بالکل قریب آ گئے۔ ہوا کے جھونکے ان کی کنگھڑوں کے اُونچے
 الفاظ اٹھا کر اس تک لاتے مگر دُوری کی وجہ سے وہ سمجھ نہ سکتا تھا۔ ایک جھونکا
 ماں کی ہنسی اٹھا لایا۔ مانوس تازہ اپنائیت کا انداز لے۔ وہ تھوڑا مستعجب ہوا۔
 کیونکہ اس میں سوگاری کی جھلک تک نہ تھی بلکہ کینٹی ہوئی بھرپور ہنسی تھی۔
 مگر اس کے ساتھ کون تھا؟

اس نے خود سے دیکھا اور اس کے جسم سے جان نکلنے لگی۔ وہ فضل ماشکی تھا۔
 حیرت اور غصے سے اس کے پیٹ میں مردِ رُٹاٹھنے لگا۔
 ”فضل ماشکی“ وہ بڑبڑایا ”فضل ماشکی؟“

اس کے دماغ میں بدترین دوسوں نے سُنا تھا یا۔ مگر وہ ابھی تک قبل کرنے
 کو تیار نہ تھا اور بالکل سچتر کابت بنا انہیں دیکھ رہا تھا جو قدم بہ قدم بڑھے آ رہے تھے۔
 وہ جھول چکا تھا کہ اسے اپنے آپ کو چھپانا ہے اسے کوئی حوش نہ تھا کہ دیوار
 کا سہارا لیا ہے یا نہیں۔ اس کی ساری حیات آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں اور
 وہ منہ کھولے دیکھے جا رہا تھا۔

اب وہ دونوں اس سے چار کھیت دُور تھے پہلا کما دکا تھا۔ دوسرا خالی تھا
 اور سادہ ہی ایک دامنہ اندر کو مڑنا تھا۔ اگلے در کھیت کساو کے تھے۔

وہ آگے چلتے آئے۔ پہلا کھیت ختم ہو گیا۔ دوسرے کے ساتھ چلتے چلتے ان کے
 قدم رکنے لگے اعنفوں نے دے انداز میں مشورہ کیا اور پھر اسے اپنی آنکھوں پر
 یقین نہ آیا۔ مگر وہ کیا کرتا۔

فضل ماشکی نے عورت کا ہاتھ پکڑا۔ دونوں نے ادا حرا دھڑکیا اور کھیتیں

کے اندر جانے والے کچے راستے پر مڑ گئے۔

اب وہ کساد کی اوٹ میں تھے اور وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔

سب کچھ بھول کر اس نے ایک جست لگائی۔ دیوار پھلانگ کر سڑک پر لگید۔ سڑٹ دوڑتا ہوا وہ کیفیت کی ٹکڑ ٹکڑ کیا اور رک کر جھانکا۔ دونوں کساد والے کیفیت میں گھس رہے تھے۔

بغیر سوچے سمجھے اس نے بے پاؤں چکر کاٹا اور دوسری طرف سے اسی کیفیت میں داخل ہو گیا۔ پھر بتلی کی سی ہوشیاری سے آگے بڑھا۔ قدم قدم چپ چاپ ایک ایک اپنچ۔

ایک نوم ماں کی سنہری کی آواز آئی اور وہ وہیں دبک گیا۔ کساد ہونے سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ ان سے دوہی تین گز دور ہوں گے۔ وہ دونوں سرگوشی میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ اور کان کھڑے کر کے سننے کی کوشش کرنے لگا۔

.....

فضل کی آواز میں تندہی اور بے صبری تھی یہ فکر نہیں۔ اور لے دوں گا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ اور وہ دم سادھے پڑا تھا۔

اچانک فضل بولا۔

”تو ابھی ادھر ہی رہ۔ میں چلا جاؤں تو تو دوسری طرف سے نکل جانا“

اور کساد ہونے لگا۔

وہ دم سادھے پڑا رہا۔ تیز دھاروں والے تلوں سے اس کے چہرے اوڑ

بازوؤں پر کئی خراشیں آئیں مگر اندر سے دل جیسے کسی نے تیز چھری سے چھید دیا تھا۔ اس کے ذہن میں حشر برپا تھا۔ یہ سب کچھ کیا تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ لیکن اس اندرونی طوفان کے باوجود اس کے بازو شل تھے اور قوتِ عمل غائب تھی۔ اس نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ ابھی اٹھ کر ان دونوں کو دو بچ لے مگر اس کا جسم داغ کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے احصا ب قابو میں نہیں ہیں۔ گٹھنوں کی اس کمیں گاہ میں بخوڑی دُور اس کی ماں بیٹھی تھی اور اس تمام سانچے سے بے خبر تھی جو اس کے جوان لڑکے پر گزر چکا تھا۔ بخوڑی درپردہ باہر نکلی ہوئے ہوئے بنے پڑ گئی اور جھک کر نہر کی چھوٹی تالی میں منہ ہانڈ دھونے لگی۔

”ماں!“

وہ تڑپ کر مڑی۔ اور اس اجنبی کو حیرت سے دیکھنے لگی جو ابھی وہاں تھا اسے ماں کہہ کر پکا راتھا اور اب اپنی شعلہ باز آنکھیں کسی جلاؤ کی طرح اس پر جھانکے تھا۔

دارھی۔ چہرے پر زخم کا داغ۔ پگڑی

یہ کون تھا۔ ؟؟؟

گمراہکھوں کی بناوٹ۔

اور ناک کا خم۔

ماں کی آواز۔

وہ پہچان گئی۔

پھر وہ دونوں ان بھاری لمحوں کی گرفت میں آگئے جہاں وقت ٹرک جتا ہے۔

دوسرے پاؤں تک لہڑا رہا تھا۔ جیسے آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کو بہا
 ٹھکنے کا راستہ نہ ملے۔

وہ کہتے ہیں تھی۔ مرا ہوا بیٹا زندہ۔ اور میاں فضل ہاشمی۔ بیٹا؟

لاوا پھٹ پڑا "ماں!!! میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔" دونوں مٹیوں پر
 کراس نے ہوا میں لہرائیں اور زور سے رانوں پر دو ہتھڑا مارتے ہوئے چکر اکر
 بیٹھ گیا۔ پھر دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک دیئے اور زار و قطار رونے لگا۔

عورت کے چہرے کے رنگ بدلتے رہے۔ نہ معلوم کس کن خیالات کے زیر اثر
 جہاں جنسی خیالات کا معاملہ ہو وہاں عورت کے دل کا راز پانا قطعی ناممکن ہے۔
 ایسے وقت اس کا چہرہ آئینہ منس۔ بلکہ پردہ بن جاتا ہے۔ گریٹے گواں کی طرف
 دیکھنے کا کوئی ہوش نہ تھا وہ کلینے اپنے جذبات سے مغلوب تھا۔

"بیٹا، دل نہ خراب کرو چند لمحے بعد وہ بولی "میں تمہیں سب بات سمجھا دوں گی۔"
 بیٹے نے زور سے انکار میں سر ملایا۔ وہ آنسو روکنے کی شدید کوشش کر رہا
 تھا۔ جو اسے بولنے نہیں دیتے تھے۔ مگر وہ کچھ کہنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔
 عورت اسے گونگی حالت میں دیکھتی رہی۔

"بابا... ٹھیک...." وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا اور سخت مایوسی کے عالم میں
 دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھک لیا۔

ماں اسے دیکھتی رہی۔ اسے سمجھ نہ آتی تھی کہ کیا کہے۔

ایک دم اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور ماں کی طرف ہاتھ پھیلا کر بولا۔
 "ماں تم نے بابا کو مجھ سے مروا ڈالا۔ تم نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟"

عورت اب سنبھل چکی تھی۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا؟
تو یہ فضل ماشکی.... وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

یہ تمہارے باپ کا تھنڈ ہے بیٹے۔ عورت سنبھل چکی تھی جس عورت پر میرا زور
تمہمت لگائی جاتے اور وہ بھی خائفہ کی طرف سے اور پھر اس کا کوئی سہارا نہ رہے
نہ لوگ۔ نہ خاوند۔ نہ بیٹ۔ تو وہ پھر اس تمہمت کا ہی سہارا لے سکتی ہے اور
کون اسے منہ لگائے گا۔ میں نے تو فضل کا کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ مگر وہ مڑ گیا۔
تم لاپتہ ہو گئے جیل والوں نے کہا کہ زلزلے میں مر گئے ہو۔ لوگوں نے ہر وقت
فضل کا نام میرے منہ پر مارا تو میں اسی کی پناہ نہ لیتی تو کہاں جاتی؟
اس نے اپنے ہاتھ بیٹے کی طرف پھیلا دیئے۔

بیٹے نے چند لمبے ماں کو غور سے دیکھا۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھا اپنی
ماں کو زور سے دھکا دیا اور خود بھاگتا ہوا کھیت کا موڑ مڑ گیا۔
اس نے پیچھے سے ماں کی پکار سنی مگر وہ سر پٹ بھاگتا گیا۔

بھاگتے بھاگتے اس کے ذہن میں باپ کا وہ چہرہ ابھر ا جو بیٹے کی کھلاڑ
کا پہلا وار روکنے کے لئے دو ٹوٹے بازوؤں میں پناہ لے رہا تھا۔ اس چہرے پر
حیرت تھی۔ استعجاب تھا۔ خوف تھا۔ اور معصومیت تھی۔ وہاں دیا کاری نہ تھی۔
قبرستان کے پاس پہنچ کر دیوار پھلانگی۔ تیر کی طرح باپ کی قبر پر گیا، اس
پر اوندھے منہ گر پڑا اور اس کا اندرونی کرب ایک چنچ بن کر نکلا۔

”بابا!!! مجھے بتاؤ کون سچا ہے؟“

پھر نرم مٹی میں ناخن کھینچتا ہوا وہ بلب بلب کر دیا کہ ارد گرد کے درختوں

سجھ ہی اڑ گئے۔

تین دن اور تین راتیں وہ پاگلوں کی طرح گھومتا رہا۔ اور اس سوال کا جواب
سنان نہ کر سکا، اندھیری گندی نالیوں، نیلے آسمان، چاند سورج اور پرندوں سے
پوچھتا رہا۔ مگر کسی انسان سے نہ پوچھا۔ جو قابل اعتبار مخلوق نہ تھی۔

چوتھے روز صبح وہ پولیس اسٹیشن میں تھانے دار کے سامنے کھڑا تھا اور بڑے
ہی غیر جذباتی سپاٹ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”میں جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہوں مجھے پچانس کی سزا ہوئی تھی۔“

”ادراک“ لاہور

گشتی

پُرودہ ہٹاؤ۔ چم سے اندھا گئی۔ نیک سائیں باہر نیچے میں بیٹھا دیکھتا ہی رہ گیا، ایک ایک شعلہ لپکا اور آنکھوں میں دھول جھونک کر سامنے سے گزر گیا۔ جتنی چہنی شعلہ ہی تو تھی لیکن اس وقت اُس کے دیکھتے ہوئے چہرے پر گرو کی مہین سی تہہ چڑھی تھی۔ نیم پریشان سنہری بالوں میں راتے کی مچلتی ہوئی دھول نکل رہی تھی اور اب عُنس میں ابہام کی کیفیت، گنگنی تھی جس نے ذرا پردے میں ہوا تو اس کا جاؤ اور بڑھا۔

جس گھر کو ٹھکر اگر گئی اس نے پھر خر مقدم کیا۔ میز پر ریڈیو کے قریب اس کی تصویر پر ہار پڑا تھا۔ خالیچے کے رنگ اسی طرح چمک رہے تھے۔ اور اس میں نما کا سلوٹ نہ تھا۔ الماری میں کراکری قرینے سے دھری تھی۔ کمرے میں کیسں حال تھا نہ مٹی تھی۔ کاٹھ کے چوکھٹے پر چڑھا ہوا آئینہ بالکل صاف تھا اور جب برقع آنکھ کے مقابل کھڑی ہوئی تو وہ اس کے بھر پور بدن کے جاؤ سے جگمگا اٹھا۔ بڑی

بڑی پھیلیاں آنکھوں سے افق تا افق اُجھالے پھیل رہے تھے۔ پھر جب اس نے
 نکلنے کو دیکھ کر کوننگی بائیں سر سے اُپر اٹھائیں اور اٹھکیوں میں انگلیاں
 اکھنائیں تو آئینے کی حد میں پھلانگ گئی۔ اسے اپنے بدن کی دھکتی پہنی شان
 دیکھنے کے لئے کچھ پیچھے ہٹنا پڑا۔ انگ انگ میں چمکتا ہوا آئینے کی رنگوں میں
 نکلا۔ اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ جان گئی کہ نیک سائیں اس کے لمو
 کی مار سے نہ سکے گا لیکن فارم میں آتے آتے تھوڑا بہت وقت ضرور گئے گا۔
 وہ چپکے سے بستر پر راز ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں مسج لیں، کان کھلے رکھے۔

نیک سائیں سُکرا یا۔ وہ تکیے کا بادشاہ تھا۔ اس کی رعیت میں چند تھابا،
 چند نو سیراز، چند گرہ کٹ، چند کرجان، گاڑیاں، چند گویے، ایک سناڑا، ایک لہڑ
 ایک پھیرا، ایک بڑھئی اور چند شاگرد پیشہ رو کے شامل تھے۔ ان میں کچھ سولوک
 کی منزلیں ملے کر کے ملنگ بن گئے، کچھ ملنگ کا مقام پانے کی آرزو لئے رہے
 اور کچھ کے نزدیک تکیے کو کلب سے زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی۔

بادشاہ سُکرا یا۔ اپنی نیم جہان رعایا کو تکیے کے کشادہ آئین میں چاندوں پر
 دیکھ کر شوکتِ شاہانہ دو بالا ہوئی اور حیات کے احساس نے اُسے زمین سے اُبلت
 بھر اُٹھا کر دیا۔ حالانکہ نیتی پیرنی کی آمد سے پہلے وہ بھنگ کی ترنگ میں زمینی سے
 پاشت بھر نیچے چلا گیا تھا۔ ویسے وہ راج سنگھاسن پر براجمان تھا۔ بھنگ کی
 مستی نے حکم کر دیا تو وہ اور موتی شاہ دونوں ہنسنے لگے اور جوں جوں ہنسنے مستی
 سوا ہوئی اور کچھ دیر کے بعد بے طوہ ہو گئے۔ وہ بھول ہی گیا کہ نیتی پیرنی آئین
 پر کراس کے سامنے سے کمرے میں گئی ہے شکست کی ندامت نے اُسے بدو

لیا ہے۔ یہی ندامت چُپ کی صہ بن کر اس کی زبان پر لگ گئی۔ ہوا چلی تو اس کی شان سکندری میں کچھ اور جھلکا پن آیا۔ بکھرے ہوئے حواس جمع کئے۔ اس نے کھانسن کھٹاکر گر گئے کا ساز شمع کیا اور بدن کو بھجھوڑا تاکہ چُست ہو جائے۔ اور فاتحانہ انداز میں مکالمہ ادا کر سکے۔ اب اس نے اپنا راج سنگھاسن محسوس کر لیا وہ اُد پنے جو بڑے پر اپنے وزیر باتدیر — موتی شاہ کے ہمراہ بیٹھا تنہا بیٹھے رہا یا اوندھے موندھے پڑی تھی۔ جو ہوش میں تھے اُن کی آنکھوں میں خوابوں کے حسین جزیرے بیکل تھے، جو بے ہوش تھے۔ تکیے کا کُتا بولی اُن کے نشیلے سانس کی بڑا سونگھتا پھرتا تھا۔ سدہ دری میں اس کا سکھا یا سدھایا ہوا قادی بچی مار جوا کھیل رہا تھا۔ دتہ بن لڑکے جو غنڈوں کا کیرئیر اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے تربیت کی پہلی منزل طے کر رہے یعنی ڈنٹر پیل رہے تھے۔ بادشاہ تکیے کی ایک سمت سے گردن گھٹاتا گھٹاتا دوسری سمت لے گیا۔ یوں اعتماد اور توانائی بڑھتا گیا۔ اس نے قہقہہ لگایا اور پھر اپنے وزیر باتدیر سے کہا: ”جستوں دی کھوتی اوتھے آن کھوتی“

کانوں کے پردوں پر ضرب پڑی اور غصے پیرنی تھملائی۔ گالوں پر خشتاک سرخی پھیل گئی لیکن شنی اُن شنی کر گئی۔ اندھے جواب نہ آیا تو بادشاہ کا حوصلہ ٹرھا۔ اُس نے پھر وزیر باتدیر سے کہا: ”موتی شاہ! دیکھا ہے پھر آگئی۔ اُسے شکوہ کی روٹی اچھی نہیں لگتی۔ یہاں آبرو سے رہنا پسند نہیں۔ کوئی بوجھے میری بادشاہت میں کس شے کی کمی ہے۔ میری تدو نہیں اُسے۔ بارڈر قدموں میں ہے۔ وہاں جا کے پوچھے کس پاتے کا اسمگلر ہوں۔“

جب نیک سائیں کی بیخ گوئی کا سلسلہ طرہائی ہوتا نظر آیا تو منتی کے چہرے کی خشناک مٹری شعلہ بنی، شعلہ اُچک کر زبان پر آیا۔ جلال میں آئی کچھ دیر کے لئے وہ عورت بن گئی تھی اور اب جو صورت حال پیدا ہوئی تھی۔ اس سے عورت نمٹ سکتی تھی۔ وہ آپے میں آئی۔ عورت چمک کر رنڈی بن گئی اور چمک کر بولی، بکو اس بند کرے گا کہ یونہی شروع رہے گا۔ خیرین کی طرح گھبرا گئی ہوں تو کیسے کا دماغ ہی چل گیا جانے کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو؟

عورت کو دیکھ کر وہ پچ پچ بادشاہ اور تاج بن گیا اور اس کا دماغ چل گیا تھا۔ لیکن جب رنڈی سامنے آئی تو بھاگ کی طرح پیٹھ گیا، بلکہ تھا، ہوا نکل گئی اور ختم ہوا۔ یہ جمیلہ نہیں تھی جسے ڈانٹ لیتا، مار پیٹ لیتا اور وہ منہ صو کر ہی احتجاج کی رسم پوری کر لیتی جمیلہ عورت تھی اور عورت کے پاس آفسو سے آگے کوئی ہتھیار نہیں ہوتا۔ نیک سائیں بہتہ جھوٹ تھا لیکن جمیلہ کے بجائے جب چمکتی دکتی رنڈی سے مقابلہ ہوا تو بادشاہ کے سارے کس بل نکل گئے تھے چن اٹھا کر بکھرے ہوئے بالوں کے منہری جلال اور پرشکوہ چال سے باہر آئی تو وزیر باندہیر روم و باکر ایک طرف چلا گیا۔ نیک سائیں نے سمیٹنے کے لئے سرگرمی کا لمبا کش لیا اور پھر جب رنڈی نے دودھ سے چلا کر کہا: اٹھ وہاں سے اندر چل۔ تو بادشاہ سلامت کو دھرتی کے ٹھیلے پلہ باندھا مشکل ہوئے بلکہ پلہ پلہ ڈھیر ہی ہو گیا۔

”ابھی لے سو بیٹے تو تو یونہی تھا جوتی ہے“

بادشاہ مکرے میں چلا گیا۔ اب وہ ایک پری کے حضور میں تھا جسے شیشے

میں اتارنے کے لئے قد آدم شیٹہ سامنے ہی دھرا تھا اور لٹڈی کو تل سے کڑھ
سج سنور رہا تھا۔

”یہ باہر بیٹھ کر کپکنے کی تجھے کیا عادت ہے؟ تیری زر خرید لٹڈی تو نہیں،
تیری میا بہتا تو نہیں۔ نخرے دکھا جا کے جمیلہ کو! رو رہی ہے تیری جان کو! میں
تیری میا بہتا نہیں؟“ پری نے بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے کہا۔

”ارے اپنے نصیب میں میا بہتا کہاں؟“ ٹیکے کی زندگی ہے اور سوسو
ویدلاریاں ہیں۔ کیسے کوئی میا کرے ہم سے؟“

”میا تو تیری ماں نے بھی نہیں کیا، تو کیا کرے گا؟ جمیلہ نے میا کا
مزا چکھ لیا۔“

”چل چھوڑ خضے کی باتیں بھاگ بھرے!“

سامنے کی الماری کے پٹ چوٹ تھے اور وائٹ ہاؤس کی بوتل کے پیچھے
میں شراب چمک رہی تھی نیٹی نیٹ پی گئی مستی نیٹی پیرنی کی آنکھوں میں آئی
اور دل نیک سائیں کا ڈولنے ڈوبنے لگا۔

وہ چن اٹھا کر باہر نکلی۔ وزیر باتدیر پھر چوتھے پر آ بیٹھا اور جاہلیاں
لینے لگا۔ وزیر باتدیر سے رجوع کرتے ہوئے بولی، ”کتنی دے پترا! بازو سے
تیرا باپ سودا لاکر دے گا۔“

”ہی ہی ہی سرکار! باپ تو میری ماں کو ہی سودا لاکر دے سکتا ہے۔
تیرا سودا تو میں لاکر دوں گا۔“

اور پھر وہ لٹکھڑانا لٹکھڑانا بیس گز کے فاصلے پر تیس بار گرتا پڑتا آلا۔

وہ بولی ”گنجر بنگ بھی پتا ہے تو تاجے کی پٹھ والی۔ پھر منجلا بھی نہیں جاتا۔“ گنجر ہی ہی کرتا رہا۔ اس نے لات ماری تو وہ اوندھے مونہہ گرا اور پھر گھٹنے سہلاتا سہلاتا اٹھا۔ دس کانٹ لایا اور بازار چلا گیا۔

غسل کے بعد وہ صیقل کی ہوئی تلوار تھی۔ ایک انگ سے تھکن نکل گئی۔ اب وہ گھر کی مکد تھی بلکہ یہ گھر اسی کے لئے بنایا سجا یا گیا تھا۔ نیک سائیں کو اسی کی معرفت اس گھر سے دلچسپی تھی اور نیتی پرانی کو اسی گھر کی معرفت نیک سائیں سے دلچسپی تھی جمید کو ترک کرنے میں اس گھر کا بھی ہاتھ تھا۔ دراصل لندن کو نیکہ اور اس گھر نے بل کر جمید کا گھر اجاڑا۔

نیک سائیں نے میز پر بوتل دھری اور دونوں نے بل کر سرگرت سٹلا لیا۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئے۔

”کیا حال ہے بھتی کا؟“ نیک سائیں نے بوتل گھاس میں اُندھتے ہوئے پوچھا۔
 ”اڑکیاں اور رنڈیاں ایک ہو گئی ہیں۔ سب ٹیڈی بن گئی ہیں۔“

”آب تو پیہ بھی ٹیڈی ہو گیا ہے۔ جیسی تو قدر نہیں رہی کسی چیز کی؟“

”خاک قدر ہے کسی چیز کی؟ یہ چودھویں صدی ہے۔ چودھویں صدی۔“

”جی اجڑ رہی ہے لیکن ہٹل کھل رہے ہیں۔ گھر گرسٹینس پر لگتا

سیکھ رہی ہیں۔“

”مطلب یہ کہ شریف اور بد معاش ایک گھات پانی پینے لگے ہیں۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو گیا ہے زمانے کو، کھاتے پیتے گھروں کی یہ

لڑکیاں! یہ رنڈیوں کی اولاد خنڈی ہیں لیکن ان کے اندر کسی باگی رنڈیا

جاگ اٹھی ہیں؟

نیک سائیں حقیقت حال سے آگاہ تھا اور ٹیڈی اِزم کا حامی۔ جب سے عورت ٹیڈی ہوئی اسمگلنگ کا دھندا بڑھا اور پھر ہر عورت رنڈی تھی، رنڈی عورت۔ کوئی عورت کم جوتی ہے رنڈی زیادہ، کوئی رنڈی کم جوتی ہے عورت زیادہ۔ جوتے جوتے کی بات ہے لیکن عورت سے زیادہ ٹیڈی رنڈی کے قریب ہے اور قرب قیامت کی یہ بھی ایک علامت ہے۔

نیتی پیرنی نے ایک پیگ چڑھایا اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: ”سہرہ رنگ نہیں، اُستاد نہیں۔ اب ان ٹیڈیوں کو کون نکیل دے؟“

”جیتے اِزمانہ تو دیکھ کون سا آن لگا ہے۔ اب تو عورتیں مردوں کو نکیل دیئے پھرتی ہیں۔“

عورت گھر سے باہر نکل آئی ہے۔ ہر طرف تماشا ہونے لگا ہے۔ اب وہ کیا خالی گھر میں رہے؟

”جہاں عورت وہاں مرد!“

”گھر خالی ہوا ہے میں، ہوٹل آباد ہو رہے ہیں۔ جتنے زیادہ ہوٹل بڑھتے ہیں اتنے ہی گھر خالی ہوتے ہیں۔ ہوٹلوں میں دل سبلا دے کے کھلونے مل جاتے ہیں مردوں کو؟“

”بہن! تو خواہ مخواہ نام بدنام ہے۔ اسے سرکار تو ڈھی دے تو اچھا ہے۔“

”بہن! ٹوٹ رہی ہے۔“

”بہن! ٹوٹنے کی خبر مرنیک سائیں کو دلی طور پر خوشی ہوئی۔ اس کی تو

اگر زوہی یہ تھی کہ تہی کی اینٹ توٹ کر اس کے چوبارے میں لگ جائے اور پھر
نیتی پیرنی ہیں کی ہو رہے۔ اس نے تو منت مانی تھی کہ جس دن تہی توٹی وہ چلیں
چڑھائے گا۔

ایک مدت تک تکیے کا خوشناکرہ مسنان چارہا لیکن نیتی پیرنی کے قدم
دھرتے ہی ٹسکرانے، جھلگانے لگا۔
رات انتہائی دلغز بھی سے آئی۔

رات آئی، رات جب کچھ لوگوں کے دل بیدار ہوتے ہیں، جو سو جاتے ہیں
اُن کی روحیں دیرانوں میں بھٹکتی پھرتیں یا پھر اُردانوں کے جزیروں میں نیتی
پیرنی کا بدن بیدار تھا اور اس کے لہو کی حرارت شراب کے شعلوں کی لپک
سے ہم آہنگ تھی بھٹکتی ہوئی، اس کے پٹے کی چراغد کمرے میں جذب
ہونے لگی اور پھر نیک سائیں کے جذبات نے بھی ٹوٹ پڑی۔ دونوں شراب
کے نشے میں چلنے لگے۔ رات بھر چتا جلتی رہی۔ چراغ اُڑتی رہی۔ صبح ہوئی تو
چتا بجھ گئی اور دیرِ بختہ بدنِ قالین پر اُدھ موٹے پائے گئے۔ قریب ہی
شراب کے برتن پڑے تھے۔

باہر تکیے میں نصر و حسب معمول ڈنٹر پینے کے بعد ہاتھوں سے اپنی جھکیلی
رانیں آہستہ آہستہ گرزور زور سے مسل رہا تھا۔ اُس کی پیشانی پر سینے کے
قطرے آویزاں تھے۔ بدن پر جوانی چمک رہی تھی۔ وہ ہر روز بڑے خضر و خضر
سے پڑتے آکر پہلے بدن کی مالش کرتا، پھر کسرت کرتا اور آخر میں رانیں مسلتا
یہ اس کی عبادت تھی۔ اسے یہ نکتہ اپنی طرح معلوم تھا کہ خضرِ اول کا خضر

بننے کیلئے بدن کمانا پڑتا ہے۔ البتہ یہ کہیں اسے معلوم نہ تھا کہ بدن کا بائیس ایک سو کو چیت کرتا ہے۔

اس کی ساری سوچ ایک ہی نقطے پر سمٹ آئی اور وہ گرد و پیش کی دنیا سے بے خبر اپنے بدن کی فسادابی اور لہو کی تابانی کے نظارے سے آپہاں ہی چیت ہونے لگا۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ نیتی پیرنی اسے تک رہی ہے۔ بل بھر کو اس کی نگاہیں اس کے بدن سے نہ نہیں۔

نیتی پیرنی خوش ذوق تھی۔ وہ بھی حسن و جوانی کی نگہداشت کے راز سے آگاہ تھی۔ قدرت نے اُسے اچھا بدن دیا تھا، اچھے شکل و صورت عطا کی تھی۔ اس کے نزدیک اسے نکھار سنوار کر رکھنا کا یہ ثواب تھا اور کارساز کی منشا کے مطابق انہیں بگاڑنا گناہ تھا۔

نصرد کو دندش کرتے دیکھ کر نیک سائیں بھی مسرور ہوا۔ کبھی نصرد میریں ساڑھ کا تھا۔ اس کی ہڈیوں پر گوشت کے بغیر ہی پھڑہ مڑھا تھا۔ نیک سائیں کے زیرِ ہدایت نصرد نے گوشت پوست کو ترقی دی۔ یوں نئے نصرد نے جنم لیا۔ نیا نصرد درحقیقت نیک سائیں کی تخلیق تھا۔

نیک سائیں کے بدن پر صرف لنگوٹ تھا۔ ہاتھ میں تپیر سوپ کی ٹکیہ تھی جو جاندی کے سوپ کہیں میں دھری تھی۔ نیک سائیں کا لنگوٹ دیسی وضع کا تھا لیکن مزاج بالکل دلالتی تھا اور یہ دلالتی مزاج اسے لٹدی کوتل سے جلاتھا۔ لٹدی کوتل اس کے تھرموں میں تھا۔

موتی شاہ نے بھی حسرت بھری نظروں سے نصرد کا بدن دیکھا۔ اس کے

دل میں اُمنگوں کا طوفان چل گیا اور اس طوفان کے گرد ماضی کے دھڑکے لپٹ گئے۔ نورو کے بدن میں بھلیاں ترپ رہی تھیں اور ان سے پھوٹتی ہوئی جوت اس کا مستقبل جگمگا رہی تھی۔ موتی شاہ بھی کبھی یوں ہی جوان تھا اور اس کے بدن نے بھی کبھی جوانی کے سیل بے پناہ کو پناہ دی تھی لیکن پھر جو جی مر گیا اور اسے تکیہ کھانا گیا۔ رنڈی کو چوبارہ کھانا جاتا ہے۔ غنڈے کو تکیہ۔ رنڈی چوبارہ نہیں چھوڑتی۔ غنڈہ تکیہ نہیں چھوڑتا۔ انہیں بیٹھنے کو تو ضرور جگہ چاہیے تھی۔

جو جی حسین اور نازک مزاج تھا۔ لانا قدا پتلا جسم بڑی بڑی آنکھیں داشت چمبے کی کلیاں۔ ہر وقت منہ سارہتا۔ موتی شاہ اسی ادوار فریفتہ تھا۔ جو جی کو اختیار تھا کہ بازار کی جس دکان سے چاہے سودا لے۔ جو چیر چاہے اٹھا لے۔ جسے گالی دے وہ ٹپ چپا پٹس لے۔ جسے بیٹھا چاہے وہ شرافت سے پٹ جائے۔ اس کی پٹائی میں موتی شاہ کی صرف وجاہت ہی شامل نہ تھی۔ اس کے کمائی دار چاقو کا دبدبہ اور خوف بھی شامل تھا۔ جو جی کبھی جلال میں آتا تو اس کا گلابی چہرہ تمنا کر لال گلاب بن جاتا اور پھر دیکھنے والا اسے گلے لگنا چاہتا تھا اور یہ جلال تو بس گھڑی دو گھڑی ہی کا ہوتا، پھر وہی لال شعلہ گلابی تاؤ بر آجاتا۔ جو جی کیا بُرا، بازار مر گیا۔ موتی شاہ مر گیا۔ اس کا جنازہ اس وحوم سے نکلا جیسے کسی ہیرو کا جنازہ ہو۔ موتی شاہ دل شکستہ ہو گیا، ہاتھوں میں سکت نہ رہی۔ اس نے کمائی دار چاقو پھینک دیا۔ تکیے کی مٹی میں مل کر مٹی ہوا آج جو اُس نے نورو کا سجرہ بدن دیکھا تو وہ تلوار تھا۔ اس کے بدن میں نورو کا بدن ہلکورے بیٹھ لگا۔ اس کے بدن میں لعل سی مچی۔ اس نے ہوا میں باند لہرا

کھڑے کھڑے دوڑ لگائی۔ نفرد اس حرکت پر ہنسا اور پھر اس کی ہنسی قصوں میں بدل گئی۔ ان قصوں کی پوٹ موتی شاہ کے دل پر لگی جو اس نے نوٹ کر لی۔

نیتی پیرنی کے بال کھلے تھے۔ برچھکتی تو میٹیں تھلا اٹھتیں۔ سامنے سے گریباں کھلا تھا اور ویسے تو سارا بدن ہی کھلا تھا۔ وائل کی تھپتھپ سے کیا ڈھکتا چھینتا۔ کپڑے تو جیسے اسے چھپتے تھے۔ یوں تو کھلے گریبان پر ہر کسی کی نگاہیں جاسکتی تھیں لیکن اس تک پہنچنے والا تلکے کی حدود میں کہیں نہ تھا۔ یہ تو ٹیک سائیں ہی کو شرف حاصل تھا۔ اس کے شاواہب رشیں پنڈے کو چھو سکے۔

نیتی پیرنی موت تھی۔ قریب آنے والے کے لئے! نہ جانے ہر کسی کو ڈس لیتی نفرت کو قہقہہ لگاتے دیکھا تو اس نے گریبان کچھ ادا کھول دیا اور پورے تلکے کو فیر کی زد میں لے لیا، موتی شاہ پر قہر آلود نظریں ڈالتی ہوئی نفرد کے پاس چلی گئی اس کے حضور میں ایسا بھرپور بدن تھا جس کا انگ انگ جوانی سے لبریز تھا۔ ایک خفیف سی خراش، زخم کا مسمولی سا نشان بھی نہ تھا کہیں پنڈاؤ چھلا ہوا چاند۔

”یونہی ہنستا رہ کر قہقہے لاتا رہ کر ہڑا اچھا لگتا ہے تو“ نیتی پیرنی نے پاؤں تلے سگریٹ مسلتے ہوئے کہا۔

پیرنی بی موتی شاہ کیوں جلا ہے مجھ سے ۱۹ سے میری ہنسی اچھی لگتی ہے، نہ قہقہے اچھے لگتے ہیں؟

”اس کا جو جی جو سر گیا۔ وہ تو پاگل ہے، پاگل۔ جو جی کی یاد میں گھل گھل کر مٹو کا ہو گیا ہے۔ اس کے اندر کچھ نہیں رہا۔ بڈیوں میں سے گودا بھی نکل چکا ہے۔ جوانی اور جو جی کو یاد کرتا رہتا ہے۔“

”جوانی کے لئے بڑی جہان مارنی پڑتی ہے بی بی! جہان بنانا کھیل نہیں۔“
”ٹھیک کہتا ہے تو نصرو!“

ادھر مکالمہ ہو رہا تھا، ادھر کنوئیں پر مولا ملنگ بوکے نکال نکال کر نیک سائیں پر چینیک رہا تھا۔ نیک سائیں نہانا کم اور نیستی پیرنی کو دیکھتا زیادہ تھا۔ نصرو بھی اس کی نگاہ میں تھا اور کیسے نہ ہوتا؟ نیک سائیں اس کا خالق تھا اور اب اسے اپنے منصوبوں کا معیار سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں بھی نصرو کے چالو ہونے اور اس کے کام کی رسم اقتلاح کا وقت نہ آیا تھا۔

نیستی پیرنی نے ایک بار پھر نصرو کا بھڑوڈ جائزہ لیا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلی گئی

نیک سائیں نہا کر دیزر بات دیزر کے پاس چلا گیا۔ نصرو کنوئیں پر چلا گیا۔
نیستی پیرنی نے اندر سے مولے ملنگ کے ہاتھ صلوے پوری کا طباقی بھیجا۔
چائے کی چینیک خان کی دکان سے آگئی۔

نیک سائیں پر ابھی تک فاتحانہ کیفیت سوار تھی۔ اس نے موتی شاہ کی راں پر ہاتھ مار کر کہا، ”مولا جانے! عورت کو جوتی تلے دبا کر رکھتا ہوں۔ کیا مجال ہے! جائے اور لوٹ نہ آئے۔“

”اوئے آہو بادشاہ! نیستی پیرنی کی کیا ہستی ہے جو تجھ سے مقابلہ کرے؟“
”مقابلہ! تو بہ کر کے کہتا ہوں، غرور کی بات نہیں، جس عورت کا ایک وقت کلاہ بھرا ہے۔ وہ دوبارہ کسی دوسرے کے پاس نہیں جاتی۔

”کیا کہنے نیرے بادشاہ؟“

”قسم ہے مولا کی! رستم کی بھی عورت ہوتی سے لڑائی بنا لوں۔ اللہ معانی فرما
ماں کا یار ہوں، ماں کا یار!“

”مجھے خبر ہے تیری بادشاہ انگلی کی عورتیں تجھ سے پہاہ مانتی تھیں۔“
”گلی کو تو بھگن کر دیا تھا۔ میں نے قسم پروردگار کی! ابھی منڈے کے
پاس جوتا تھا تو گلی کو میری خبر ہو جاتی تھی اور پھر ادھر رنڈیوں نے میری شکل
دیکھی۔ ادھر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔“
”تجھ سے ڈرتی تھیں بادشاہ!“

”موتی شاہ! کبھی مفت بری نہیں لڑائی۔ پہلے ناک پر دھا کا رکھتا تھا
پھر رنڈی کی دلیں پھاؤں دھرتا تھا۔
”بڑی بڑی رنڈیاں پاؤں پکڑتی تھیں۔“
”نیتی پیرنی گھٹ تھی کسی سے؟“

”جواب نہیں اس کا۔ خدا کی قسم ناک پر کھتی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ بڑی منہ
زور تھی۔ دس روپے روز دیتی تھی کرایہ چوبارے کا۔ بڑی سچ سنو کر بیٹھتی تھی۔
ابے مفت برو کو چا تو مار دیا تھا اس نے رتنی تو سہتہ چھوٹ تھی معزور اتنی تھی
کہ آنکھ بھر کر نہیں دیکھتی تھی تماش میں کو۔ لیکن دیکھ لے، رام کر لیا ہے اسے!“
”اوسے نہیں جواب تیرا بادشاہ!“

”مولا جانے باندھ دیا ہے پیرنی کو۔ ہل نہیں سکتی۔ دو دفعہ بھاگی ہے لیکن
آپ ہی واپس بھی آگئی ہے۔ میرے یار اس کی کیا ہستی ہے کہ یہاں سے جلتے؟
عورت تو میری مٹھی میں ہوتی ہے۔“

پوری جلوہ چشم ہوا تو باتیں بھی ختم ہو گئیں۔ مولا ملنگ طباقی لے کر اندر گیا۔
تو نیک سائیں کی باتیں بھی اندر لے گیا۔ طباقی رکھتے ہی اس نے ساری باتیں
اُگل دیں۔ ایک ایک بات زہر میں بھجھا ہوا تیر تھی۔ ہر بات دل میں جھنجھکی پیرنی
نے اسے بالوں سے گھسیٹا اور دکھتی میں دو چار لاتیں جڑیں۔

”بدختم، نمک حرام! تیرے سے میری حمایت میں کوئی بات نہ نکلی تو نے
وہیں دتے کا مونہہ نہیں توڑا جب وہ میرے خلاف زہرا اُگل رہا تھا؟“
مولے ملنگ نے روتے روتے کہا: ”بی بی دلا بڑا حیر دست ہے۔“
”جانتی ہوں اسے۔ بٹا پھرتا ہے زبردست خجھ ایسے کے لئے!“
”بی بی وہ کسی سے دلا نہیں جاتا۔“

”رندہ کے! نیتی پیرنی اسے دل دکھائے گی۔ دیکھنا کیسے شررگ دباتی
ہوں۔ ٹوٹے چھتر کی طرح بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔“
مولا ملنگ ایک جانب ڈرسم کر بیٹھ گیا اور دیکھنے لگا کہ شعلوں بھری یہ
آندھی کب ختمے گی۔

وہ سچ پچ آندھی ہی تھی لیکن اس کی رفتار زیادہ نہ تھی کیونکہ جس قالین
پر آندھی چل رہی تھی وہ بہت ملائم تھا، بالوں کی گچھاؤں سے ریشمیں دلدل
ہو گئی تھی۔ اس میں آندھی کے پاؤں دھنس دھنس جاتے یہی ریشمیں دلدل
نیک سائیں کی حمایت میں خاموش آواز بن کر اس کے دل و دماغ میں اتر گئی۔
وہ غصے کے مارے قالین کو کھوندتی رہی۔ اپنی دانست میں نیک سائیں کو تھوڑے
سے روندتی رہی جس نے کمرے میں اس کے حضور سارا رندہ کو تھل رکھ دیا

تھا۔ کوچ پر دم سے گری تو اسے ہلکے ہلکے 'زم زم جھلکے گئے جیسے نیک سائیں نے اسے جھولا جھلایا جو دس کی آنکھوں میں گلی کا وہ چوہا بارہ گھوم گیا جو بڑا بجا گو ان تھا اور جہاں شام کو روشنی کے پھول کھلتے ہی تماشا بین کی آرزو میں اس کے گرد ہار بنالیتیں۔ وہ اُجالے کے قلعے میں رانی بنی رہتی اور لوگ جھروکہ درشن کے لئے بار بار چکر کاٹتے رہتے۔ دہلیز پر وہی پاؤں دھرتا جو راجہ ہوتا۔ دوسرے تو بس دُور ہی سے آنکھ مار کر جی خوش کریتے اور اس کی دہلیز پر پاؤں دھرنے کی تمنا کر کے چلے جاتے لیکن اب سبھی اُبڑ رہی تھی تلخ برباد ہونے کو بھلا ہر صبح تباہی کی خبر لاتی اور اُسے نیک سائیں سے قریب تر کر دیتی۔

سگرٹ پیالہ پیالہ پیا۔ کچھ جی ملکا ہوا پھر صندوق میں سے دس دس کے نوٹ نکال کر مولے ملنگ کے ہاتھ حید کو بھجوائے۔ مولے ملنگ نے جاتے جاتے کہا: بڑی نیکی کراتی ہے تو بی بی! جیلاں بچاری کا اس دُنیا میں کون ہے؟ ابھی تو اس کے بچے بھی جوان نہیں ہوئے!

چاند بھڑ نور عنافی کے سانفہ طلوع ہوا۔ ملنگ سرور میں آئے۔ چنانچہ انہیں محبوب تھا، ہجر و فراق کا سانفہ تھا، خوب صورتی کی علامت اور بس اس کی کرن کلیوں سے زمیں و آسمان جگمگا رہے تھے۔ یہ کرن کلیاں تو ملنگوں کی محفل سجا رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر قوالوں نے بار بار اتھائی جوش و خروش سے نعرے لگائے اور ملنگ بھنگ کا پیالہ پی خیال کی سیڑھی لگا، آسمان پر چڑھے اور ستاروں پر کند ڈال آئے۔ بھنگ کا پیالہ پی کر وہ ٹوٹے جاتے اور ان کے خیال سپر ملنگ بن جاتے۔

رات کو ملنگ سرور میں آئے اور قوالی کی محفل جمی۔ وہ ملنگ لڑکھڑا کھڑا کر رقص کرنے لگے۔ ویسے ہر ملنگ جھوم رہا تھا۔ سر بول اور گھڑے کی بہتر ب جیسے روح میں جھوم رہی تھی اور پھر پوری کائنات گھوم رہی تھی۔ موتی شاہ کے گلے میں نور تھا۔ اس کی آواز نے جاؤ و جگا دیا اور مڑبلی آواز نے سب کو مر مست کر دیا۔ مستی و مرستی میں بدل گئی۔ ٹیک سائیں کی آواز بھی کم و بیش نہ تھی۔ مرستی نے رقص کرنے والے ملنگوں کا انگ انگ ٹوڑ دیا۔ وہ گر گئے اور فرش ہو گئے وہ ملنگ ہی تو تھے۔ افریقہ کے جاؤ پرست تو نہ تھے جو چاندنی میں دیوتا کو زیر کرنے اور کھیتیاں لعلہانے کے لئے رات رات بھر ناچتے اور ٹھکنے کا نام نہ لیتے۔ یہ تو بھنگا پی کر خود ہی زیر ہو جاتے دنیا کو کیا زیر کرتے۔

نغمہ عروج پر تھا تو نغمہ بھی آگیا۔ دو گھوڑا بوسکی کی بے داغ بے سلوٹ چمکیلی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ ہر سے بلو والا ریشمی لاپا باز دھڑ رکھا تھا چاندنی رات میں بھی اس کے چہرے پر تمازت تھی۔ ہوا سے دھوئی مڑکتی تو اس کی پیٹلیوں کا لشکارا دور دور پڑتا اب تو نیچی بیرنی بھی باہر آکر چوتھرے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں وہ رہ کر نضرہ کی تنی ہوئی گردن اور چوڑی چمکی جھاتی پر جاتیں۔

یہ سحر اجمیلا بھر پور بدن جس پر کوئی داغ دھبہ نہ پڑا تھا۔ اس کے دل میں پرست ہو گیا کھٹکتی ہوئی جوانی کے اس چمکتے ہوئے ساز کو ابھی کسی نے بیدار نہیں کیا تھا۔ نضرہ ایک تیز خواہش من کریتی بیرنی کے بدن میں تیر گیا۔ اس نے نضرہ کو ٹپکے کا آم سمجھ لیا جو ٹوٹا تو اس کی جھولی میں گرے گا۔

نضرہ مستوں اور مرستوں کے حلقے میں بیٹھ گیا موتی شاہ اور ٹیک سائیں

کی آواز کا جھانڈا اس پر بھی چل گیا۔ وہ بھی مرستی میں جھومنے لگا۔ موتی شاہ نے ذرا دم دبا کر سگریٹ میں چرس بھری۔ سٹلگا کر چار کش لئے اور نورو کے کان میں کچھ کہہ کر سگریٹ اسے تنھا دیا۔ نورو نے کش لیا ہی تھا کہ وہ لپک کر آئی جھپٹ کر اس نے سگریٹ چھین لیا اور جوتی سے مسل دیا۔ اس وقت نیتی پیرنی کا چہرہ چنگاری تنھا اور دل کی دھڑکن تیز تھی کیلئے پر ہاتھ رکھ کر دو چار گھڑی گھڑی رہی اور پھر اس کا سارا غصہ اس کی دائیں مٹھلی میں کھینچ آیا۔ آگ سے لبریز لپٹے موتی شاہ پر بے تحاشہ برسے گئے۔ نیک سائیں ہاتھ پکڑتا تو جانے کہاں نیک مشق جاری رہتی۔ نیک سائیں بڑی مشکل سے اسے حلقے میں سے لے گیا۔ کمرے میں جا کر اسے کورج پر بٹھا دیا۔ غصے کے مارے اس کا بدن پھر پھر کانپ رہا تھا۔ وہ بھر پور عورت تھی، رنڈی تھی۔ رنڈی کا غصہ عورت کے غصے سے زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ اندر سمٹنے کی بجائے باہر چھٹک آتا ہے۔

نیک سائیں نے غصہ اٹھوانے اور اسے ہلکے تاڑ پر لانے کے لئے بات چھیڑی تو دلبر جانی! نورو کو بھی چار چاٹے لگا دیئے ہوئے؟

”اس کے تو میں بال فوج لیتی وہ تو وہاں سے کسک ہی گیا“

”موتی شاہ چنگاندا دیکھتا ہی نہیں، ہر کسی کو چرس پر لگا دیتا ہے؟“

”کمینہ سونے سی جوانی کو داغ لگانا چاہتا ہے۔ وہ معصوم لڑکا، اٹھتی

جوانی۔ اسے کیا خبر یہ زہر ہے؟“

”نورو تو میری آس ہے رانی! جوان ہے! جیدار ہے۔ ایک دن اپنا

سارا خندا اس پر چھوڑ دوں گا؟“

”اور تو چہین کی بنسری بجائے گا۔ نیکیے میں جھنگیوں، چرسلیوں کے ساتھ پڑا رہے گا۔“

”وہ کیوں جب کبھی ڈھیر سا رامال لانا ہو گا۔ میں آپ جاؤں گا۔“

”ہوں۔“

نصرو کے بارے میں نیتی پیرنی کو نیک سائیں کی نیت کا پتہ چل گیا۔ اگلے روز اجنبیوں کی ایک ٹولی آئی اور نیک سائیں کو اپنے ساتھ لے گئی۔ کام خطرناک اور چونکے سودے کا تھا۔ اس میں فقط ولیری کام نہ آئی۔ عقل، رش، تجربے اور حاضر و ماضی کی ضرورت تھی۔ یہ علم دوسرا تھا جس کی تربیت نیک سائیں نے زندگی کے خارزار میں پائی تھی۔

تکلیف خالی خالی تھا۔ موتی شاہ بھی ہم پر گیا تھا اور نصرو حسب معمول کسرت کر رہا تھا۔

نیتی پیرنی اس کے پاس چلی آئی۔ سر دست اس نے اس کے بال نوچے۔ نہ سگریٹ والی بات چھیڑی۔ اس وقت وہ کیسے غصے میں آئی۔ نصرو تو اس کے دل میں محل رہا تھا۔ بولی اڑیا اور امیرے ساتھ تو چلا، کام ہے مجھے۔ نصرو کی آنکھیں جھٹک گئیں اور اس پر شرم کا بوجھ پڑ گیا۔ وہ تو اس کے سائے تلے دب ہی گیا۔ شرم تو چیز ہی ایسی ہے کہ جوانی کی صبح اولیں بن جاتی ہے اور پھر عورت کے سانسوں کی گرمی سے ایک دن چمک جاتی ہے۔ تب شرم بونہ کے اڑتی ہے۔ وہ شرم کے بارے اودھ موا ہو کر رہ گیا۔ اس کی زبان سے صرف ”اچھا“ نکلا اور وہ بھی بڑی دھیمی آواز میں۔

نیتی پیرنی پھول تھی، پھول سُکرایا۔ اس نے اپنی دو انگلیوں سے اس کی
 ٹھوڑی اُدبھی کی اور اس کی ہچکی ہوئی آنکھوں کو اپنی آنکھوں کے متوازی لے
 آئی۔ ٹھوڑی تھامے رہی۔ مبادا پھر آنکھیں جھبک جائیں۔ اس کے بدن میں جھنجھکی
 سی آئی اور چہرے پر سُرخ سمٹ آئی۔ وہ سُکرایا اور اس نے نیتی پیرنی کی نظروں
 سے نظریں ملائیں۔ جلو سے سرور سے لہریز ہو گئے۔

”کیوں رے نصرو اس ماں کے یار سے سگرٹ کیوں لیا تھا؟“

”اس ماں کے یار نے کہا تھا، چرس کا سگرٹ پیتے ہی سردگ تیرا پہنچا دیتا۔“

”سو نہ، کیہنے کم ذات نے بات بھی کی تو کیسی۔ حرامی سردگ میں پہنچ جائیگا۔“

سردگ میں پہنچاؤں گی بئی؟

”ہج؟“

”ہج؟“

”کب؟“

”آج لیکن قسم کھا میری جان کی کہ کبھی سگرٹ نہیں پے گا، چرس والا نہ خالی۔“

”تیری جان کی قسم! سگرٹ نہیں پیوں گا۔ نہ چرس والا نہ خالی۔“

”بس اب سردگ تیرا ہو گیا۔ جھٹ سے منالے۔ بازار ہوا میں؟“

نصرو بدن کی حرارت کم کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔

نیتی پیرنی کمرے میں چلی گئی تاکہ اپنے رانچھے پر ہاؤ کرنے کے لئے میرے

بھی زیادہ خوبصورت بن جائے۔ اس نے غسل کیا اور نئی شادابی سے طلوع

ہوئی۔ اپنے آپ کو خوشبوؤں میں بھریا۔

اس کے اندر بدن بول رہا تھا۔ چاروں طرف خوشبو کے مجھورتیاں رہے تھے۔ کپڑے پہن کر وہ بیس سال کی تھی بن گئی۔ نصرو نے اس میں جوانی کا احساس جگا دیا۔ ہاتھوں کی رگیں چھپ تو نہ سکیں لیکن اس کے ہونٹوں پر کھلے ہوئے پھولوں اور دانتوں کی چمپا کلی نے اسے سجا کر دیا۔

دونوں بازار چلے گئے۔ اس کے بدن کی جھک سرور بخش تھی نصرو صبح پہلے سو رگ میں پہنچ گیا۔ سو رگ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے پاؤں تو جیسے زمین پر ٹپکتے ہی نہ تھے۔ اس کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ نینتی پیرنی ایسی ذی شان عورت اسے شرفِ رفاقت بخشے گی۔ وہ کب باناتا تھا کہ جوانی ایک غرور لاتی ہے، ایک کا غرور توڑتی ہے۔ وہ بار بار گردن تان کر نکلیں اور بھی کرتا لیکن گرل اپنے آپ جھجک جاتی، لگاؤ نہیں پہنچا ہو جاتیں نینتی پیرنی کی بڑی بڑی آنکھوں سے چمکتی ہوئی گرلین اکبرے ہمیں نقاب میں سے جھپک جھپک کر رہا ہوا ہی نہیں اور دیکھنے والا ان کے نقاب میں تھا۔ بسے حلوائی کے تھڑے پر خیرا جھرنی والا اور اس کے دو ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اکھٹوں نے نصرو کو عورت کے ساتھ جاتے دیکھا تو حیران ہوئے۔ انہیں امید نہ تھی کہ نصرو اتنی جلدی پیر پرزے نکال لے گا۔ خیرے جھرنی والے نے کھانس کھسکار کر گلا صاف کیا اور پھر ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا، "معتوق نصرون ہے؟"

نصرو نے سنا تو اس کا چہرہ تھمتا اٹھا۔

پھر اس نے کہا، "اس معشوق کے لئے جان بھی دینی پڑے تو پروا نہیں؟" نصرو کا چہرہ اور بھی تھمتا یا لیکن وہ چپ رہا۔ دراصل وہ اتنی جلدی پیر پرزے

لگانے پر چھنپ سا گیا تھا۔ نیستی پیرنی پر دو پوٹیں ہوئیں اور وہ چپ رہا۔ اس نے،
نقاب اُٹا اور نضرو سے کہا۔

”کیسے کہنے بد ذات کی کھال، دیکھتا کیا ہے؟“

یہ جند بھلی کا بھالا تھا جو اسے جا چھا۔ وہ بھلی کا بھالا بن گیا اور بھلی کا
بھالا اس نے خیرے جھرنی والے کو چھو دیا۔ وہی چاقو جو انٹریاں کاڑھ چھینکا
خیرے جھرنی والے کے سینتر ابلنے پر اس کی مان چیر گیا۔ اس کی دھوئی خون سے
لخت ہو گئی۔ چاقو تو خیرے جھرنی والے کے پاس بھی تھا لیکن ڈب ہی میں رہا۔
نضرو کی کلائی کا زور دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ نضرو کا بازو اس تیزی سے حرکت میں
آیا کہ سب دنگ رہ گئے۔ اس کی کلائی میں نیا کس بل تھا اور اسکی انگلیوں کی حرکت
اتنی زبردست تھی جیسے وہ آدمی کو نہیں ساندھ کو مارنے چلا تھا۔ ٹیڈی بائی ٹیک
نے آنکھ ماری پھر گالی دی۔ پھر دھکا دیا اور خیرا جھرنی والا بھاگ گیا۔

نضرو نے چاقو ہوا میں لہرا کر کہا ”اڑ بھگل“

بھگل نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ گلی میں مڑ کر غائب ہو گیا۔ نضرو نے سینتر مان
کر کہا ”عورتوں کی کمائی کھانے والے یہ کیا لڑیں گے مجھ سے؟“
ٹیڈی بائی ٹیک نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اس نے ہوا کا بدلتا ہوا رخ
دیکھ لیا تھا۔

نیستی پیرنی نے نضرو سے چاقو لیا اور اسے لے کر چلی گئی۔

خیرے جھرنی والے کے بڑے کور تھے۔ بستہ کا بد معاش بستہ الفافہ
ترقی پانے کے لئے۔ بستہ اب تھا۔ لیکن نضرو نے کرکری کر کے اس کی ترقی کے

راستے بند کر دیئے اور اس کا مستقبل تاریک کر دیا۔ علاقے کے وہ لڑکے جو اس کے شاندار مستقبل، بڑھتے ہوئے رسوم اور پھلتے ہوئے کاروبار سے متاثر ہو کر دھڑا دھڑا اس کے حلقہ احباب میں داخل ہوئے اور اس کے حکم سے وارث بن کر رہنے لگے تھے بدظن اور بد دل ہو گئے۔ اس کا تو سارا طعم ہی ٹوٹ گیا۔ ادھر نیتی پیرنی کے دل پر ضرور کی دھاک کچھ اور بیٹھ گئی۔ اب وہ اکثر نصرو کو لے کر بازار میں سے گزرتی کسی کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے اور آوازہ کنے کی جرأت نہ ہوتی۔ نیتی پیرنی نے ایک اور نگہبان پالیا۔ وہ اسے ہر وقت خوش رکھتی۔

سورگ میں رہتے رہتے اس میں اکنا ہٹ آگئی۔ آدمی سورگ سے بھی اکنا جاتا ہے۔ اس میں امیری کا احساس بھی شامل تھا۔ آخر ایک دن اُس نے کہا۔
”میں فس کلاس پشوری مانگہ لوں گا۔“

”مار ہے“ نیتی پیرنی نے پوچھا۔

”چاپے سے لے لوں گا۔ گھوڑی اس کے پاس ہے۔ بھری مانگہ وہ لے دے گا۔ تجھے مانگے میں پٹھا کر بچوں کا تو مزہ آجاتے گا۔“
”مانگے گھوڑے کے اب دن نہ گئے۔ سکوڑے لے۔“
”سکوڑے لئے چاچا دھبلا نہیں دے گا۔“

”رام نیک سامین سے لے دوں گی۔ پہلے کہیں سے سکوڑ چلا نا سیکھو۔“
پھر میں تجھے آپ پل کے سکوڑ خرید دوں گی۔

”بس؟“

”بس!“

نصرہ کے لئے سکوتر تو بہت بڑی نعمت تھا۔ آدمی کو کار اور کوٹھی پاکستانی اور خوشی کی کیفیت حاصل ہوتی ہے لڑکے کو سکوتر پا کر حاصل ہوتی ہے۔ وہ فرزند فرما لے کے ڈرائیونگ سکول میں سکوتر چلانے کی تربیت پانے لگا۔ سکوتر اس کا خواب تھا، وہ غریب خواب اور وہ سوچنے لگا۔ جب وہ بچہ پیرنی کو بچھے بیٹھائے گا، بیتی پیرنی اپنی باہیں اس کی کمر میں ڈال دے گی اور وہ سکوتر اڑاتا جائے گا تو نکستی اُرنچی ہواؤں میں اڑنے لگے گا۔ بالکل سدرگ میں ہو گا۔ سکوتر پر پری اڑائے گا اور فٹ پاتھ پر چلنے والی دنیا اسے رشک کی نگاہ سے دیکھے گی۔

نیک سائیں کو گئے کئی دن ہو گئے تھے۔ لیکن اس میں تشویش کی کوئی بات نہ تھی۔ وہ لنڈی کوتل سے سیدھا کراچی چلا گیا ہو گا، وہاں سے اور کہیں نکل گیا ہو گا۔ بڑا اکٹا تھا۔ اس کے پاس ہم چوٹی کے لئے عقل، تجربے اور حاضر دماغی ایسے تینوں حربے تھے۔ یوں ہی تو روپے کی ریل پیل نہ تھی، بیتی اس کے گنوں سے خوب اگاہ تھی، وہ اس کی فکر کرتی تھی۔ وہ اس کی تھی اور نصرہ، نصرہ اسکے بے پیاں غرور اور حکمت کو سنبھالا دینے والا، اس کی آرزوؤں میں کھٹکنے والا جو اس تھا اس نے ایک خانے میں محفل، تجربے اور حاضر دماغی کو جگہ دی، دوسرے میں بھر بھر کر کوہ اپنے وقت کی دو روپی تھی۔ اگر دو روپی نوکھا پنے دل و دماغ اور بدن میں رکھ سکتی تھی تو وہ دو کو بھی سنبھالنے کی مجاہد نہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی تکمیل اور شب و روز کی مرگرمیوں کے لئے دو کو ضروری سمجھا اور اب تیسرا بھی آدمی تھا، بالکل معصوم صورت کا پیدا پایا سمجھو لا سمجھو لا لڑکا۔ یہ حیلہ کار کا بولتی تھا۔

بالکل باپ پر گیا تھا۔ ہلکی ہلکی مسکراہٹ نے چپ چاپ کمرے میں داخل ہوا نیتھی
پیرنی سنگھار مینڈر بیٹھی بال سفار رہی تھی۔ اس نے اسے آئینے میں سے دیکھا
تو قریب آنے کو کہا۔ بولی: "ذرا پیچھے سے چولی کا بند تو کھول دے۔"

بولی جھینپا۔ آگے تو بڑھا لیکن قدم پھر پیچھے ہی رہا۔ وہ ٹرٹش نو دھو کر بولی
"رندھی کے! دم گھٹ رہا ہے جلد ہی کھول!"
رندھی کو آگے بڑھا اور اس نے بند کھول دیا۔

"کیسے آیا ہے رے بولی؟"

"اسی! اسٹی کی مشین ٹوٹ گئی ہے۔ سلائی کے لئے ڈھیر سارے کپڑے آئے
ہمیں مشین ٹھیک کروانے کو پیسے نہیں۔"
"پھر میں کیا کروں کھجرا؟"

کھجرا چپ رہا۔ نیتھی پیرنی نے کنگھی رکھی اور ہاتھ مونہہ دھونے چلی گئی۔
کھجرا ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔

نیتھی پیرنی نے ہاتھ مونہہ دھو کر بدی سجایا، چولی بدلی۔ پھر اس نے
سارھی پہنی۔ تیار ہو کر بولی: "چل پترا!"

وہ رات گئے تک جمیلہ کے گھر میں رہی۔ لوثی تو نصرود کمرے کے باہر ٹھل
رہا تھا۔ مارے خستے کے شکل تھا۔ وہ نصرود کو دیکھتے ہی مسکرائی۔ نصرود نے اس
مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہیں دیا۔ پھر جب اس نے کبھی عقلمانی تو نصرود نے
خاموشی سے قفل کھول دیا۔ وہ تو کپڑے بدلنے آئی اور نصرود چپ چاپ بیٹھ گیا
اب تو اسے نصرود کی سنجیدگی کھٹکی۔ بولی: "تو چپ چپ کیوں ہے نصرود؟"

”گیارہ بجے ہیں میری گھڑی ہیں اتنی دیر کہاں رہی؟“
 ”بہنہ، تو بھی بس دہی ہی بکلا۔ جمیلہ کے گھر گئی تھی۔ آپ بھی بیدار ہے۔ اس
 کی مشین بھی بیدار ہے۔ دونوں کو ٹھیک کر دایا ہے میں نے!“
 ”لیکن جمیلہ سے نیرا کیا واسطہ بنتی؟“

نیتنی پیرنی برہم ہوئی اور تندرے جلال میں آکر بولی: ”اگر میرا واسطہ نہ ہو تو وہ
 چار دن میں مرنے جاتے۔ اس کھرنے تو اسے چھوڑ ہی دیا ہے۔ اب وہ بال بچوں کو کیسے
 پالے؟ میں خرچ نہ دوں تو اور کون خرچ دے؟ کون ہے اس کا اس دنیا میں؟“
 اس کے جلال میں صداقت تھی، سچ کی آگ تھی۔ وہ پھر بولی: ”لوگ جانتے ہی
 نہیں۔ کھری کھری ہوتی ہے اور عورت بھی؟“

نصرو کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ جمیلہ کو مرنا نہ چاہئے۔ اسے بھی اس دنیا میں زندگی
 رہنے اور بال بچوں کو پالنے کا حق حاصل ہے اور یہ کارِ خیر نیتنی پیرنی کے ذریعے ہونو
 کیا مضائقہ ہے؟
 رات سوہگ میں گزری۔

کلی بھوٹی، صبح کھلی، زمیں جھلگائی۔ ایک دنیا بیدار ہوئی لیکن شکیبہ نیک سنگھ
 کے مہنگی چرسی موش میں نہ آسے۔ دراصل انہیں رات بھر سونے جا گئے کا درد
 پڑتا رہتا۔ فجر کے وقت ذرا اٹھیں ہو جاتے۔ نیتنی پیرنی بھی کمرے میں بے سُدھ پڑی
 تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے پکھونے کے سلوٹ وہ ساری کروٹیں گنوا رہے تھے
 جو رات بھر بدن نے لیں۔ خاکدان میں سگریٹوں کے بچے ہوئے ٹکڑے پڑے
 تھے۔ گلاس میں منھوڑی سی شراب رہ گئی تھی۔ چاقنی جوئی پلنگ تلے دھری تھی

اور جوتی والا باہر کیسے میں پڑتے ڈسٹر بیل رہا تھا۔ اس نے خیرے جھرنی والے کو بھگت کیا تھا اور پھر کیوں نہ بھگت کرتا؟ وہ خیرے جھرنی والے کی طرح عورتوں کی کمائی تو نہ کھاتا تھا۔ وہ تو عورت کا یار تھا۔

موتی شاہ کمرے میں داخل ہوا تو پہلے اس کی نظر نیتھی پرانی کے بدوڑے پڑی جو منہ سکرٹ پہننے والیوں کو مات کر رہا تھا۔ پھر اس کی نظر شراب والے گلا پر پڑی۔ اس نے دو گھونٹ میں گلاس کی شراب تمام کی پھر کمرے کے ماحول کا جائزہ لیا۔ چکیلی بھڑکیلی چاشنی جوتی نیک سائیں کا منہ پڑا رہی تھی جو اس وقت یہاں نہ تھا لیکر موتی شاہ تو چاشنی جوتی سے بھی زیادہ نشوونشا کی خبر لایا تھا۔ اس نے نیتھی پرانی کے شانے ہلائے اور کہا، بی بی!

بی بی نے ”وے دفع ہو“ کہا اور دوبارہ غنبد میں کھوجانا چاہا لیکن موتی شاہ کے پاس اس کی غنبد سے کہیں زیادہ توجہ طلب خبر تھی۔ اس نے پھر شاہ جھنجھوڑا اور چلا کر کہا، نیک سائیں پکڑا گیا ہے بی بی!

موتی شاہ نے توشا نہ ہی جھنجھوڑا تھا۔ خبر نے اس کا دماغ جھنجھوڑ دیا۔ جوش میں آئی تو موتی شاہ پھر بولا، نیک سائیں! نیک سائیں پکڑا گیا ہے۔
”نیک سائیں پکڑا گیا ہے؟ کیسے، کہاں؟“

”اٹک کے پل پر ہی دھریا گیا چرس اور افیون سے بدوڑی بھری ہوئی تھی۔ وہ تو کاشا تھا خزانہ تھا۔ آٹا سیاہ تھا۔ بوری پھینک دیتا دریا میں ڈکا دے دیتا، معافی مانگ لیتا۔“

”بی بی! قسمت اٹ جائے، بھاگ کھڑا ہو جائے تو بڑے سے بڑا کاشا“

بڑے سے بڑا خزانہ، بڑے سے بڑا سیانا موندہ کے بل آگیا ہے۔
 نیستی پیرنی کے ہاتھ میں سگریٹ سلگتا رہا۔ انگلیاں جلنے لگیں تو اس نے
 سگریٹ پھینکا۔

”بی بی! وہ کہتا تھا اب کے آٹا مال ہاتھ لگے گا کہ تیرے لئے کوٹھی بنوا دے گی۔“
 بی بی اور بھی غلگلیں جوگئی، کوٹھی کا نام سنتے ہی اُسے نیک سائیں کا غم لگ گیا۔
 ”کہتا اچھا تھا وہ، کتنا خیال تھا اسے میرا!“

موتی شاہ نے یہ جملہ سنا اور اپنی آنکھوں کے سامنے پچانتی جونی کو چمکتے
 بھی دیکھا۔ اس نے زیر لب کہا ”رندھی“ اور رندھی تک یہ حرف نہیں نہ پہنچا
 وہ دلدوز انداز میں بولی ”پھر اب کیا ہو گا؟“
 ”مقدمہ چلے گا۔“

”اس کے لئے تو پیسہ چاہئے؟“

”ہاں، پیسہ چاہئے، پیروی تو نہ ہو گی؟“

وہ سر کچڑ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑا بہت پیسہ اس کے پاس تھا لیکن مقدمے
 میں تو پیسہ پانی کی طرح بہانا پڑے گا۔ نیک سائیں ایسا وار داتیا روز روز تو
 پیدا نہیں ہوتا۔ لاکھوں میں ایک ہوتا ہے مائی کا لال۔ اس نے نیستی پیرنی کے
 سارے حق حقوق چورے کئے اور اب گریبا نہیں ادا کرنے کا وقت آگیا تھا لیکن
 پیسہ چاہئے تھا۔ مقدمے کے لئے، اس کے لئے، جیل اور جیل کے بچوں کے
 لئے، انصاف کے سکوتر کے لئے اور پیسہ دینے والا اندر تھا۔ دوسہاروں میں سے
 ایک سہارا تو وہ مضطرب ہوئی اس کا دل بھج گیا۔ بتیں دانتوں میں سے

نکلنے والی ہریات پوری کرنے والے کو وہ کیسے بھول جاتی؟ اس نے تو عقل و ہنر کی بدولت تکیے کو اول درجے کا کاروباری مرکز بنا دیا اور اس کا نظم و نسق نہایت خوش اسلوبی سے چلایا۔ کس و صوم سے قوالی کی محفلیں جیتیں۔ کس باقاعدگی سے جوا ہوتا، بھنگ گھٹتی، چرس پی جاتی اور اندر خانے ہر قسم کی نشہ آور چیزیں پرچون اور تھوک کے بھادڑیک جاتیں۔

دن بھر وہ مقدمے کا، اپنا، جیلہ کا، جیلہ کے بچوں کا، نصرہ کے سکوٹر کا خیال کرتی رہی۔ اس نے سگرٹ پر سگرٹ پھونکے، کمرے میں دھواں بھر گیا۔ اسے ٹپٹی کا خیال آیا لیکن اب وہاں کیا دھڑکتا تھا؟ وہاں تو دل ڈوب رہے تھے، امیدیں بھٹک رہی تھیں۔ ٹپٹی ابڑ رہی تھی، ٹپٹی اب کسی کی آس پوری نہ کر سکتی تھی۔ نصرہ آیا تو وہ ٹمکنکی باندھے چست سے آویزاں فائوس دیکھ رہی تھی جس میں نئے نئے رنگ برنگی فٹے گندھے تھے جلتے تو روشنی کے پھول کھل جاتے۔ کیسے کیسے پھول کھلائے تھے۔ پھول سائیکس نے! پھر جب ٹپٹی میں جلتیں تو رات میں دن طلوع ہو جاتا۔

نیتھی سیرنی کو محویت کے عالم میں دیکھ کر نصرہ دروازے پر ہی رُک گیا۔ او! جب دیر تک اس کی توجہ اپنی جانب نہ کیجئے سکا تو کھانا نیتھی سیرنی نے پیہرہا کے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر پہلے ہی فٹے پر نظریں لے آئی۔
”بیٹھ جانا نصرہ!“

اس آواز میں گرجوخی کی بجائے دردمندی تھی، دھیما پن تھا۔ نصرہ بیٹھ گیا اور بولا۔ ”مجھے آج کیا ہو گیا ہے، بی بی؟“

”نیک سائیں پکڑا گیا ہے“

”اچھا“

”ہاں“

پھر ہوں کہ نہ کر چپ ہو گیا۔ دل میں خوش تھا کہ اب نیک سائیں کی جیت اسی کی جو رہے گی لیکن آج جنت افسردہ تھی۔ اس نے دلجوئی کے لئے کہا بُرا ہوا بی بی! پر تو غم نہ کر“

”کوئی اپنے آپ بھی غم کرتا ہے؟ غم تو آپ ہی اندر سے پھوٹ پڑتا ہے“

”چل دیا کی سیر کرائیں جی ہلکا ہو جائے گا“

”نہیں اڑیا! آج سیر کو جی نہیں چاہتا“

”جیسے تیری مرضی“

نصرد چپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ بولی ”نصرو! تو تاکہ گھوڑا خرید لے!“

”کیوں سکوتر نہیں لینا؟“

جس کے بھرد سے پرسکوتر لینا تھا وہ تو اندر ہو گیا۔ میرا تو خرچ ہی اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کے سوا، وہ سراپورا نہیں کر سکتا“

وہ سختوڑا بہت خرچ تو میں بھی چلا دوں گا لیکن گھوڑے مانگے کا قرض بھی تو اٹانا ہو گا۔“

”مجھ سے یہ خرچ پورا نہیں ہو سکتا، بلی! تنقیری کیسل کے سگرٹ پیتی ہوں“

”کبھی ویسی نہیں بی۔ یہ خرچ تو دھڑلوری کرنا تھا“

”ہوں“

رات بھر تدبیریں سوچتی رہی۔ تکیے کا کاروبار بڑا مشکل تھا۔ پولیس کی زد سے بچنا، جواریوں سے نمٹنا، چرس کا اسٹاک چھپا کر رکھنا، اثر و رسوخ سے کام لینا آسان نہ تھا۔ لمے دسے کے موتی شاہ اور مولانا گروہ گئے تھے۔ نیک سائیں کے جانشین لیکن تکیے کا نظام سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ وقت آن پڑا تھا اور اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔

نصرو نے گھوڑا مانگ لے لیا۔ چاہا نے مشکلی دسے دی۔ مشکلی بھی ایسی جیسے پری۔ پورے اڈے پر سب سے الگ نظر آتی اور دوڑنے میں بھلی تھی۔ ہنسناتی تو گردن خم باتی اور لانی لانی ایال ہوا میں لہراتی۔ پھر تانگہ؟ وہ تو قوس قزح تھا۔ ساتوں رنگ اس پر اتار دیئے تھے کاریگر نے۔ نہایت نفاست پسند اور شوقین مزاج اس پر بیٹھے۔ معمولی گاڑی سے تو نصرو سیدھے سو نہ بٹا نہ کرتا۔ جو بھی آتا سالم تانگہ کرتا۔

ایک دن مینہ پڑا اور آسمان پر قوس قزح نکھری۔ رنگوں کی موجیں اس میں آکر ٹھہر گئیں۔ ایک گوشے میں چاند ترازو ہو گیا تھا۔ بادلوں کے جزیرے جگہ جگہ ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ مینہ پڑا تو ہوا میں خشکی آگئی۔ نصرو کے عین سامنے قوس قزح کا پل کھڑا تھا۔ طبیعت چھلی! جی میں آئی چل کر بی بی کو لائے اور قوس قزح پر نکل آئے۔ پان سات روپے کم کمائے تو کیا ہوا؟ ابھی خیال کی گردش غمی نہیں تھی۔ اور وہ باگیں تمام کر مشکلی کو اسٹارٹ کرنے ہی کو تھا کہ پیچھے سے ایک لڑکے کی آواز آئی۔ ”تانگہ! یہ آواز بُو بی کی تھی۔ اور کسی کی آواز ہوتی تو وہ کان بھی نہ دھرتا۔ لیکن بُو بی کی آواز ہر کبے نشی ان نشی کرتا؟ اس نے اٹھ لگائی۔ ودا اور تلگے آواز

کے کندھے پر لپکے۔ نصرہ کی مشکلی نڑاٹے بھر کڑائی اور اگلی ٹانگوں پر ناپسنے لگی۔ بھو اور بوٹی کے ٹانگے بھی بلا کے خوبصورت تھے۔ ان کے گھوڑے بھی بڑے بائکے تھے لیکن نصرہ کی مشکلی کے چمکتے ہوئے ریشمی پنڈے کی شان ہی اور تھی۔ شاہی دروازے کے باہر والے دروازے پر جگمگاتے جھللاتے ہوئے یمن ٹانگے اکھڑے ہوئے جن کے جانور بڑے بیکل تھے۔ سواری بڑے خرنے سے برآمد ہوئی۔ بوبی کے ہمراہ کبوتری رنگ کے تے برقعے میں ایک عورت اندر بارغا میں سے شاہی دروازے کی جانب آئی۔ بجاں میں پھرتی تھی۔ برقعہ اوچک رہا تھا۔ اور پٹاٹانگے ایسے ہی چمکتے دکھتے ہوئے برقعوں کے لئے مخصوص تھے انگلیوں میں بڑاؤ انگوتھیاں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ عورت نے نقاب اٹھائے بغیر بوبی کے کان میں کچھ کہا۔ بوبی اور عورت ٹانگے میں بیٹھ گئے۔ نصرہ نے بوبی کو دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ جمیلہ کس نیت سے ٹانگے میں بیٹھی ہے۔ جانتا تھا کہ عیسیٰ پیرنی کے پاس اب اتنا مدد یہ نہیں کہ جمیلہ اور جمیلہ کے بچوں کا خیر بھی پورا کرے۔ اب تو یہ خیر خود اسی کو پورا کرنا تھا۔

عورت نے دونوں نقاب گرا رکھے تھے لیکن ٹانگے پاؤں کی وہ بار بار سنسن کرتی۔ نصرہ نے جمیلہ کو دیکھا تو نہ تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ نیک سائیں بڑا خیر ہے۔ اس کا انتخاب ضرور دلاؤں گا۔

لاہی لاہی مریض انگلیوں نے اشارہ کیا اور نصرہ نے مشکلی کا رخ اشارے پر پھیر دیا۔ ہوا میں ساٹا لہرایا، مشکلی بجلی ہو گئی۔ بڑی شرک پر نکل آیا تو مشکلی رکمتی گھنٹی ہوئی دھنک کے متوازی دوڑ رہی تھی۔ ایک بار مریض انگلیوں نے

اشارہ کیا تو نضر نے پیچھے کو ذرا گردی مڑی اور اس کی نظر پورے ننگے بازو پر پھسل گئی۔ اس کی مضبوط انگلیاں چمک گئیں اور وہ چمکنے چمکیلے، ملائم گداز بازو کو دبانے کے لئے تڑپا۔ اسے اندازہ ہوا کہ معشوق بے نظیر ہے۔ جو ہوسو ہونٹیں پیرنی سے بے وفائی ہوتی ہو تو ہو، وہ کون اس کی بیوی تھی اس سے کا ہے کی وفا کا ہے کی بے وفائی، آج وہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دے گا۔ اس نے پھر چابک ہوا میں لہرایا، مشکلی اور بھی جھڑکی اور وہ آپ معشوق بے نظیر کے حسن کے خط و خال مرتب کر کے پھر کی اٹھا۔ رگ دپے میں حرارت دوڑ گئی اور لمبو میں مستی کو ذمہ لگی۔ اس نے بالو کا نغمہ چھیڑا۔

ہتھ جوڑا اسے پکیاں دیا
 مائے سادہ ماہی لگدا

مائے چائن اکیاں دا

بوی پیک کرا اگلی سیٹ پر جا بیٹھا اور گاہے گاہے دو انگلیاں ہونٹوں میں رکھ کر زور سے سیٹیاں بجانے لگا۔ مشکلی بار بار جھڑکتی۔ نضر بھی سیٹیاں بجانے لگا اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔ مشکلی اب بڑے ہوٹل کی سمت جا رہی تھی اور نضر کے چپا نے کہ رکھنا تھا، بڑے ہوٹل کی سواریاں لینا۔ مومنہ مانگا گرایہ طے گا اور قرض جھٹ پٹ اترے گا۔ لیکن نضر تو سودو زیاں کی منزل طے کر کے عقل و خود سے دُور جنونِ سنہنی کے سرب میں آگیا تھا جہاں آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔

بچھل لشت پر عورت بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی اس کی زلفیں ہوا میں لہراتی تھیں۔ جنہیں وہ مرضع انگلیوں سے سمیٹ لیتی۔ اس پر ایک کار کی روشنی پڑی اور

اس نے نقاب اُلٹ لئے۔ کار کی رفتار سُست پڑ گئی۔ وہ مسکرائی۔ روشن کار اور روشن چہرے میں سمجھوتہ ہو گیا کار رُک گئی۔ مرصع انگلیوں نے اشارہ کیا، مشکلی رُک گئی۔ انگلیوں نے بوبی کے چٹکی بھری۔ بوبی اور مرصع انگلیاں نیچے اتر گئیں۔ نصر نے جنونِ دستی کے مراب سے پتے کی کوشش کی لیکن اسے دیر ہو گئی۔ اور عورت کار میں جبا بیٹھی۔ بے نقاب عورت نے کار والے کو دس کا نوٹ نکالنے کو کہا۔ سوسو کے نوٹوں میں پانچ پانچ کے دو نوٹ تھے عورت نے نوٹ لے کر بوبی کو دیئے اور نصر کو کہتھا اُٹے کو کہا۔ اب نصر و جنونِ دستی کے مراب سے پلٹ آیا تھا۔ عورت کا جانا پہچانا ہوا تاب دار چہرہ اس پر بجلی بن کر گر آیا۔ بوبی ہانگے میں ایک نوٹ پھینک کر کار میں آ بیٹھا جو غلطہ دار گزرتی گئی۔ نصر و کا سارا غصہ اس کے حلق میں سمٹ آیا اور اس نے پوری قوت سے چلا کر کہا: "گشتی"

"اُداق" لاہور

بڑیاں

وہ بڑی اماں سے کب بڑیاں بنیں کسی کو یاد نہیں۔ ان کی عمر کا بھی کسی کو اندازہ نہیں۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا وہ لالٹوں لالٹوں تو نہیں مگر ہاں صحت کی لہجہ تھیں اور پھر برسوں ان میں ذرا سی تبدیلی بھی نہیں آئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ جیسی ہیں سدا ایسی ہی رہیں گی۔ سالہا سال سے وہ کسی نامرخی عمارت کی طرح قائم و دائم تھیں جس کے نہ ہونے کا کبھی کوئی تصور بھی نہیں کرتا۔

آنکھوں دیکھی نہیں کانوں سنی ہے کہ جب اولاد نہ ہونے کے بہانے میاں نے دوسری شادی کی تو یہ ماتھے پر بل نہ لائیں۔ چھوٹی کی ساری اولاد کو یہ پیدائش کے بعد سمیٹ لیتیں جیسے قدرت نے تقسیم کار کر رکھی ہو کہ وہ جنیں اور یہ پالیں۔ چھوٹی کے سارے بچے انہیں بڑیاں کہتے اور یوں چست رہتے۔ جیسے گڑ پر چوئیاں۔ ریڈیو پر فلمی گانوں کی فرمائش کی طرح ان کی فرمائشوں

کا کرنی اختتام نہ تھا۔ ہاتھوں کا میل اتارنے کے انداز میں روٹیاں مل مل کر
ملیہ و بنا تیں اور خوب شکر گھی ڈال کر ان کو ٹھونس تیں۔ میدہ بھون کر اس میں
آم اور چھنی ملا کر گڑسا پکاتا بچے بھاگ بھاگ کر کام کرتے۔ اسی مہر پر ہیں
چھوٹی کو خیر جو حاتی وہ آن کر بڑھرائیں۔

”اے بڑی کیا ہو گیا ہے تمہیں بیٹے کا گھٹ دو دن میں لڑھا دو گی اے وا:
روز حلوے روز پر اسٹے“

بڑی تھپتھپا کر کہتیں: ”اے رہنے دو تمہیں گھی پتوں سے پیارا ہو گا مولا“ کون
سے حلوے پکے ہیں ایک ذرا لپٹا بنا کر دے دیا تو قیامت آگئی: ”جاء تمہارا یہاں کیا
کام ہے۔ اپنے سیاں کے کولنے سے لگ کر بیٹھو میں جانوں میرے بچے۔“ یہ سب بول
ہونا جیسے دو بہنوں میں لاگ لپٹ ہو رہی ہو میاں اجاتے تو کہتے: ”ہاں ہاں بچے
ہیں کھانے وا“ بڑی یہیں بھی چکھانا“

”اے خاک یہ موا حلوہ ہے؟ نہ خشک میوا“ نہ کیوڑ نہ الا پچی“ یونہی پتوں
کو ہلانے کو بنا دیا ہے تمہارے حلق سے کہاں اترے گا“

میاں چپتے چھوٹی بڑ بڑاتی چلا جاتیں اور بڑیاں غرے پتوں کو بک بک کر دیتیں۔
”لے چو تو اور لے لے“ ”تسکین تو بھی چکھ“ پتوں کے دورے سر سے الگ رہ کر چھوٹی
کو کٹن سکون تھا اور چھوٹی سے پتوں کو چپیں کر اپنا لینے میں بڑی کے جذبہ رقابت کو
کتنی تسکین ملتی یہ تو وہ جانیں یا اُن کا خدا گم یہ ضرور ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ
مطمن تھیں۔ رات کو کہیں بڑیاں اٹھتیں اور میاں کے شہساز کا دروازہ بند کر کے
دل پر گونہ سا پڑتا مگر جلد ہی وہ جی ہلانے کو پتوں میں گم ہو جاتیں۔ کبھی کبھی سیاں

جگنو بنے اُن کی اندھیری کوشری کو جگنو نے بھی آتے مگر اب انھیں خود ہی سمجھنا
سجھانے کا شوق نہیں رہا تھا۔ دل کے نازک شیشے پر بال توڑ پڑھی چکا تھا۔ وہ نہ
ہٹاؤ۔ یہ کیا بڑھبھس ہے دائیں بائیں پچھے سو رہے ہیں؟ وہ عذر پیش کرتیں۔

خدا ایک دُور بند کرتا ہے تو شہر دھکول دیتا ہے۔ بڑیاں پر محبت کا ایک دُور بند
ہوا تھا تو واقعی شہر در کھل گئے تھے جس کو دیکھو مارے محبت اور محبت کے بھیا
جا رہا ہے۔ خاندان میں کوئی شادی بڑیاں کے انتظام کے بغیر نہیں ہوئی۔ کتنی
ہی شادیاں بڑیاں کی بیماریوں کی وجہ سے ٹل گئی تھیں۔ نہ بھیا بڑیاں ہمارے
خاندان کی بزرگ ہیں ان کی حرکت کے بغیر یہ شادی نہ ہو گی۔ وہ چھلنے پھرنے نہیں
تو تاریخ مقرر ہو گئی۔ شادیوں میں وہ کئی کئی بدل ادا کرتیں۔ شادی کا حساب کتاب
کھانے کا انتظام اور پل پل پر ضرورت پڑنے والی ہر چیز کا خیال۔ اسے غلام نے بھیا
ہمارے ہو تو دلہن کی کتنے کے لئے دوسری موی اور ایک کتنی لیتے آنا۔ یہ چیزیں دلو
کے گھر کی ہو رہے ہیں۔ موقع پڑتا تو جاکر سودھیانے سے بھی بھر جیتیں۔ اسے سہل دلو
کے ہاں یہ رواج ہو گا، ہمارے یہاں یہ دستور نہیں۔ غرضیکہ بڑیاں کیا انھیں اچھی
خاصی امرت دھارا تھیں کہ سر میں درد ہو تو ماتھے پر شوب لو پیٹ میں درد ہو تو
پانی میں ڈال کر پی لو، اگر ٹھنڈیاں ہوں تو چینی میں دو قطرے ڈال کر چاؤ۔

دیور کے ہاں بھیا ہونے لگتا تو وہ دلیز کی مٹی لے ڈالتے، بھاجی کے بھاکے
وہ بھی بڑیاں ہی کہتے۔ ارے چلو بڑیاں تمہاری دھن تنہیں بہت یاد کر رہی
ہے۔ کچھ دن تو وہ ٹالینیں پھر آخر ارے موت کے اپنی پٹلی میں اٹرم مشرم باہر نکلتیں۔
اور دو چار چھوٹی منجھلی لونڈیاں چھوٹی کی ناں ناں کر کے ان کے ساتھ ہولہٹیں۔

”اے جانے دو تم سے باقی ہی نہ سنبھلیں گے۔ وہ چھوٹی کیچڑ پڑیں کھلی ادا ملا
تذکرہ کرتیں۔ بات ٹھیک تھی۔ یہ تو وہاں جا کر نواز سیدہ کے پوتے کھونے بازھے
اور اٹھواریں سمٹواریں میں لگ جاتیں یہاں باقی بچے چھوٹی اماں کو ناک چنے
چھوادیے۔ بچے جن جن کرکچہ ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ یہ جان لیوا کام اب ان کے
باتیں ہاتھ کا کیل ہو گیا تھا مگر بڑی کے جانے کے بعد ان کی جانوں کو سمیٹنا
اور ان کی ہٹوں کو پورا کرنا ان کے بس کا نہیں تھا۔ ان کو گئے دو چار دلی ہوتے
کہ یہ ہاتھ پر چھوڑ بیٹھتیں مشکل سے کچھ اردو صبر کرتیں پھر ڈولی لے کر سہجائی
”اے ہے تم تو اکڑ بیٹھ رہیں کچھ گھر کی بھی خبر ہے، بچوں نے میل ناک میں دم کر
دیا ہے“

”لو اور سنو! ابھی کچی کو چھوڑ کر کیسے آجھاؤں مجھ بعد آٹھ دن کو ہونے ہیں
مجھے آئے“

”میں کیا جانوں، منجھلے کو کالی کھانسی ہو گئی ہے۔ کھانسی کھانسی کرم دے
وے ہے“

”اے ہے یہ کیا ہوا، میں تو اچھا مجھ چھوڑ کے آئی تھی، خستوں کے پتے
اور شہد چٹایا؟“

”سب کچھ کر لیا،“ چھوٹی یوں کہنیں جیسے اب دواؤں سے گزر کے دوا
کی کسر رہ گئی ہو۔

”لو تو سنبھالو اپنا ہتھوہ میں چلی جانے میرے بچے کو کیا کروا۔“ اب لاکھ
کوئی روکے وہ نہ رکیں گی، گھر اکدم لیں گی اور منجھلے کی پٹی سے پٹی لگا کر رات

بھر جائیں گی، مچھلی میں آلا بلا مچھلیوں کو اسے دیں گی اور مچھلیوں میں الگ ہو جائیں گی جیسے کسی کو مانت لوٹا کر پخت ہو گئی ہوں۔

بھائیوں کے گھر کوئی بیمار ہو، بچہ ہونے والا ہو یا کسی بچے کی روزہ کشائی ہو کوئی نہ کوئی بڑیاں کو لینے آ پہنچتے۔ وہ تھوڑا بہت عذر کرتیں پھر اصرار کے آگے ہتھیار ڈال دیتیں۔ بھائیوں کی ضرورت پر مٹی کا جانا بھی ضرور اور مچھلی کا یہ کہنا بھی ہے: اب جا کر بیٹھ نہ رہنا، جلدی آجانا، تمہارے پیچھے یہ بچے مجھے کھاجاں گے، تمہارے لاڈلے رو کوڑی کا کر دیا ہے انہیں؟ ہاں ماں میں نے تو سب کو بٹا دیا ہے، چلو تم اچھی ہر کسی سے سبھتے منہ بات ہی نہیں کرتیں۔ اور یہ کہ تمہارے کوئی بچہ بیمار ہو، جوٹ لگ جائے یا چل جائے روتا بھینکتا سیدھا بڑیاں کے پاس آتا مچھلی مارے مامسا کے درمیان میں کہتی رہ جاتیں۔ اسے ہے کیا ہوا، ادھر آ، میں دیکھوں، بچہ پلٹ کے دیکھے بغیر سیدھا اس اندھیری کو کٹھری میں پہنچتا جو بڑیاں کا ٹھکانہ تھا۔

گرمیوں کی روز چروس میں سارا زمانہ سو جاتا، ستوں تو بڑیاں اور ان کے چیلے چانٹے۔ وہ بیٹھی مچھلی مچھلی کترؤں سے بٹوے بستی رہتیں اور بچے لڑتے رہتے، یہ میرا ہے۔

”واہ تمہارا کہاں سے آیا، اُس دی بھی تم نے لے لیا تھا، یہ میرا ہے، بڑیاں؟ وہ بڑیاں کو میکوٹ میں ملاتا۔

”اسے ہے بننے تو دو، پہلے ہی اسے ہا کے ڈال دی، لے بڑو دھاگو بڑو دھاگو بننے، بٹوے اور تلے دانیوں بتیں اور بتیں۔ قرآن شریف کے ٹکڑے غلام کوٹے

لپکے لگ کر تیار ہو گئے۔ اس سے دل اکتاتا یا بچے فرمائش کر بیٹھے تو جلتی دودھ پہلا
میر جو لے کے پاس جا بیٹھتیں اور ہنڈ گلیاں شروع ہو جاتیں۔

ایک دیور جانے کہاں کالے کوسوں رہتے تھے، بیوی کے بچے ہونے لگا تو
انہوں نے بڑیاں کو بلا بھیجا۔ چھوٹا سا نقبہ جہاں کوس بھر پر کوئی بڑھی ٹھڈی
دائی رہتی تھی، اسی کا سہارا تھا جو فی شدنی عین وقت پر برابر کے گاتوں میں سیت
ہو گئی وہ چٹسے میں چلی گئی۔ ایسے وقت خدا نے بڑیاں کو موت دی کہ انہوں نے
باورچی خانے کی گھٹل چھری سے نال کوٹا، گرم پانی کر کے بچے کو نہلایا، اور جیسے
تیسے زچہ کو سنبھال لیا۔ دائی اپنا حق پھینے جا سفر بردل ہی دل میں عرصے تک چپکاتا
کھاتی رہی۔ انہی کے ہاتھوں ایک اور بچی نے ریلوے ٹرین میں جنم لیا یہ وہ نانا تھا
جب بچے خدا کی دین ہوا کرتے تھے۔ ہر سال نہیں تو دوسرے سال ہر گھر میں ایک نئی
دور کا آنا گویا فرض تھا، اسی لئے ہر گھر میں بڑیاں کا چھیرا لگتا ہی رہتا۔ سیکڑوں
بچے دائی اور نرس کے ہاتھ سے سیدھے بڑیاں کے ہاتھوں میں آتے تھے۔ ان
کے ہاتھ سے گھٹی پینے والے بچوں کی گھٹی ہی نہ تھی اور تو اور خدا ان کی دوا تک بڑھی
عورتوں کو قبر میں پہنچانے سے پہلے غسل دینے کا کام بھی کر چکی تھیں۔ غرض کوئی ایسا
نام نہ تھا جسے کوئی عورت کر سکے اور بڑیاں نہ کر سکیں۔ احسان ماننے والے جس
طرح داسے ورثہ بن پڑتا ان کا احسان امارت کی کوشش بھی کرتے۔ چلتے وقت
کسی نے نیا ریشمی بوڑا بنا دیا۔ کسی نے نئی رضائی دے دی۔ اس طرح ان کو پرانا
ٹرینک ریشمی کپڑوں سے پور ہٹنا پسندی تو کم ہی تھیں۔ مروج میں آتیں تو بھی نئی جھجکیوں
کو بانٹ دیتیں۔

ایسے ہی کسی کام سے گھر سے کوسوں دور تھیں کہ میاں کی بیماری کا آثار پہنچا۔
ہوائی جہاز ان دنوں تھے مگر صرف آسمان پر اڑتے نظر آتے تھے۔ ان میں سفر کرتے کسی
کو نہ متعلق۔ لے وے کے ریل گاڑیاں تھیں جو کھڑے کرتی دن رات چلتیں تو زمین
وہ میں لمبے سفر بھی طے جو ہی جاتے۔ بڑیاں گھر پہنچیں تو میاں کو زمین کے نیچے سوتے
بھی دیر ہو چکی تھی۔ باہر ٹرپنی اڈے سے روئے چلنے میں مصروف تھے، اندر پتوں
سے سرو جھانگے محمد نیکس ہل ہل کر قرآن شریف پڑھ رہا تھیں۔ خود تو عمر سے یہ اوس
کی طرح رہتی تھیں مگر سوکھ کا سفید دوپٹہ اور سر کٹھے سے ہاتھ دیکھ دیکھ کر دل
پر گھونسا پاڑا اور وہیں دلیز پر گر پڑیں۔ پھر سب ہوش میں آئیں تو سارا گھر پیسے کی
طرح سنبھال لیا۔ چھوٹی سے وہ پہلے بھی نہیں جلتی تھیں۔ اب تو وہ قابلِ رحم تھی۔
اس کے پاس ایک میاں تھا وہ بھی نہ رہا۔ ان کے بچے ماشاء اللہ سب حیات
تھے۔ پھل پھول رہے تھے۔ جس طرح مالی اپنی پھولتی پھلتی کیاری کو دیکھ کر خوش ہوا
کرتا ہے اسی طرح بڑیاں اپنے پوتوں اور نواسوں کی فوج کو دیکھ کر نہال ہوتیں۔
بچے بھی سب بڑیاں کو برابر یاد رکھتے۔ آخر ان کے گھروں میں بھی مذہبیاریاں
نقد نہیں اور بچے ہوتے تھے۔

بڑیاں پر دوسرا اثر احمد چھوٹی کی موت تھی جس نے ان کی کڑوادی۔ ایک
دو نہیں تیس سببیں سال کا ساتھ، پھر اس نے خدمت بھی تو نہیں کروائی اس کا
بھی امنیس ختم تھا بس بیٹھے بھٹائے چل کھڑی ہوئی جیسے میاں کے پاس جانے کو
ادھار کھاتے بیٹھ جو۔ بڑیاں کو یوں لگا جیسے کوئی برسوں سے تنہا ہی ہوئی لاشی
ہاتھ سے پھین کر بھاگ گیا ہو۔ اچانک دنیا کیسی خالی خالی لگنے لگی۔ اس زندگی

میں کیا خاک دکھا ہے جس میں میاں اور چھوٹی نہ ہو۔ رہے ان کے بچے تو اصل میں یہ تھے تو اسی میل کے بیچ جو اچانک سوکھ گئی تھی۔ چھوٹی کسی گھٹاؤنی سی جیہدی میں مبتلا ہوئیں، بیماری طول کیسے تھی کچھ دل پر میل آتا تو دریاں ہوتی مگر ان کے یوں چل دینے میں تو سوائے احساسِ محرومی کے کچھ نہ تھا۔ بڑیاں اس جیت کی طرح جیٹھ جیٹیں جس کے نیچے سے اچانک ستون کیسے لیا گیا ہو۔ اس بڑی سی حویلی میں جہاں کبھی بند دروازے دل پر دھوکے دیتے تھے گھوٹے پھرنے کا کچھ مزانہ نہ۔ آج بھائیں بھائیں کرتے کھلے دروازے کھانے کو آتے تھے۔ حلویے بنانے میں کوئی سواد نہ تھا۔ جب کبھی پر کوئی ٹوکنے والا نہ ہو۔ بچوں کے ساتھ چاؤ پونچھوں میں بھی تو جب ہی ٹکے تھا کہ چھوٹی مٹا لے پر تھی اب تو وہ پانے کے اس سرخ کی طرح تھیں جس کے سارے مقابل کھپ گئے ہوں ایسی جیت اور شاہی کس کام کی۔

پھر وہ دور آیا جو اب تک بہت سے دلوں میں ناسد بہن کر پل رہا ہے جس نے تخت والوں کو تخت الٹنی میں پہنچا یا اور پورے نشیون کو بادشاہی دی۔ ۷۷ء میں سارا کنبدیزہ ریزہ خواجہ کے جیتیم چھانڈا بے گھر بے دراس سرزمین میں پہنچا جسے پاکستان کہتے ہیں اور پورے ملک میں جس کو جہاں سرچھ پانے کی جگہ ملی بیٹھ گیا۔ اہا افراتفری میں کیا کھویا کیا پایا حساب کتاب کرنے کی بھی کسی کو فرصت نہ تھی نفسی کا ایک دند تھا 'آیا اور چلا گیا' گدوہ بات پھر پیدا نہ ہو سکی 'اکوڑے دل پھر نہ جے' مجھے کی کوشش میں لوگوں نے چاہا اپنی جڑیں مضبوط کر لیں کھو دنا ہی ہے تو کیوں نہ ذرا گہرائی تک کھودیں۔ سب اسی کھودنے اور مجھے کی تک بعد میں پڑ گئے اور کسی نے نہیں دیکھا کہ بڑیاں اس بڑے درخت کی طرح جس کی ایک آدھ ہی جڑ

جم پانی ہو، آہستہ آہستہ سوکھ رہی ہیں۔ اس عادی دارو گیر میں ان کا پرانا بزرگ
 ٹرنک تو صبح سلامت پہنچ گیا تھا مگر وہ خود آدمی ہی آ پانی تھیں۔ اسی کے دماغ
 پر کچھ اثر ہو گیا تھا جس کا احساس ایک دم نہیں دھیرے دھیرے ہوا۔ کام کرنے
 کی وہ بے پناہ دھن اب نہیں رہی تھی کسی نے کہہ دیا تو کر لیا۔ ورنہ بس ٹھلے باتیں
 جیسے پاؤں میں پیچھے لگ گئے ہوں یا کسی نے چابی دے کر بھڑوایا مہلہ بڑیاں اب
 بس کرو جھک جاؤ گی، لو بے گھر کر رہی سبزی بنا دو، وہ سبزی بنا رہیں اور پھر ٹھلے
 کر رہیں۔ چلتے چلتے خود ہی بڑ بڑاتی رہیں۔ کوئی غور سے سننا تو بڑ بڑاہٹ کا
 موضوع کوئی ایسی بات ہوتی جو انھیں بڑی لگی ہو چاہے وہ آج ہوئی ہو یا
 مہینوں برسوں پہلے۔

”بڑیاں کس سے باتیں کر رہی ہو؟ کوئی پوچھتا تو وہ بڑ بڑاتیں۔“

”اے واہ کس سے باتیں کر رہی ہوں؟ خواہ مخواہ مجھے تنگ مت کی کوڑے
 اور ٹھلے جاتیں۔ اسی دھیرے انھیں بھوک بہت لگتی۔ ہر وقت باورچی خانہ ٹھلے
 اب د آتنا کام بھی نہیں کرتی تھیں کہ گھر کے بچوں سے بڑھ کر انھیں کھلایا جائے
 ”اے جے بڑیاں تم نے تو بچوں کو بھی مات کیا ہے، ہم نے تو تم سے بھی
 پہلے ناشتہ کیا ہے“

”بھوک لگی ہے۔ وہ حاجت سے کہتیں۔ پھر جو کچھ بھی روٹی، باسی سالن
 اور پڑا پڑا دودھ نظر آتا ہی ڈالتیں۔ کھپ پی کر وہ پھر ٹھلنا اور بڑ بڑانا شروع کرتیں
 ۔ چہل قدمی اتنی بڑھی کہ کمرے اور دالان کا چکر لگا لگا کر انھوں نے گھر
 والوں کو کھس چکر بنا دیا۔ ہر وقت کی بھوک نے گھر والوں کو کھلایا اور بڑ بڑاہٹ کا

یہ عالم ہوا کہ وہ چلتی تھا سے لڑنے لگیں۔ پڑا ہوتی تو بھنبھلاتیں، اسے راہ جا اپنا کا
 کر، کیوں دماغ چاٹ رہی ہے مارچوں چوں چوں اور کوئی کام نہیں ہے تجھے
 مرنی کڑکڑاتی تو پھٹکتیں، ہاں ہاں، حکیم صاحبہ سن لیا انڈا دیا ہے تم نے، بس اب
 زیادہ صبر، انراؤ، سارے زمانے کی مرغیاں انڈے سے دیتی ہیں ایک ختم ہی مرانی
 نہیں، جو بچے کسی لیتے تو تماشہ بنا لیتے، وہ اور بھنبھلاتیں، بچوں کو سناتیں تو وہ
 اور چھڑتے، غرض گھر میں یہ جنگامہ چڑھ چڑھی عورتوں کو بد مزہ کر دیتا وہ بچوں کو
 مارنے کی دھمکی کے ساتھ پڑتیاں کو بھی باتیں سناتیں کہ خواہ خواہ بچوں میں بچی
 بن رہی ہیں۔ فوراً شرم بچوں کی طرح انہیں کسی کام میں بھنسا دیا جاتا جسے وہ
 اٹھا سیدھا کر کے پھر محاذ پر آنے بیٹھتیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اپنی جن دلی خواہشات
 کو وہ ایک زمانے میں کام کر کر کے بھولی تھیں اب انھوں نے دوسری آواز
 راہیں ڈھونڈ لی تھیں۔ کام میں اب ان کا دل نہ لگتا تھا معلوم ہوتا تھا جیسے
 رستیاں نڈا رہی ہوں۔ آتا جیسے وہ کسی زمانے میں بڑے پیار سے سچ سچ گفتگو
 کیاں مار کر گوندھا کرتی تھیں اب منٹوں میں گول کر رکھ آتیں۔ روٹیاں پکاتیں
 تو کبھی جلی کبھی کچھ، ہانڈی بھونتی تو چراندہ رہ جاتی۔ برتن دھوتیں تو مار چکے اور
 چکے کہ ایک ایک برتن دوبارہ دھونا پڑتا۔ گھر کی عورتیں بہتیرا جتا جتا اور
 سنات کر کہتیں مگر ایک کان سے سن کر دوسرے سے صفحہ اڑا دیتیں۔

اب لوگوں کا معیار زندگی بھی اُنچا ہو رہا تھا۔ چھوٹے سے گھر میں چاہے
 گھر والوں کے بیٹھنے کی جگہ نہ ہو مگر مہمانوں کے لئے سنتے سے صوفے فروز
 ہوں۔ رات کو بچے ایک پلنگہ پر چار چار سوئیں مگر نیا م گھر سے خریدی گئی کھانے

کی میز اور کرسیوں کو جگہ ضرور ملے۔ بچے بھی اب گھروں کی بجائے اسپتال میں پیدا ہونے لگے تھے۔ شادیوں میں اب ایسے "ایٹ ہوم" ہونے لگے تھے جس میں بڑی امتانوں کی ضرورت ذرا کم ہی پڑتی ہے۔ ایک تو چیز کی مانگ پہلے ہی کم ہو اور پھر اس کی کوالٹی بھی خراب ہو جائے تو اس کو کون دھارے گا۔ بڑیاں بھی بقول ایک انگریزی دان پوتے کے اب "نیوسنس" ہو گئی تھیں۔ اچھے کھاتے چنے گھڑاؤ میں تو قطعاً ان کا ٹھکانہ نہ تھا ہاں پرانے دھرانے گھروں میں ٹوٹی چارپائی کی عطر کرنے میں پڑی رہتیں مگر چند دن گزرتے تو کسی نہ کسی بہانے سے ان کی بلائی دوسرے گھر روانہ کر دی جاتی۔ جہاں گھر میں کوئی بیماریا ہو یا صحت آنے تو سب سے پہلا کام یہ ہونا کہ بڑیاں کو رکشہ میں بٹھا کر کسی دوسرے نواسے یا پوتے کے ہاں چلتا کیا جاتا وہاں دو ایک دن ان کی آؤ بھگت ہوتی پھر بدی اخبار کی طرح ادھر ادھر لڑتی پھرتیں۔ ان کی بھوک اور بڑبڑاہٹیں جب زیادہ پریشان کرتیں تو کوئی بہانہ ڈھونڈ کر انھیں تیسرے گھر بھیج دیا جاتا۔ گھر کی لڑکیاں کسی دیکھی طرح ان کے ٹنگ کے کپڑے اڑانے کی فکر میں رہتیں۔ ان کی قسمت سے تنگ بچائے کی فحش لوٹ رہی تھی اور پرانے زمانے کی سسی ساٹن اور مشقی میں بند ہو جانے والے دوپٹے اب کہاں ملتے تھے۔ محبت کی بھوک بڑیاں کے جب لڑکیاں کھسی لگاتیں تو وہ خوش ہو کر فدا ہو جڑے کے جوڑے ان کی نذر کر دیتیں۔

اب بڑیاں بڑے بڑے خیرچ ہوتا اس کا حساب ذہنوں میں محفوظ رکھا جاتا تاکہ موقع موقع پر دوسرے رشتہ داروں کو ملایا جاسکے۔ ایک یہ بڑیاں انھیں جن کو ہر گھر میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا اب مانگ برابر کی چھوکیاں کہتی تھیں

کام کی نہ کاج کی سیر بھرانا ج کی : ”جب دیکھو بادری خانے میں کچھ نہ کچھ مٹول رہی ہیں۔ بچے بچے کو پتہ تھا کہ یہ ہماری سگی نانی دادی نہیں ہیں بے اولادی ہیں بے چاری ہم نہ رکھیں گے تو اور کون رکھے گا۔“

”اے ہے یہ رات کا قہم ہے چھپا دے نہیں تو وہ نکل لیں گی : ”ان کے بارے میں ایسی باتیں اب عام ہو گئی تھیں۔ بھوک کی خدّت اور تشکیں کی کمی نے جنوں کو ایک اور را شبجانی، شہلے تھلے آتیں اور ناک ہوا میں دے کر گتیں : ”اے بے سید کی خوشبو آرہی ہے نا کہاں ہیں مٹی ارے ایک ٹکڑا ہیں بھی دے نا : ”مٹی جسے خود سید سوٹھے برسوں ہو گئے تھے جل کر گستی : ”سید نہ کچھ اور پاگل ہو گئی ہو ہر ماں تم تو : ”گمزدہ اس وقت تک سید سید کی رٹا لگاتے رکھتیں جب تک انھیں دوسرے کمرے میں امر دیا کیلے کی خوشبو نہ آجائے کسی نے گھر میں جا کر جب انھیں یہ خوشبو آتی تو گھر کا کوئی شریف پتھر یا نصیات کا ادھر بکھرا طالب علم انہیں یہ چیزیں لا دیتا کہ شاید اسی طرح ان کا دل بھر جائے مگر ان باتوں کا الٹا اثر ہوتا پھر تو ان کی ناک را وہی دیکھ لیتی : ”کبھی تو دے کی خوشبو چلی آرہی ہے : ”کبھی متغی : ”کبھی بریانی : ”اتنا حوصلہ کوئی کہاں سے لانا : ”پھر ہی دی سے تو قویں میں شروع ہو جاتی : ”خالی پیٹ کب تک ان مرغین کھانوں کا ذکر اور خوشبو برداشت کرتے : ”کام دام اب وہ نہیں کرتی تھیں : ”اول اس لئے کہ ان کو سمجھائی کم دیتا تھا : ”دوسرے لوگوں کے کہنے کے مطابق بادلوں میں جان ڈال لی تھی ورا سی ویر میں وال کا ولیہ کر رہیں : ”کچھ دن بعد ان کے جنوں نے ایک اور نگ پکڑا : ”انھیں یہ خیال ہو گیا کہ لوگ انھیں چھوڑ کر سبھاگ

جائیں گے۔ سارا دن گھبرا گھبرا کر کہتیں: "ارے کہاں جا رہے ہو، مجھے بھی ساتھ لے چلو؟"

ہر نئی بات کچھ دن تو مذاق رہتی پھر جی کا جھلا پابن جاتی۔ اچھا بھلا ایک آدمی گھر میں بیٹھا ہے دوسرا اس کے سسر ہو رہا ہے کہ بول تو کہاں جا رہا ہے؟ تو وہ آپ ہی مر کھنا بیل بن جائے گا۔ بوں بوں ان کی آنکھیں کمزور ہو رہی تھیں تو ان توں یہ وہم بڑھتا جا رہا تھا۔ ذرا گھر میں خاموشی مونی اور وہ برائیں۔ اسے کہاں چلے گئے سب مجھے چھوڑ گئے، ہائے میں اکیلی رہ گئی، کیا کریں، کہاں چلے گئے سب؟

"مر گئے۔" جل کر کوئی کہتا تو وہ کھل اٹھتیں: "ہو! ارے میں سمجھی سب چلے گئے۔"

یہ مرض بڑھا تو وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر میاں بیویوں کے پلنگ ٹھونسنے لگیں۔ سوتے میں چونک کر کوئی چلا اٹھتا، کون؟ تو وہ بڑی ہی مصیبت سے کہتیں: "سو رہے ہو؟ میں سمجھی چلے گئے؟"

ایک دفعہ کسی شخص کو جبک جبک کر چلتے دیکھ کر کوئی بچہ ڈر کر چیخ اٹھا سارے گھر میں چور چور کا شور مچ گیا۔ محلے والے سب اُٹھے اور آخر میں نکلا کون بڑھا۔ یہ باتیں برداشت سے باہر مونی جا رہی تھیں۔ ہر آئے گئے کو سنائی جاتیں تاکہ ان کے سہارے موقع پاتے ہی انہیں کسی اور گھر روانہ کیا جاتے۔ کہاں تو وہ سالوں رہتی تھیں تو لوگ اور رہنے کا مطالبہ کرتے تھے اور اب جینے میں جاگرم گھوم لگتیں۔ ریشمی کپڑے بٹ بٹا گئے تھے اور ان کی جگہ بے ہوشے کپڑے پھینچا

کو ختم ہو چکے تھے۔ بستر بھی بوسیدہ اور خراب تھا مگر اب ان کو کھانا بھی ملے گا کہ اس منگائی کے زمانے میں ان کے لئے جوڑے اور گھوڑے بھی ہوتے۔ گھر میں تقریب ہوتی تو بڑیاں کو چھپا دیا جاتا یا دوسرے گھر بھیج دیا جاتا۔ ہاں نہیں تو بڑیاں ہی پھریں گی سارے گھر میں اصل ڈر اس بات کا تھا کہ کسی نے دیکھ کر پوچھ لیا کہ کون ہیں تو کچھ کہتے بن نہ پڑے گی اپنا گھنا کھو لو آپ ہی لاجوں مرو۔ اب ان کی حالت اس قابل نہ رہی تھی کہ انھیں کسی کے سامنے غریہ پیش کیا جائے اور جان بوجہ کر ہلکی کرانے کا فائدہ! افیش ایل گھرانے ہاتھ جوڑتے کہ ہمارے ہاں باہر کے لوگوں کا آنا جانا ہے انہیں یہاں نہ بھیجو البتہ کھانے پینے کا خرچ دینے کو تیار ہیں۔ یہ بھی زبانی جمع خرچ تھا کون مانگتا تھا اور کون دیتا تھا۔ جس گھر میں پڑ جاتیں آپ ہی روٹی دے دیتے کھانے کا خیمہ لینے کی بدنامی کون سستا۔

دن گزرتے رہے۔ گھر والوں کو پتہ بھی نہ چلتا۔ باہر والا کوئی بہت دن بعد دیکھتا تو کہتا بڑیاں بہت کمزور ہو گئی جو بڈیوں سے ہاتھ لگ گیا ہے۔ گھر والے بتاتے کہ کوئی خاص بیماری نہیں ہے بس جو کا ہو گیا ہے اس لئے پیٹ سدا خراب رہتا ہے یا پیٹ میں کیڑوں کا بیڑا ہے کہ ہر وقت کھانے کی شقی ہیں۔ انکھیں بھی اس رفتار سے روشنی گھور رہی تھیں کہ پاس رہنے والوں کو کچھ اندازہ نہیں تھا یا پھر ان کی حرکتوں نے اس قابل ہی نہ رکھا تھا کہ کوئی ان کے بارے میں سجدگی سے سوچتا اور گھر کے ہزار کڑے جھگڑے سنتے کہ گھر میں بڑی ہوئی بڑی بی کے پیچھے لوگ خوار ہوتے پھرتے۔ اچھے بھلے آدمی کام کرتے

مکرتے تھکے جا رہے تھے۔ ایک صبح کے گھر سے نکلے ہوئے کہیں اندھیرے میں گھر ٹوٹنا نصیب ہوتا۔ کراچی کی زندگی تھی کہ سانس لینے کا موقع نہ دیتی تھی۔ مگر وہ کلینسٹر کیس ہرچیز محض محسوس تھی۔ جگہ اور وقت کی کمی کی بات کوئی کراچی والوں سے پوچھے، گھر کے سیکڑوں ضروری کام برسوں ملتے رہتے۔ کوئی بیمار ہوتا تو یہ سوچ کر جان نکلتی کہ کون گھنٹوں جا کر دوا کے لئے قطار میں کھڑا ہو۔ عطارد اور نیم حکیموں کی چاندی جو رہی تھی۔ بیماری کے اسپیشلسٹوں تک رسائی باڈیوں کے درباروں کی رسائی ہو گئی تھی۔ ایسے میں کون انھیں ہسپتال لے جانے کی صدمہ کا ذمہ لیتا اور لیتا بھی تو کس سے یہ ہفت خواں ہوتا۔

دن یوں ہی گزر جاتے اگر بات اور نہ بڑھتی، مگر کون چیز دنیا میں ہے جو ایک حالت میں ہے جسے تقریباً نہیں۔ ہر آدمی ہر شے بہتر یا بدتر صورت میں بدلتی رہتی ہے۔ بڑھتا کی حالت کی بہتری کی کیا امید تھی بس دن بدن بگڑتی رہی تھی۔ جب تک وہ خود چل پھر لیتی تھیں۔ ان کی باتوں کو رو دھو کر برداشت کر لیا جاتا تھا مگر جب فوٹ یہاں تک پہنچ کر غسل خانے لے جانا ہو تو ہاتھ پکڑ کر لے جاؤ تو بڑی مشکل پیش آتی۔ وہ چلائی رہتیں اور ابھی ذرا تو صبر کر دوں تو پتوں سے بھی گئی گزری ہو گئیں۔ وغیرہ آوازیں ان کے کانوں میں پڑتی رہتیں۔ اگر وہ صبر کرتی رہتیں تو اس صبر کی کوئی میعاد نہ تھی۔ چنانچہ وہ ٹھول کر اتریں اور جس جگہ کو غسل خانہ سمجھ لیتیں وہیں بیٹھ جاتیں۔ بعد میں بڑی ہائے ہرمنی۔ کراچی کی بھگتیں ہر وقت ہاتھ نہیں آتیں اور اب تو جب سے گھروں میں فلش عمارت ہو گئے تھے انھیں گندے کام کرتے ہوئے اٹھانے لگی تھیں۔ ایسی حالت

میں جب گھر والوں کو ان کی بے جا حرکتیں سمیٹنا پڑتیں تو ان پر کوسے کاٹنے نہیں
 تو کیا پھول برستے۔ اب وہ یا تو ان باتوں سے بالا ہو چکی تھیں یا سُن کر انجان
 بننے میں عداوت ہو گئی تھی کہ ذرہ بھر پروا نہ کرتیں۔ بس تکیے سے سرُٹکائے گروا
 اُگے جھکائے، آنکھیں بند کئے، ہونٹ بچوں کی طرح بسورے خنودگی کر جانے
 کوئی سے عالم میں کھوئی رہنیں۔ دن رات ان کے لئے برابر ہو چکے تھے جس وقت
 اس ہوشی سے چونکتیں سب سے پہلے کھانا مانگتیں چاہے اس وقت رات کے
 دو بجے ہوں یا صبح کے چارہ۔ لوگوں نے اب نوٹس لینا چھوڑ دیا تھا کھانا اس
 وقت دیا جاتا جب کھانے کا وقت ہوتا، بس ان کی موجودگی کا احساس اس
 وقت ہوتا جب وہ ایسی ایسی حرکت کو بیٹھتیں۔ ان حرکتوں میں اضافہ ہوا تھا نہیں
 گھر کے باہر ایک ایسے کمرے میں ڈال دیا گیا جہاں وہ بوجی چاہے اور جہاں
 جی چاہے کرتی رہیں۔ دوسری صبح بھنگن ناک پر کپڑا باندھ کر کمرہ دھو جاتی۔ اس
 دھلائی اور خراب ہو جانے والے کپڑوں کے پیسے وہ الگ لیتی۔ بڑھیاں کے کمرے
 میں سے مرغیوں کے ڈبے ایسی کھراڈ آتی ان کو کھانا دینے والا بھی سانس
 روک کر بمشکل چند منٹ وہاں ٹھہرتا۔

وقت کسی کے لئے رکتا تو نہیں۔ دن اور راتیں زمیں کے گھوڑوں کی طرح
 بھاگے جاتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے لڑکیوں کے چہرے پر حیا اور لڑاکوں کے کٹوں
 پر بال پھوٹ آتے ہیں۔ شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگتی ہیں، پھر ان کے بچے
 بڑے ہو جاتے ہیں اور وہ بھی اسی تیزی سے بڑھنے لگتے ہیں۔ بڑھیاں کے پوتے
 بھی آل اولاد والے ہو گئے تھے ایک پڑپوتے اور ایک پڑنواسی کی شادی ٹھہر گئی

تھی۔ جیسا کہ آج کل کا دستور ہے۔ بڑی محنت سے بڑے گھرانے چھوٹے گھرانے
تھے۔ شادی کی تیاریاں بڑے زوروں پر تھیں۔ بڑے گھرانوں سے ٹکر لینے نے
سارے گھر کا پیسہ نکال دیا تھا۔ پھر بھی بات بنتی نظر نہ آتی تھی۔ ایسے ہی ایک
دن جب گھر میں لیا جھپ جوڑے ٹلنے جا رہے تھے، بڑیاں چپکے سے چل بسیں
صبح کو کوئی ناشتہ لے کر گیا تو دیکھا ختم ہو چکی ہیں۔ ان میں تھا ہی کیا ایک سانس
چل رہا تھا وہ کسی وقت خاموشی سے یوں بند ہو گیا جیسے کسی نے سویرے آف
کر دیا ہو۔ فوراً انھیں اٹھا کر گھر میں لایا گیا مگر طرف سٹاٹا سا دوڑ گیا کسی طرف
سے آہ و بکا کی آواز بلند نہیں ہوئی لڑکیوں نے چپکے چپکے دو چار آفسو بہا۔ مرنے والی
کی موت پر نہیں بلکہ ان کے ساتھ اپنی زیادتیاں یا نالائقیات یاد کر کے غلام
والوں کو اطلاع دی گئی۔ بڑیاں کا خاندان بڑے درخت کی طرح پھیل کر کہیں کا
کہیں جا پہنچا تھا۔ لوگ آنے جاتے تھے، چپ چاپ بیٹھتے جاتے تھے ان کے
سارے آخری کام بڑے سکون سے ہوئے اور وہ ایسی خاموشی سے وداع کر دی
گئیں جیسے کسی بیوہ عورت کی نصیحتی ہو۔ اس کے بعد کامر محلہ زیادہ شور مچا۔
ایک شادی میں چار اور دوسری میں پانچ دن تھے۔ دنیا والے کیا کہیں گے کہ
میں بڑی بی کا جسم بھی ٹھنڈا نہ ہوا کہ بیٹھے پوتے رنگا رلیاں مندا رہیں۔ لاکھ کچھ
ہو دیں سے دنیا کہنی بھاری ہے، شادی کی تاریخیں ٹالنی پڑیں گی۔ مگر شادی کی
تاریخیں بدن بھی مشکل تھا۔ کہاں کہاں سے لوگ آئے بیٹھے تھے، ایک بھائی بھائی
جبانے کو پاؤں پر کاب بیٹھا تھا۔ لڑکی کا دل لہا چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ پھر جانے کب چلی
ٹلے اور لڑکیوں کی شادی میں آج کل دیر دوراں سے سب نہیں، کب دامن میں

آیا ہوا انچی پھر پھرا کر نکل جائے۔ ہاں نہیں تو جن گھروں میں شادیاں تھیں وہ ہرگز انہیں شان نہیں چاہتے تھے صرف کنبہ برادری کا ڈرتا تھا سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کیا جائے۔ روز صبح سے شام تک بحث ہوتی مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچا جاتا۔ رقت انسان کم تھا کہ مزید بحث کی گنجائش بھی نہ رہی، تاریخ بڑھانی ہے تو فوراً بڑھادو کمانے والوں کو بڑ رقت اطلاع تو دی جا سکے مگر بڑیاں کے ایک سمجھدار بیٹے نے آخر اس مشکل کا حل ڈھونڈ لیا۔ دیکھو یہ موقع اچھا ہے، شادی کد مگر دھوم دھڑکانہ کر دے کھانے کے بجائے معمولی سی چائے ہو جائے۔ بہان بھی کم جلتے جاتیں کہ بس شرعی رسم کر رہے ہیں۔ بہان ہمارے پاس ہے ہی کہ ہمارے ہاں ایک بزدل خاتون کا انتقال ہوا ہے ہم دھوم دھام سے نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو یہ موقع پھر کبھی نہ آئے گا۔“

چنانچہ یہی ہوا۔ بڑیاں مرتے مرتے بھی ایک کام کر گئیں۔ جن تقریبوں میں ہزاروں خرچ کرنے کے بعد بھی اُلا بنے کا دھڑکا تھا انہیں سیکڑوں پنڈتا گئیں اور کسی طرف سے کوئی اعتراض نہ ہوا۔ سچ ہے نیک آدمیوں کی موت بھی نیک ہوتی ہے۔

”سیپ“ کراچی

سراب

ایمہ گرین کلب کے وسیع لان میں کچھل شوہر ہوتا تھا۔

میں نے ہزار بار بڑی منت سے رخصت کو سمجھایا کہ میں گھر واری میں اتنی الجھ چکی ہوں کہ اس قسم کے ہنگامے اب میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے مگر وہ نہ مانے۔ کہنے لگے: ”تمہارے لئے ہی تو میں ٹکٹ خرید کر لایا ہوں ورنہ مجھے پچاس روپے خرچے کی کیا ضرورت تھی؟“

”پچاس روپے؟“ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ چائے کا نیا سیٹ ہاتھوں سے پھینکتے پھینکتے بچا۔ ارے ارے“ رخصت نے لپک کر بیالی سنبھالی۔ ”تم تو ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتی ہو۔“

”آپ کو پچاس روپے نا تھی برباد کرنے کی کیا مصیبت تھی؟“

”بھئی۔ وہ۔۔۔“ رخصت قد سے نادام ہو کر بولے ”اپنے وسیع صاحب

ہیں نا۔۔۔ آنکھوں نے ہی شوکر دیا ہے۔ سن کا بے حد احاطہ تھا کہیں تمہیں بھی لیکر آؤں؟“

”اُن کا کیا ہے۔ چندہ جمع کرنے کو تو وہ ساری دنیا کو کھٹ کر لیں گے اُن کی بلا سے بعد میں کوئی ناقص مترادف ہے۔ میں ایک سو مجکڑنے کے موڈ میں اُٹھی، کوئی جھگ بھی ہو جھلا! ایک نہ دو، اکٹھے پورے پچاس روپے۔ کوئی خدا کا خون بھی ہوتا ہے۔“

لیکن رفعت نے گھبرا کر منہ پھیر جانے میں ہی عاقبت سمجھی۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے شکست خوردہ سی آواز میں بولے: ”نینا کا ڈانس پروگرام ہے۔ ڈانس؟ اور وہ بھی نینا کا، میں نے سنک میں گرم پانی انڈیل کر چلی جلدی برجن ہا ہرنکالنے شروع کئے اور پونچھے بیٹھ گئی۔ بار بار سی خیال آتا رہا کہ گرمی میں دھنس کر میرے جیسی عورتیں وقت سے کتنی پہلے بڑھی ہو جاتی ہیں۔ نہ کہیں گئے کا خیال نہ جانے کا۔ بس پیٹ کاٹھے اور خواہشات کا گلا گھونٹتے ہی گزرے پھل جاتی ہے، مگر زندگی تو نینا جیسی لڑکیوں کی ہوتی ہے جو کبھی بڑھی نہیں ہوتیں۔ جیسا ایور گرین کلب، ویسی ہی ایور گرین نینا!

چمکتی آنکھیں، دھکتے گال، لہراتے بال اور ٹھٹھکتی ہوئی چال۔ سکول کے دنوں میں بھی وہ ایسے ہی جھللاتی تھی جیسے خلیہ میں ہٹا کر آئی ہو۔

ہم دونوں ایک سافٹ پیس کی منتریں طے کر کے جڑی موٹی تھیں۔ اُس نے تعلیم مکمل بھی نہیں کی تھی کہ اپنے پیار کے ساتھ سوئٹزر لینڈ چلی گئی تھی۔ سمیع صاحب بڑے مصروف کاروباری آدمی تھے۔ آدھی دنیا میں اُن کے دفتر کی شاخیں پھیلی تھیں۔ بنگلے پر تین تین کادیں کھڑی رہتیں۔ باوردی ڈرائیور ایک اشارے کے منتظر ہوتے۔ اندر ڈرائنگ روم میں ریکارڈ پلیئر پر بدلتے بدلتے مضمضروں میں انگریزی

دھیس بھتی رہتیں قیمتی قالینوں پر سفید روشنی کے لڑھکتے۔ نینا کی مٹی خوش رنگ کی ساڑھی پہنے بڑے انتہام سے کافی بنا یا کرتیں۔ اُن کے گلے میں بڑے ہوئے نت نئے ڈیزائن کے ڈائمنڈ کٹ نیگلےس آنکھوں کی روشنی کوٹ لیا کرتے۔ ذرا سی چمک ہوتی تو یوں لگتا جیسے تارہ ٹوٹا۔

اکوٹی اولاد تو لگینہ ہوتی ہے جسے تراش تراش سے میرا بنا لیا جاتا ہے۔ نینا کی تربیت صبح صاحب نے بڑے دھیان سے کی تھی۔ اُس کے لیے ایک چھوٹا چار چار اُستاد ہفتے میں مختلف اوقات میں آتے تھے۔ ایک پہلے ڈانس کے لئے۔ ایک توڑے سکھانے کے لئے۔ استاد جی اور تھے سراگ راگنیوں کے اور۔ پڑھنا لکھنا اُس کے لئے بہت ضروری نہیں تھا۔ بس وہ تو کافی فکری رہتی تھی۔ چال میں اٹکھیلیاں خود بخود اُگتی تھیں۔ جی بھر کر غلیں دیکھتی۔ کلاس میں خالی وقت ہوتا تو کمانیاں اُسٹا کر سب کو لپٹا یا کرتی۔ ہر سال یورپ کا چکر لگا کر واپس آتی تو داستانوں سے بھری ہوتی سکول سے واپسی پر جب کبھی وہ مجھے اپنی بڑی سی کار میں چھوڑنے آتی تو میں تمام راستے احساس کمتری کے مارے مرنے لاتی۔

دفعہ سے بیاہ کر کے میں اور بھی گھر سے غار میں جاگری۔ گھر کے کاموں کی ایک طویل فہرست اُلجھے دھاگوں کی طرح میرے سامنے رکھی رہتی۔ بار بار میرے دل میں یہ خواہش ابھرتی کہ کاش! دفعہ بھی نینا کے بسا کی طرح کاروباری سیٹھ ہوتے۔ بنگلوں اور کاروں کے مالک تو خیر ہوتے ہی۔ مگر اُن کی طرح آدمی وہ جن کو کل کے ممبر ضرور ہوتے۔ میری مٹی کے لئے پڑھی لکھی آیا ہوتی۔ میرے پاس وقت بے وقت کہیں آنے جانے کے لئے ایک بڑی سی کار ہوتی جسے میں خود ڈرائیو

کرتی۔ باورچی خانے میں دہسی انگریزی کھانا پکانے کے لئے خانہ ماں موجود رہتا۔ اردلی ہوتا بھرا ہوتا۔

لیکن۔۔۔ مجھے تو بیک وقت خانہ ماں بھی بننا پڑتا اور آیا بھی۔ اردلی بن کر رفت کے کپڑوں پر برش کرنا بھی میرے ذمے، ادا ستری کرتی، جوتے پالش کر کے ایک قطار میں رکھنے، بستر بچانے اور راتوں کو منی کے ساتھ جاگ کر بیٹھنا، کہیں آنے جانے کے لئے ٹیکسی یا رکشا کا کرایہ یا کرایہ کے لئے گھنٹوں سڑک پر کھڑے ہو کر انتظار کرنا اور جب بس نہ ملتی تو مایوس ہو کر ڈبڈبائی نظروں سے سر جھکانے میلوں پیدل بھی چلنا۔

کاش میں دنیا ہوتی تو اپنے پیارے کے ساتھ مزے سے کبھی امریکہ جاتی، کبھی یورپ گھومنی، کبھی سویٹزرلینڈ کی حسین وادیوں میں سنہرے خواب دیکھتی۔

رفت نے بڑی فراخ دلی سچے پاس روپے خرچ کر ڈالے تھے۔ بار بار میرے دل میں اُبال اٹھتا کہ جین جیج کرا سمان مسٹر اٹھالوں۔ ابھی جینے بھر کے ڈھیروں اخراجات کا پہاڑ میرے سامنے کھڑا تھا۔ منی کے لئے دودھ کے ڈبے منگوانے تھے، بجلی کا بل ادا کرنا تھا، خود رفت کے کپڑوں کی سلائی کا بل چکانا تھا۔ جتنی تیزی سے منگائی بڑھ رہی ہے اس سے دگنی رفتار سے دزدی کی سلائی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ رفت کے کبھی پرانے سوٹ پھلتی ہو چکے تھے اس لئے جموری میں نئے سوٹ سلوانے ضروری تھے۔ آخر اپنا بھرم بھی تو رکھنا ہوتا ہے۔

البتہ میرے جینز کی لائی جوتی سبھی ساڑھیاں ایک ایک کر کے میرے

ساتھ ہی بد رنگ ہو چکی تھیں۔ شاذیہ، رفعت کی آواز سنائی دی: ”بھئی تیار ہو جاؤ
مادر ہی ہوں، رفعت،“ میں نے مردہ آواز میں کہا اور ایک ایک کر کے کبھی
پرائی ساڑھیاں الماری میں سے کھینچ کر ٹنگ پر ڈھیر کر دیں۔ سب کی سب بچا
لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔

میں نے جلدی جلدی منہ دھو کر ایک آسمانی ساڑھی لپیٹ لی جس کا پینڈ
چٹنوں میں چھپا لیا۔ پھر آئینے میں جھک کر خود کو ڈھونڈا تو دھک سی رہ گئی۔ میں
کہاں کھو گئی تھی؟

میرے چہرے پر بن بلا سے دھانوں جیسا ہلکی لکیوں کا ناگوار جال بھیل رہا
تھوڑے رنگ پرانے فرنیچر کی طرح سر دی گرمی کی زیادتیاں سدھ کر اڑ چکی تھیں۔ بالوں
کی سبھاہی پردھوئیں کا غبار اچھلا تھا۔ چہرے کے تنکے نقوش پھسکے پڑ چکے تھے۔
”میں نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی۔ مجھے وہاں نہیں جانا چاہئے۔“ میرے
اندر سے پکارا اٹھنے لگی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر چلانا چاہا
تو رفعت نے بے اختیار گھسیٹ لیا: ”جلو“

”نیں کیسی لگ رہی ہوں، رفعت؟“

”بس ٹھیک ہے۔“

ان کے لہجے میں ایسی جھلک تھی جیسے کہہ رہے ہوں کہ اب تمہارے اچھے
لگنے کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے؟

ہم دونوں گھر سے باہر نکلے تو رفعت نے پڑوس میں جا کر گھر کی کنجیاں خالی
کے حوالے کرتے ہوئے منی کو ایک ہڈل کی صورت لپیٹ کر ان کے سپرد کر دیا۔

دلوں میں چور لے ہم چپ چاپ پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ ٹکٹوں پر پہلے ہی بہت روپے ضائع ہو چکے تھے اور شو شروع ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔

راستہ طے کر کے جب ہم ایوڈو گرین کلب کے ہرے بھرے لان میں پہنچے تو سادے شہر کی رونق وہاں سمٹ آئی تھی۔ ہر طرف ہنستے مسکراتے چہرے تھے کوئی عینکیں نہ تھا۔ میری طرح کسی کی پیشانی پر کم مائیگی کے احساس کی شیں نہ تھیں بل کھاتی لڑکیاں تھیں، لمبے بالوں والے بے فکر جوان تھے، لپٹی ہوئی ادا جیٹر عسکر عورتیں تھیں، اور بے جنگم، بے ٹول زندہ دل مرد، احساس کستری کا ایک جانا پہنچا ناخول میرے گرد ادبچا اٹھتا گیا، جیسی تو میں نے اُس نرم گرم ماحول کے ایک کونے میں چھپ کر چپ چاپ ساری شام گزار دی۔

پہلے چائے ہوئی۔ پھر جب ذرا جھٹ پٹا ہوا اور شام گہری ہو چلی تو دل بہلانے والے بڑے فخر سے اپنے ہاتھوں میں بیگ سنبھالے نظر آنے لگے۔ نینا کی ممی بالکل نینا لگ رہی تھیں بلکہ اُس سے بھی دس برس چھوٹی اور بچا سایہ سائل بنا رہے، باریک سرسراتی ساڑھی میں تنہا ہوا شاداب جسم ہلکی کرا کھلے گلاب جیسی دھلی دھلی رنگت لگے میں ڈائمنڈ کٹ ٹیکس، کبھی ایک میز پر کبھی دو سرور، کبھی تیسری پر کسی نئی کی طرح چکیوں میں ساڑھی منجھان رہی سے ادھر منڈلا رہی تھیں۔

نینا کے پیاسدا کے بل ڈاگ تھے۔ یورپ اور امریکہ کی مسلسل سیاحتوں نے تو انہیں اور بھی باہر والا بنا دیا تھا۔ ڈھیلے پائنتوں کی پتلی، اسوٹ کا کوٹ آٹارے قیص پر صرن واسکٹ پہنے، آستینیں ذرا اسی ادھر کو چڑھاتے بے حد

قینتی مائی اور مائی بہن لگائے پھیلے ہونٹوں میں پائپ دبا سے، اور جسنی سیٹج کے گرد خراتے پھر رہے تھے۔ کام کرنے والے اُن کے بھاری بوٹوں کے دھماکوں سے چونک کر جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگتے۔ بڑا رعب تھا اُن کا۔

میں اپنی کرسی پر بیٹھی ٹھنکی باندھے نینا کی ٹہنی اور پاؤں کو بڑے رشک سے دیکھتی رہی۔ درختوں کے جھنڈ میں دیکھتے ہی دیکھتے لکڑی کی سیٹج تیار ہو چکی تھی سیٹج کے راس میں ذرا گہری خندق کھود کر پام کے پودوں کی صورت سلسلہ دار بجلی کے جھنڈے لگائے گئے تھے بجلی سیاہ پُردے گرے تھے۔ ذرا ہل جاتے تو پھر تری میں سے فرش پر پھپھے ہوئے نرم روئیں دار نالین کے گمرو نینا کے ڈرائیگم کی آرائش کا سارا سامان نظر آنے لگتا۔ بڑے بڑے سنگ تراشی کے مجسمے چمکتے ہوئے گھڑان، رنگین قطاروں کی تصویریں، پس منظر کے لیے حسیں وادوں کے کھینچے ہوئے پُردے، فیر ملکی گڑیاں

تقریباً سبھی سامان نینا کی مہی باہر کے حکوں سے لائی تھیں۔

جب پردہ ذرا زیادہ سرک جاتا تو اند کی طرف سے دونا معلوم ہاتھ اُس کی دہلی کھینچ کر دُور دست کر دیتے۔ پھر سیاہ پردہ ایک حبیب سی سیاہ اہنی دیوار بن جاتی۔ جس پر وائیں بائیں دونا بھی رنگ کے پھنکارتے ہوئے اردہوں کی تصویر بنی تھی جو ایک معصوم سی بھولی بھالی ناچنے والی کو گھیرے میں لے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

اس تصویر پر نظر پڑتی تو سارے بدن میں کیکی سی دُور نے لگتی۔ معلوم نہیں میرے روئیں روئیں میں ایک آن جانا خوف کیوں بس گیا تھا؟

پھر اچانک ہلکا ہلکا سا سا دھجنا شروع ہو گیا۔ تمام تیاں ایک ایک کر کے جل

اٹھیں۔۔۔ لوگ اپنی اپنی جگہ بے تابی سے پردہ اٹھنے کے منتظر ہو کر بیٹھ گئے۔
 پل بھر میں نینا جھم جھم کرتی، جادو جگاتی۔ سنبھ پڑا گئی۔

وہ چمکتی آنکھوں اور دکتے کالوں والی دس برس پہلے کی نینا تھی۔ مانتھے پر
 کم کم لگاتے گورے تلوؤں میں گلال اور ہتھیلیوں کی پشت پر خنائی جال سجائے۔
 پیروں میں گھونگرنڈن کی چوڑی پٹی باندھے! وہ ایک دلربا انداز میں مسکراتی جھک کر
 سلام کیا۔ پھر اس نے بل کھا کر فرش پر ایک پاؤں مارا، طبلے پہ تھاپ پڑی اور
 اُس نے بارہاں پھیلا لیں۔

چمکے گرنے کی بس ایک پھلی سی تھی جو رہ کر کوند نے لگی۔ وہ اپنی باہوں میں
 سب کچھ سمیٹتی چلی گئی۔

تھا تھنی تھک تھک... ہاتھوں کے کنول بن رہے تھے، ہونٹوں کی کلیاں
 چنگ رہی تھیں، پلکوں کے اُدھے تیردس رہے تھے، کلامیوں کے گہرے دھک رہے
 تھے اور کولہوں پر سے ڈھلک کر پھسلتی ہوئی گئے بارہوں میں گوندھی چوٹی کی ناگس
 لہرا رہی تھی۔

نرت تھا، مال تھا، مال کے بھنور تھے، اُدھی خچی گرت کے ہلکورے تھے، ایک
 جادو سا جاگ اُٹھا تھا۔

ایک نہیں دو تین تھیں جوئے۔ نینا سارے شہر کو لوٹ کر لے گئی
 پھر جب خوشتم ہوا تو وہ اچانک میرے پیچھے سے آکر میرے گلے میں محسوس ہوئی:
 ”شادی!“ اُس نے مجھے کھینچ کر کہا۔ ”تم تو چھپائی بھی نہیں جانتیں۔“ اُس نے میرے
 کھردرے ہاتھ بے اختیار اپنے نرم نرم ہاتھوں میں دبائے۔

میں نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کیپٹ لئے۔

اُس نے میرے ساڑے اڑے بال کینٹوں کے پیچھے سنوار کر کہا: ”کتنی بدل گئی ہو۔“

”ہاں، ہینا۔“ میں نے بے دل سے کہا: ”وہی کچھ ایسے آگئے ہیں۔“
”بیمار ہو کیا؟“

”نہیں نہیں،“ میں نے جھٹ بات بدلنے کو کہا: ”تم سناؤ، کیا ہوتا ہے؟“
”ہونا کیا ہے؟“ وہ ایک اداسے منہ پھیلا کر بولی: ”بس، بور ہوئی ہوں سارا دن۔“
”کہیں باہر جانے کا پروگرام نہیں ہے کیا؟“

”ہے تو سہی؟“

”کب تک؟“

”شادی کے بعد“ وہ اترا کر شرمائی۔

”آہا“ میں نے ہنس کر کہا، ”کون ہے وہ خوش قسمت؟“

”دکھاؤں؟“

”ہاں — ہاں۔“

اُس نے چٹک کر سٹیج پر گھڑے ہوئے سازندوں اور چلیچلیوں کو ہدایات دیتے ہوئے ایوڈ گرین کلب کے گھونگر یا لے بالوں والے میجر کی طرف اشارہ کیا: ”وہ۔“
احمد ہیں۔“

”گراہینا“ میں نے تعجب سے کہا: ”تم ساری مشقی تو پہلے...“

”ارے چھوڑو، شادی“ اُس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا: ”وہ بھی کوئی“

اور میرے اشک کا جام لبریز ہوتا چلا جا رہا تھا۔

کاش اگر میں نینا نہ ہوتی تو اُس کی بہن ہی ہوتی۔ یہ تسلی جیسی مٹی میری بھی ماں ہوتیں اور یہ بگل ڈاگ جیسے غرائے ہوئے چوڑے کتے کے پامیرے بھی پیا ہوتے۔

پھر۔۔۔ میں بھی ایک سچے سچا تے بنگلے میں رہتی۔ میرے ارد گرد نوکروں اور ولیوں کا جھوم ہوتا۔ مجھے ہل کر کوئی کام نہ کرنا پڑتا۔ بس نرم نرم صوفیوں میں جھنس کر خواب دیکھا کرتی؛ اور پھر جب میں جاگتی تو میرا ایک قدم ایک کار میں ہوتا، اور دوسرا قدم۔۔۔ دوسری کار میں۔ میں بھی سال میں دو مرتبہ دنیا کے گرد چکر لگا کر آتی۔

مجھے اپنی کھردری ہتھیلیوں، اپنی سیلی گلی سارٹھی، اپنے گھسے ہوئے سینڈلوں، خود اپنے آپ پر ترس آنے لگا۔

پھر نینا کی شادی بڑی دھوم سے ہو گئی۔ اُس نے مجھے بھی بڑے اسرار سے بلایا مگر میں نہیں گئی۔ کس صورت سے جاتی؟

حینوں اُس کی شادی کے چرچے ہوتے رہے، مدتوں اُس کی خوبصورت تصویریں اخباروں کی زینت بنی رہیں۔ ایک رنگین مودی بھی تیار کی گئی تھی۔ ہزاروں ہی شاٹ لئے گئے تھے۔ ہر روز میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی شاکی کے بعد وہ سنی مومن مٹانے کے لئے بانگ کا بنگ چلی گئی۔

اُس کا قصور میرے ذہن میں خوشبو کی طرح بستا تھا، دن بھر کے کام کاج کے بعد جب میں تھک کر سونے کے لئے لیٹی تو نینا ایک پھول کی طرح مجھ پر

آن گرتی۔ میں بار بار سوچتی کہ شادی ہر زندگی کا ایک نازک موڑ ہوتا ہے مگر دنیا کے لئے یہ موڑ تو لاکھوں خوشیوں کا پیغام لے کر آیا ہے۔ یقیناً ہانگ لیک سے آگے یہ جاپان چلی گئی ہوگی۔ آڑو اور خبابیوں کے شگرفوں سے گھرا ہوا اُس کا لکڑی کا خوبصورت بنگلہ ہوگا۔ اُس کی صبح حسین ہوگی، دوپہر اُس سے بڑھ کر شگفتہ ہوگی اور شام رنگین....

وہاں روشنی ہوگی، خوشیاں ہوں گی اور ہنسنے....

میں انہی خیالوں میں ڈوب کر سو جاتی اور صبح کو جب سو کر اٹھتی تو میرا نگہ بھیگا ہوتا اور انداز لگھیں بوجھل ہمت نئے کاموں اور اخراجات کی طویل فہرست میرا انتظار کر رہی ہوتی: دودھ کابل، اخبار کابل، بجلی کابل، دھوئی کی دھلائی، نئے کی دواؤں کابل، منی کے نئے بوتلوں کی فکر، بارہ چرخانے کا کام، گھر کی صفائی، کپڑے دھونا، امر مت کرنا، راضی لانا....

میں عہد کر لیتی کہ اپنی منی کا بیاہ سوچ سمجھ کر کسی اونچے سے گھر میں کر دوں گی جہاں روپے کی ریل پل میں یہ سب اخراجات بڑے معمولی نظر آئیں۔ دولت کی گرمی سے تو ہزاروں جھیلے موسم کی طرح گچھلائے جاسکتے ہیں۔

بیمیں چار برس اس کشمکش میں گزر گئے۔

اب تو تنہا بھی ہوشیار ہو چلا تھا۔ میں نے سوچا بیک وقت دو بچوں کو سنبھالنا ناممکن ہے۔ اب منی کو اسکول میں داخل کر دیا ہی دینا چاہئے۔ کوئی کمان تک مڑنا بھرتا رہے۔ رخصت سے بات کی تو وہ یوں گھبرا گئے جیسے میں نے منی کے بیاہ کی بات چھیڑ دی۔ اُن کے ماتھے پر پھر مٹتے ہوئے پسینے کے قطرے صاف

کہہ رہے تھے کہ اتنی تھوڑی تنخواہ میں منی کی فیس کیسے نکل سکے گی؟
”مگر تعلیم تو بہت ضروری ہے، رخصت!“

ہم دونوں نے بڑی بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر وہ ایک لمبا سانس کھینچ کر کہنے لگے ”بہت ضروری ہے۔ واقعی بہت ضروری ہے۔ آج کل کے زمانے میں تو جب تک لڑکیاں لڑکوں کی طرح پڑھ لکھ کر روزی کمانے کے قابل نہ ہو جائیں حالات سے نپٹنا ناممکن ہے۔“
بات ادھوری چھوڑ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ منی کو کسی بڑے سے سکول میں نہ بھی کسی سٹے سے پرائیویٹ سکول میں ہی لے جاؤں گی۔ آج کل قدم قدم پر تو سکول کھلے ہیں۔

منی سکول کا نام سن کر خوشی سے تالیاں بجانے لگی۔ میں نے دوسرے دن صبح ہی اچھٹ کر اُس کا منہ دھلایا۔ نیا فراگ پہنا یا اور بالوں میں سُرخ رہبانہ دیا۔ وہ بار بار میرا منہ چومتی تھی، پیاری پیاری باتیں کرتی تھی، جھجک جھجک کر میری طرف دلا رہے دیکھتی تھی۔

اپنے گھر کی بڑی رنک پارکر کے جب میں اُسے ایک چھوٹی سی کوٹھی میں کھلے ہوئے پرائیویٹ کنڈرگارٹن سکول میں پہنچی تو لان میں پی۔ ٹی جرد ہی تھی۔ بار بار سیٹی بجتی تھی، ٹمٹی ٹمٹی بچیوں کے پرے سفید یونیفارم پہنے ایک دائرے میں جمع تھے۔ کبھی ہاتھ پکڑ پکڑ کر گھومتے تھے، کبھی میچتے تھے، تھکتے تھے اور اُٹھتے تھے۔ بس زینا گروئنڈ میں کلیں بھر رہی تھی۔ وہی چہرہ پر بدن نرت کا سا انداز، بڑی بڑی آنکھوں میں اتنی چمک اتنی دیمک جیسے کسی کا شدید انتظار ہو۔

مجھے دیکھ کر وہ دُور ہی سے بھاگی آئی، "شا— ذی! اس نے مجھے پتلا
 پاؤں پھیلائیں؟" ادھر، "نہیں، اتم؟" میں اُس سے پٹ گئی، "یہاں کیسے؟"
 "دیکھ لو۔"

"شاوی کے بعد بدلی نہیں ذرا بھی۔ کہاں ہوتی ہو؟"
 "تمہی کے پاس؟"

"اور— احمد؟"

"چھوڑ دیا؟"

"چھوڑ دیا؟"

"ہاں اور کیا۔" وہ اس طرح بولی جیسے بڑی معمولی سی بات ہو۔
 "کیوں؟"

"بڑائی ہو ہو گئی۔"

"تو صلح کر لی ہوتی؟"

"تو بہ! اُس نے جھک کر سنی کو پار کیا پھر بولی، "میرا بھی ایک بیٹا
 ہے۔ جیلو! یہیں کہیں ہو گا۔" اُس نے تلاش میں چاروں طرف نظریں
 دوڑائیں، "پتا کیسے ہیں؟" میں ابھی تک اُدھیر بن میں لگی تھی۔ کسی طرح تسلی
 نہ ہو رہی تھی۔ "وہ تو مر بھی گئے؟" نینا کو بھر کے لئے افسردہ سی ہو گئی، میں نے
 طلاق لی تو اُن کا ہارٹ فیل ہو گیا۔"

"مگر۔" میں ابھی شکایت کے لئے الفاظ ہی تول رہی تھی کہ وہ جھٹ
 میرے لیے کو پہچان کر بولی، "ہاں، شاوی، ہم نے بڑی خاموشی سے اُن کا

کفن دفن کر دیا۔ اب کہاں سارے شہر کو اکٹھا کرتے۔

”مگر، نیتا، احمد تو...“

”فراڈ تھا وہ تو، پکا فراڈ!“

”فراڈ؟“

”ہاں، اور کیا۔ نہ بچکے، نہ کاویں، نہ کامو بار، نہ بینک بلینس۔ شادی کے

بعد سیدھا گاؤں لے گیا مجھے۔ وہاں اُس کی بوڑھی بیارماں منھی اور گنولہ گنولہ سی

بہنیں۔ تو بہ!“

میرے ذہن میں قشماقی ہوئی تمام روشنیاں ایک ایک کر کے گل جرنے لگیں۔

”ہانگ کانگ جانے کا تو محض پراپگینڈا تھا۔ وہاں کوئی سٹینڈرڈ بھی ہوتا

گاؤں میں؟ دفعہ کر دیم کس بات کا ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی: ”اب تو

شادی بھی جو رہی ہے۔“

”کس کی؟“ میں چونک کر بولی۔ ”تمہاری یا احمد؟“

”چہ۔ احمد کی تو وہ بھی چکی۔ اپنے ہی جیسی لے بھی آیا۔“

”تو تمہاری جو رہی ہے؟“

”ہاں، شادی، اور کس کی؟“

میں دھک سی رہ گئی۔

”جواہرات کا بیوپار ہے؟“ وہ مجھے یقین دلانے کو آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

”یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ کیا لندن، کیا امریکہ، کیا سب پان“

”کیا افریقہ...“

”میرے پاس کوئی ٹریڈنگ نہیں ہے اس لئے میں کچھ نہ کر سکی۔ یہ نوکری تو میں نے وقت گزارنے کے لئے کر لی ہے۔ شادی ہوتے ہی ہم افریقہ چلے جائیں گے۔ وہاں بہت بڑا بزنس ہے۔ مہی بھی یہی کتنی تھیں کہ گھر پر بیکارہ ٹرنے سے اچھا تو یہی ہے کہ میں یہاں بچوں کو پانی کی کردار دیا کروں۔“

”بہت اچھا کیا، نینا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔“

”شادی؟ وہ مجھ پر چھک آئی۔“ ابھی راحیل مجھے لینے آئے گا۔ مرنے پر خدا کی قسم۔ جان دیتا ہے۔ اُسے آرٹ سے بے حد لگاؤ ہے۔ میرے فن کی کچھ قدر کرتا ہے۔ جب تک ہم افریقہ نہیں جائیں گے میں ایک ڈانسنگ سکول کھول لوں گی۔“

پھر وہ ہنس کر بولی: ”منی کو میرے پاس بھیج دینا۔“

مجھے سکتے سا ہو گیا۔ نہ معلوم کیوں میری چھترائی آنکھوں کے سامنے ایور گرین کلب کی سیٹی پڑنے ہوئے بھاری سیاہ پردوں پر چھٹکارے ہوئے نازک اثر دہوں میں گھری ہوئی ناچنے والی کی تصویر ٹھہر گئی تھی۔

”نہیں نہیں“ میں نے گہرا کر سوچا۔ یہ کبھی نہ ہو گا۔“

پھر میں منی کو اُس کی کلاس میں جٹھا کر واپس چلی آئی۔

میں نے اپنے تصورات کے سبھی دریچے ایک ایک کر کے بند کر دیے۔ اب میں اپنے ذہن پر چھپائے اندھیرے میں سکون کی روشنی تلاش کرنے کے لئے بھٹکنے لگی۔ اب میں اپنے خالی وقت میں ننھے کو تھپک تھپک کر لمبیاں سُتا تو اندھا کپڑا چھینا کرتی۔ میں اُسے صبح کے وقت سکول پہنچانے جاتی، دوپہر کو لینے جاتی۔ کسی کسی

دن اُس کی فیس جمع کروانے جاتی۔ میری مصروفیات میں احاذہ ہو چکا تھا مگر میں بہت مطمئن تھی۔

نیت شادی کے بعد بھی کافی عرصے کام کرتی رہی پھر اچانک وہ چھٹی لے کر کہیں چلی گئی۔ غالباً افریقہ کا پروگرام پورا ہو گیا تھا۔

ایک شام منی میرے گھٹنے سے لگی بیٹھی کا عدہ پڑھ رہی تھی اچانک پوچھنے لگی؟ ”ماں‘ طلاق کسے کہتے ہیں؟“

”طلاق؟“ منی کے منہ سے یہ لفظ سن کر میں کانپ گئی۔ میں نے بے تابی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”سب کہتے ہیں اُس نے میرا بھٹا اپنے منہ پر سے ہٹا کر کہا۔“ سب کہتے ہیں پی ٹی کو طلاق ہو گئی۔“

”ایسی باتیں نہیں کہتے، منی؟“ میں بدحواس ہو کر بولی۔
 ”سب لڑکیاں کہتی ہیں‘ ماں‘ وہ اچھا آدمی نہیں تھا۔ پی ٹی کو بہت مارا تھا۔ زخم ڈال دیتا تھا۔“

میں نے باتوں میں بہلا کر منی کو ٹال دیا مگر مجھے تمام رات نیند نہ آئی۔ کوئیں بولتے ہوئے صبح ہو گئی۔ دوسرے دن میں نینات ملنے سکول پہنچی مگر وہ نوکری چھوڑ کر کہیں جا چکی تھی۔

سال پہ سال گزرتے گئے۔ نینا بہت لڑکائے سکول جانے لگا۔ رفعت کی ترقی جو گئی تو ہم نے اپنا مکان بھی مہاروڑا لیا۔ رفعت اب بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔ ذمہ داریاں بڑھ رہی تھیں۔ خود میرا کمر بھی جکی جکی رہنے لگی۔ منی

اب بڑی ہو گئی تھی۔ اب وہ میرے بہت سے کام بھاگ بھاگ کر کر دیا کرتی تھی۔ اپنے باپ کے رومال دھو دیتی، کپڑوں پر، ستری کر دیتی، چھوٹی موٹی صفائی کرتی جاتے بنالیتی، ہنڈیا بھرنی دیتی۔ مجھے اب جیسے قرار آ چلا تھا۔ ذہن میں جو خراشیں تھیں وہ مٹ چلی تھیں جو پچاسیر جمع ہی تھیں ایک ایک کر کے نکل چکی تھیں۔ سوچنے سمجھنے کے انداز بدل رہے تھے۔ پڑوس بہت بدل چکا تھا کئی پرانے مکان ڈھائے جا چکے تھے۔ اُن کی جگہ نئے مکان بن گئے تھے۔ کئے اور ہوا دار مکان جدید طرز کے خوش نما بنگے، دو منزلہ عمارتیں، سینٹ کی بالیوں سے سجے پھول دار بیلوں سے ڈھکے اونچے اونچے گھر۔۔۔

سامنے ہی ایک جوڑا ہوا کرتا تھا جس کے کنارے پڑی ہوئی تھیں بھری غلاحت میں مرغیاں دان چنگتی پھرتی تھیں۔ دونوں کے محنت سے یہاں ایک دو منزلہ کوٹھی نما مکان بن گیا۔ کوئی ٹھیکیدار صاحب تھے جو بھری اور چوڑے کی سپلائی کا کام کرتے تھے۔ اپنے نئے گھر میں اُسے تو چاروں طرف پہلے شیرینی بانٹی اور پھر میلاؤ شریف کے رتھے بھیجے۔ پڑھنے والی کا خاص اہتمام تھا۔ سنا تھا کہ آواز میں بلکا کا سوز ہے۔ فطرت کیا چڑھتی ہے دل نکل لیتی ہے۔

مجھے میلاؤ شریف کی محفل سے زیادہ پڑھنے والی کا اشتیاق نصیب کر لے گیا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ چمکی چمکی سی نفاحتی ٹھیکیداروں کے گھوڑکی اینٹوں کے صحن میں دیگیں چڑھتی تھیں۔ برآمدے پر نیلے استر کی عیاری چھیں گری تھیں۔ ہال کمرے میں چاندنیوں کا زرشن تھا۔ کالرس کے پاس ہی منہ سجی تھی جس پر بچھندنے دار گاؤں گئے رکھے تھے۔ قریب ہی ایک تیرپائی پر سیپاڑے جمع تھے۔

مٹے کی بیدیاں ایک ایک کر کے اُنہیں اسپارہ اُٹھا کر بڑی عقیدت سے
چوم کر آنکھوں سے لگتیں اور چاندنی پر بیٹھ کر تلاوت میں مصروف ہو جاتیں تاکہ
جتنے میں مغلا نی بی کی آمد ہو ایک کلام پاک ہی ختم ہو جائے۔

کمرے میں بتیاں جلی تھیں۔ روشنی کی جگر ٹگر ہو رہی تھی۔ دروازے پر
مچھول دار پر صے گرے تھے۔ باہر بہت سے بچے کھیل رہے تھے ٹھیکیدار کی بہو
بار بار انھیں دودھ پکاتی۔ پھر کوٹے کناری کا آنچل سنبھال اسپارہ اُٹھا لیتی۔
”اُگئیں، اُگئیں! مغلا نی بی اُگئیں۔“ بچوں نے شور مچایا۔

عمر میں اسپارہ سے پھوڑ بھاگی گئیں۔ دودھ گلاب موتے کے ہار مئے آگے
بڑھیں۔ ایک نے لپک کر پرتہ اُٹھا یا دوسری نے انھیں مسند پر بٹھایا مٹے میں
مار ڈالے، کلاتیوں میں گجرے باندھے۔ الہی مصری کی تھالی آگے بڑھائی۔ مغلا
نی نے دودھ دانے منہ میں ڈالے ٹھیکیدار کی بہو نے اُٹھ کر اگر تیاں سلگائیں۔ گلاب
پاشن ہلا کر ساری محفل کو مسطر کر دیا۔

مغلا نی بی کا رنگ زرد تھا، کچھڑی بال تھے۔ بیمار نظر آ رہی تھیں بلبل کے
کرتے پہیل بنی تھی۔ گردن میں تعویذ کا کالا ڈورا بھانگ رہا تھا۔ سسپورٹھ کا ہوا
بلبل ہی کا مسلا دسلا دوسرا تھا۔ گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالا تھی۔ ہاتھ
میں سبز امام کی قبیح باندھے آنکھوں نے بڑی عقیدت سے میلاد نامہ آنکھوں سے
لگایا۔ پھر حلق کی کھوہ میں سے نازک سی آواز لہر لہاتی:۔

”دردِ دل پر دھو، دردِ دل پر دھو، عاشقِ دردِ دل پر دھو...“

وہ درویش ڈوبی درویش رہ رہی تھیں۔ سب ہی بڑھ رہے تھے مگر مجھے اپنے خیالوں میں خبر ہی نہ ہوئی کہ کب میلاد شروع ہوا، کب ختم ہوا۔ احساس تھا تو بس اتنا کہ سوز میں ڈوبی ہوئی ایک آواز، جھل جھل کرتی، بھائی جبار ہی ہے۔

دعا کا وقت آیا تو ساری محفل نے ہاتھ اٹھائے۔ مغلائی بی کی بچیاں بندھی تھیں۔ سسک سسک کر، رک رک کر، کانپتے ہونٹوں پر فخرے و محل رہے تھے۔ بے روزگاروں کیلئے روزگار کی دعا، ناواروں، بے سہاروں کے سہارے کی دعا، لاوارثوں اور یتیموں کی دستگیری کی دعا، مریضوں کی شفا کے لئے دعا نہ معلوم کتنی دعائیں انھیں اذہر تھیں۔ جب قرض داروں کی نجات کا ذکر آیا تو وہ بے قابو ہو گئیں، بچکیاں و بی و بی بیچوں میں بدل گئیں۔ روتے روتے مغلائی بی نے مذہب الہی ہو گئیں۔ اُنھوں نے دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور وہیں مسند پر بے جہاں سی کر گئیں۔

”نینا! میں نے اُسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے ٹھنڈے پانی کا کٹکٹا اُس کے ہونٹوں سے لگایا۔ شا — ذی!“ اُس نے پڑھ دیا، ہو کر کہا۔ اور ٹپ ٹپ اُس کے آنسو گالوں پر گر گئے۔

”یہ کیا حالت بنائی ہے؟“

”رضائے الہی!“ اُس نے آنسو بہتے ہوئے گریختہ مغلایہوں کے انداز میں کہا۔

”تمہاری تو شادی ہو گئی تھی؟“

اُس نے رحم کی جلتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

”تم تو ڈانسنگ اسکول...؟“

وہ ایک کرب میں تڑپ کر رہ گئی۔ جیسے اس کو تیر سا چھو گیلہ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبایا۔ ”کہاں رہی اتنے دن؟“ ”ہاں، شاہزی“ وہ بڑے دکھ میں بولی۔ ”میری شادی ہو تو گئی تھی، مگر راجیل اچھا آدمی نہیں تھا۔“

”اب کے پھر؟“

”اب کیا کموں۔ وہ خود تو تلاش تھا مگر شادی اُس نے کا دوا کر کے خیال سے کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اُس کے لئے بہیز میں خزانے لے کر آتی۔ میرے ساتھ تو صرف میرا بھلو تھا۔“

”خزانے؟“

”ہاں، شاہزی! اُس کا منصوبہ یہ تھا کہ جب میں ڈھیروں روپیہ لائوں گی تو وہ سیاحت کے لئے باہر جائے گا مگر جب میں خالی ہاتھ وہاں پہنچی تو وہ مجھ پر ظلم کرنے لگا۔ بڑی بے دروی سے مارا کرتا تھا۔ مہار میں نے طلاق لے لی۔“

”فرا سارک کر وہ بولی: ”پاپا مرے تو لاکھوں بلکہ کروڑوں کا قرض چھوڑ گئے بنگلے کی قرض بھی ہو گئی۔ ادائیگی پھر بھی نہ ہو سکی۔“ وہ جیسے سوتے میں بول رہی تھی۔ ”اب تو تمہی بیچارہ کی کوفت ہوئے بھی عرصہ ہو گیا۔“

”اوہ نینا!“

اُس نے اپنے پلو سے آنسو پونچھے، صلیق کھنکار کر صاف کیا، ہونٹ کٹ کر بڑی حسرت سے بولی: ”بہت خوش نصیب تھے پاپا اور میں۔ اپنی زندگی تو بہت اچھی گزار گئے۔ آرام سے مر بھی گئے۔“

وہ بار بار آنسو روک رہی تھی، پھر بھی اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ آواز
خلق میں گھٹ رہی تھی۔

”حوصلہ رکھو، نینا، حوصلہ!“

”میرے پاس حوصلے کے علاوہ اور ہے بھی کیا۔ جی بھی تو میری شادی ہو
رہی ہے۔“

”شادی!“

”ہاں“ اُس نے جبری بے نیازی سے سر ہلایا۔ حاجی رمضان علی نے
مجھے اپنے عزیزوں سے بڑھ کر پناہ دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بے سہارا دولت کا
اس دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے، اور یہ ہے بھی ٹھیک۔ میرے پاس تو سر
چھپانے کی جگہ بھی نہ تھی۔ کسی نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ کہاں ہو؟“

منی جوان ہو گئی ہے۔ اُس کے بہت سے پیام آ رہے ہیں۔ دفعہ روزانہ
بحث کرتے ہیں کہ منی کا بیاد بہت اُونچے گھر میں کریں گے جہاں دولت کی
ریل پیل ہو گی، معیار زندگی بہت بلند ہو گا۔۔۔۔

میں اپنی منی کا بیاد اپنے ہی جیسے گھر میں کروں گی، میں نے وہیں بیٹھے
بیٹھے فیصلہ کر لیا۔

”اُن کی پہلی تین بیویاں ہیں۔“ نینا بڑی راز داری میں مجھ پر جھپک آئی۔ اُس
بارہ بچے بھی ہیں۔ سب بہت خوش ہیں مل جل کر گزارہ کر لیں گے۔ نکاح ہوتے
ہی ہم جگہ کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ خدا بڑا کھد ساز ہے، شادی اُس نے
میرا ہاتھ بڑے پیار سے دبایا۔

رفت سے روزانہ بحث کرنے کے بعد ہم نے منی کی سگنی کر دی۔ آفتاب بالکل رفت کی طرح ایک دفتر میں ملازم ہے چھوٹی سی خواہ ہے اور اخراجات کی ایک طویل فہرست۔ منی دن بھر کام کرے گی۔ پیٹ کاٹ کر اور اپنی معصوم خواہشات کا گلا گھونٹ کر گزارہ کرے گی۔ برتن مانجھ مانجھ کر اُس کی پھیلا کھوری ہو جائیں گی۔ اُس کے چہرے کی رونق چربی و نوں میں ختم ہو جائے گی۔ میری طرح وہ بھی ہنگوں اور کاروں کے خواب دیکھ کر صبح جیا کرے گی اور صبح کو جب اُٹھے گی تو اُس کا تکیہ نیچا بھیگا ہوگا۔ مگر میں خوش ہوں... بہت خوش...

کل میں اُس کے ہیز کے لئے ساڑھیاں خریدنے گئی تھی۔ بازار سے واپس آ رہی تھی تو کالے شاہ کے مزار کے گرد لوگوں کا دس قدمہجوم تھا کہ راستہ چینا و سوار تھا۔ لنگر تقسیم ہو رہا تھا شاید۔ جیسی تو بھک سگوں اور غیروں نے اُدھم مچا رکھا تھا۔

اسی جنگلے میں مجھے عینا نظر آگئی۔ اُس کے ساتھ میلے پرانے کپڑے پہنے تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ جو راہ گیروں کو سلام کرتے، اُن کے پیچھے ہاتھ پھیلا کر بھاگتے، اور پھر ہانپ کر واپس آ جاتے۔ لوگ گزرتے گزرتے کچھ پھینک جاتے تو وہ نوں ہاتھوں سے بڑر کر جبین جھپٹ کرتے، ان کی جھولی میں ڈال دیتے۔

وہ فٹ پاتھ پر بوسیدہ سا برقعہ لپیٹے بیٹھی تھی۔ ایک سوکھا ہوا زرد ہاتھ ماتھے کے انداز میں پھیل ہوا تھا۔

میں نے قریب جا کر آہستہ سے پکارا: "نینا!"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"نینا!" میں نے دوبارہ کہا۔

اُسے کوئی جنبش نہ ہوئی۔

"نینا، نینا" میں نے اُسے گھونچتے ہوئے کہا، اُس کا بخار میں جلتا ہوا ہاتھ اپنی

ہتھیلیوں میں دبایا مگر وہ ساکت بیٹھی رہی جیسے موجود ہی نہ ہو۔

"سویرا، سویرا"

رسل جو

میر شام مال روڈ کے ایک بک اسٹال سے کتابیں خرید کر بیچ رہے ہیں۔
 تو کتابوں کا سات میر کا پیکٹ ایک دم سات من کا ہو گیا۔ اس وقت مال پر کھڑے
 ہوئے خوش پوش لوگوں کے بڑے سونٹوں پر نگاہ ڈال چکی تھی اور مجھے احساس ہوا
 تھا کہ میں خود بھی ایک اوسط درجے کے سونٹ میں ملبوس ہوں اس لئے اپنے
 اور دوسروں کے سونٹوں کی لالچ اسی بات میں تھی کہ پیکٹ کسی مزدور کو تھا دیا
 جاتے۔ اور دگر دنگا، دوڑائی مگر کوئی مزدور نہ تھا شخص نظر نہ آیا۔ آخر خود ہی پیکٹ
 اٹھا کر دائیں بائیں دیکھتا، کسی قدر جھینپتا ہوا چل پڑا چند قدم کے فاصلے پر
 پیچھے سے ایک مسکین سی آواز آئی: ”ہم اٹھالے بولو صاب؟“

میں نے مڑ کر دیکھا: ”بولو صاب“ کہہ کے تنہی نکالنے والا یہ ایک افسانہ
 مزدور تھا جو شاید ابھی ابھی زمین کی تاریک تہوں سے نہیں بھڑک اٹھا۔ کینا
 کے دھول میں اُٹے ہوئے فلاکت زدہ چہرے پر جو نہیں سی مسکراہٹ کھیل رہی

مٹھی، اس میں سادگی اور معصومیت کا ایسا امتزاج تھا جو کسی فرسودہ لوہے کے بشرے پر زندگی کی ہماہمی پہلی بار دیکھنے پر ابھر آتا ہے۔

وہ سامنے شہر جانے والی جو لوہل بس کھڑی ہے نا بس وہاں تک لے جلاؤ دیہ لڑکیوں نے دس پیسے کا ایک سکہ نکال کر اس کی مٹھی میں تمنا دیا۔ مزدور کا پسینہ نکلنے سے پہلے اس کی مزدوری چکا کر میں نے بہ زعم خود مزدور میں خود اعتمادی اور اعتبار کا لازمال جذبہ تخلیق کر دیا تھا۔

اُس کا کیا جبروت تھا جو دھابہ اس نے بوسیدہ واسکٹ کی اندرونی جیب میں دس پیسے رکھتے ہوئے اس معمولی خاصے اور برائے نام بوجھ کا خیال کر کے شاید یہ بات کہی تھی لیکن مجھے اس میں اس کی نجابت اور شرافت کی ملک آئی۔ اس نے مسافروں کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے بس کے اندر جا کر ایک سیٹ پر سیکٹ جما دیا۔ میں اُسی سیٹ پر بڑے اطمینان سے براجمان ہو گیا اور بس ڈولتی ناؤ کی طرح ہچکولے کھاتی شہر کی طرف بڑھنے لگی۔

میں نے دیکھا، بس میں میرے قریب ہی کھڑا، مسکرا رہا تھا، مجھے حیرت تو ہوئی لیکن میں نے اپنے ساتھ والے آدمی کو کسی قدر دھکیل کر اس کے لئے جگہ بنا چاہی، مگر وہ جیسے اطمینان کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔

”تم اُترے نہیں؟“ میں نے اُس کی سادہ مگر پراسرار سی مسکراہٹ کا پس منظر بھانپنے کے لئے اُس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

دھول کی تھوں کے نیچے اُس کے پر مردہ رخساروں کے کھوں میں زندگی جنبش ہوئی اور اس کی شریانوں میں خون کی گردش نے لمحو بھر کے لئے تمام سی

سرخ چمک دوڑا دی "بس جی ہم بھی شہر جاتیں گا۔" اُس نے پھر تیسری نکال دی۔
 "کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے اُس کی فات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔
 "رسل جو" ایک بے مقصد سی احتمائہ منہی کے درمیان اُس نے جواب دیا۔
 بس کنڈیکٹر ایک کونے میں کھڑا ٹکٹ کے لئے ہانک لگا رہا تھا۔ وہ قریب
 سے گزرا تو چپکے سے میں نے شہر کے دو ٹکٹ لے لئے۔ اس خیال سے کہ جب
 رسل جو کو معلوم ہوگا تو وہ حیران ہوگا لیکن وہ حیران نہیں ہوا بلکہ اس انگلش
 پر عجیب ممنونیت اور احسان مندی کے جذبات سے لبریز آنکھوں سے میری
 جانب دیکھنے لگا۔ جیسے میں نے اس کا سات پیسے کا ٹکٹ خرید کر اس پر بہت
 بڑے احسان کا بوجھ لا دیا ہو۔ اس بوجھ سے اس کی کمر تو نہیں مگر اُس کا دل
 کسی قدر ضرور چمک گیا۔

میں راجہ بازار میں بس سے اتر پڑا۔ یہ اس لوکل بس کا آخری اسٹاپ تھا
 میں کتابوں کا بنڈل بغل میں داب کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ چند قدم چلنے کے بعد
 معاً میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ ایک موہوم سے تجسس آئینہ
 خوف نے میرے لاشعور کے پردوں پر سرسرانا شروع کر دیا۔ بس پر چڑھتے اور
 اُترتے وقت جیب کترے جو ہاتھوں کی صفائی دکھاتے ہیں، اُن کے تذکرے
 اُس چمکاتھا۔ پھر چوداچکوں کو مسافروں کی جیبوں کو دُور سے جانچ کر اُن کا
 تعاقب کرنے میں بھی کمال حاصل ہے۔ میں ٹھنکا اور میرا ایک ہاتھ خود بخود
 کوٹ کی اندرونی جیب میں بٹوے کو ٹٹولنے کے لئے سرک گیا۔ پھر اطمینان کی
 ایک ہلکی روشنی لہرنے معاً میرے چہرے کے نقوش کا احاطہ کر لیا۔ اس

اطمینان بخش لہر کے دوران، نہیں سمجھا کرنے والے اس سائے کو دیکھنے کے لئے مڑا ہی تھا کہ وہ اُچک کر اچانک میرے سامنے آگیا اور میلے میلے پیلے دانت نکالتے ہوئے میرے ہاتھ سے کتابوں کا بندل چھیننے لگا۔ مجھے اس کے روئیے پر کسی قدر شک گزرا اور صحنہ جلاہٹ بھی ہوئی۔ چھوڑ دو بھئی۔ کی تم مسافر کا سامان زبردستی اٹھاتے ہو؟

رسل جو میرے سوالوں کا جواب دیتے بغیر کتابوں کا بندل اپنے پوڑے شانوں پر جا چکا تھا۔ تم کس طرح جانتیں گا بو بھاب؟ مجھے اُس کے لہجے میں غمزہ انگسار کی گھلاوٹ محسوس ہوئی۔

”میں تو جامع مسجد کی طرف جاؤں گا۔ لیکن بندۂ خدا تم کس سمت کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”ہم بھی جمہوریت کی طرف جاتی ہو بیٹی“

سوچا عجیب جنگلی اور دیوانے مزدور سے پالا پڑا ہے۔ ایسے دیوانے سے جو اپنے مطلب کے لئے تو ہوشیار ہے۔ اس نے سوچا ہے کہ چلو اپنے گھر کی طرف جاتے جاتے ساتھ شریعے اور اس شخص سے ہتھیانو۔ لیکن مجھے بھی پتی گمرہ کا پکا بنا پڑے گا۔ میں بھی اس زبردستی کے مزدور کو ایک انٹھنی سے نیاؤ ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔

یوں تو یہ پکیٹ شہر کے جامع مسجد میں خود ہی اٹھا کر لے جاسکتا تھا کیونکہ یہاں مال روڈ کی طرح کسی ایسے خوش پوش نوجوان کے ملنے کی توقع نہ تھی جو ایک وقت میرے سامان اور ثانی پر استہزائیہ نگاہیں ڈال سکے

لیکن رسلِ مجوا ایسے لوگوں کی پیٹ کی آگ کے لئے ایندھن دیا کرنا بھی تو ہم ایسے سفید پوش انسانوں کا فرض ہے۔

”پیٹ کی آگ کے لئے دلی بھر کام کر کے کتنا ایندھن اکٹھا کر لیتے ہو؟“ میں نے قدم سے مزاحیہ انداز میں اُس سے پوچھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ میرا مطلب سمجھ جائے گا، مگر اُس نے اپنی مخصوص عاجزانہ مسکراہٹ کے ساتھ میری سمت دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا: ”ہم اُدھر صبح سے شام تک دھیانِ داڑھی پر کوم کرتی ٹھیکیدار اچھٹا آدمی نہیں ہوتی۔ جبینہ میں دو چار دھیانِ ڈی کھا کھنا کاٹ لیتی۔۔۔۔۔“ اس کا جی ٹھیکیدار کو موٹی مٹی گالی دینے کو چاہا اور گالی کا ایک حرف اُس کی زبان پر اُکرا نکلا گیا۔

”کہاں کے رہنے والے ہو؟“ میں اس کی دلچسپ شخصیت کی تمہوں میں اُترنے کی کوشش کرنے لگا۔

”کثیر کا بوہ صاحب؟“ وہ تشکر آمیز نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا: ”سو پور میں ہمارا جدی پشتی مکان ہوتی۔ ہم بال بچہ کے ساتھ اب اُدھر پنجاب میں سر چھپاتی۔ اُدھر کا پھوجی لوکھ لڑائی میں ہمارا کھیت اور گھر بار جلا دی۔ گریب کے لئے بوہوینی اس جبینہ پر کوئی جگہ نہیں ہوتی؟“ اُس کے افلاس زدہ چہرہ پر مسکراہٹ کی جگہ یکایک نفرت ابھر آئی۔ نہ جانے یہ نفرت ظلم کے خلاف تھی یا اُس کی اپنی ذات کے خلاف۔

چلتے چلتے یکایک وہ رُک گیا۔ کچھ سوچتا ہوا سا۔ مجھے اس وقت دو ایک

اچھا خاصا فلسفی لگ رہا تھا جس نے گزشتہ حالات کے تحت یا محض زندگی کے تلخ حقائق اور خیالات کی ریل پیل سے اکتا کر محنت مزدوری میں پناہ لی ہو۔
 ”محنت مزدوری کر کے کتنا کچھ روز کما لیتے ہو ختم؟“ میں نے سہمہ دانہ لیجھ میں اُس سے پوچھا۔

”دو ڈھ دو روپیہ فی“ کبھی کبھی بارش ہوتی یا موسم خراب ہوتی تو مچھری نہیں ملتی۔ اس روز گھر میں چولہا نہیں جلتی۔ بس پرانا دازمہ اور ستون پر گزرتی ہم دیکھتے۔“

مصل جو بڑے خلوص کے ساتھ اپنے گھریلو حالات بتا رہا تھا اُنٹ ٹاکر مہاجر کی حیثیت سے پنجاب میں آئے تھیں۔ اُس کی داستان اُس نے چند ہی جملوں میں مجھے سُنا ڈالی۔ میرے دل پر اس کی سادہ اور معصوم باتوں کا اتنا اثر ہوا کہ میں دُور تک انہی تصورات و احساسات میں غلٹاں چلتا رہا۔

جامع مسجد کے قریب باہی راجہ بازار کے بڑے چوک میں مجھے ایک پرانا شاعر دوست مل گیا۔ جس نے اپنی نئی غزل سُنانے کے لئے مجھے زبردستی روک لیا۔ غزل اُس کے قول کے مطابق نئی تھی مگر اس میں وہی عشق و محبت اور وصل و فراق کی گھسی پٹی داستانیں و مہرائی گئی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی گھوٹا صی کے لئے اس کی دوسری نئی غزلیں سننے کے لئے طوقاؤ کر با دوسرے دن کا وعدہ کر لیا۔ ذرا آگے بڑھ کر اچانک مجھے رسل جو کا خیال آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دوست تو مجھے نظر آ رہا تھا لیکن مزدور غائب تھا۔

اس احساس کے ساتھ ہی کہ اس ہنڈل میں لائبریری کی چھ سات

سورہ کے کتابیں تھیں، میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے بدحواس سا ہو کر پیچھے کی طرف تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ دُور تک راجہ بازار کی پُر رونق شہراہ چھوٹ کر دوبارہ انسانوں اور خریداروں کا ایک سیلابِ عظیم تھا۔ جس میں مجھے کہیں رُسلِ مجوکا کتابوں کے بندل میں چھپا ہوا سرفِظ نہ آیا۔ آخر وہی ہو کر ہا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ شام کا رنگ تھا ہوا سرد اندھیرا ایک دم انا دس کی حبیب رات میں بدل گیا۔ اُس کی برف آلود گھرائیوں میں اپنے آپ کو ڈوبتا ہوا اُردو ہوا محسوس کرنے لگا۔ دل ہی دل میں ہر کس و نا کس پر اعتبار کر لینے کی عادت پر افسوس بھی اُبھرا۔ رُسلِ مجوکا تو غائب ہو چکا تھا لیکن اس کا سادہ بڑیا اور محسوم سا چہرہ ابھی تک میری آنکھوں تلے گھوم رہا تھا۔ سچ ہے لوگوں کے ظاہر اور باطن میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ میں اپنی انسان دوستی کی کرناک شکست کے متعلق سوچتا ہوا، انتہائی گہیدہ خاطری کے عالم میں گھر کی طرف چل دیا۔

میں ان قسمی کتابوں کے زیاں پر دل ہی دل میں بیچ و تاب کھاتا مشغولِ فکروں سے دانتیں باتیں دیکھتا دیوانہ مارا گئے بڑھنے لگا۔ اب اُسے کہاں رُحوں تلوں؟ کہاں جاتوں؟ کیا تھا نے میں دہشت کھو اودوں؟ پھر خیال آیا کہ جہاں اپنے دست سے مصافحہ کر کے چند لمحوں کے لئے کھڑا ہوا تھا اور اس نے ناز و غزل سنا سنا شروع کر دی تھی۔ شاید وہیں کہیں کسی قطرے کی ادب میں وہ چور بجا بیٹھا ہو بھاگا بھاگا اُدھر گیا۔

زندگی اسی طرح رواں دواں تھی۔ کسی کے سورہ زیاں سے بے نیاز ہو کر۔

شام کے گئے اندھیرے میں رہتے ہوئے کاروباری لوگوں کے دھیسے دھیسے شور پر یکھیوں کی جھنجھٹا ہٹ کا گناہان مہم ہوا تھا۔ دکانیں بجلی کے تقنوں سے بوقتہ نور بنی تھیں لیکن میرادل نا امید ہی اور احساسِ زیاں سے گھبراندہ صارفوں میں ڈوب رہا تھا۔ وہ رہ کر رسل جو کا معصوم اور مجبولا سا چہرہ نظروں تلے ہماری بد نظمی کی علامت بن کر گھوم رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ہی تو میرے اعتماد کو کسی کی پراسرار شخصیت سے ٹھیس پہنچی تھی اور میں پہلی بار نظریاتی شکست کی ایسا تلخ کیفیت سے دوچار ہوا تھا جو کسی لحاظ سے بھی زہرِ مہربے جام کی تلخی سے کم نہ تھی۔

رسل جو کہیں نظر نہ آیا تو میں بائیسویں اور انیسویں گھنٹوں کے اندھیوں میں محصور سا ہو کر گھر کے راستے پر چل پڑا۔ پھر گھر کے نزدیک پہنچ گیا۔ سامنے بجلی کی روشنیوں میں جامع مسجد کے سپید عینوی گنبد اللہ منقش وند دیوار نظر آ رہے تھے۔ مسجد کا بلند وشن مینار وحدت الوجود کا اظہار کر رہا تھا اور مؤذن اللہ کی بڑائی کا اعلان کر رہا تھا۔

”اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔“

لیکن — میں نے سوچا۔ انسان بہت چھوٹا ہے۔ انسان بہت نیچ ہے۔ وہ اپنے گھر میں آسودگی کا چھاغ روشن کرنے کے لئے دوسروں کے دینے بکھا دیتا ہے۔ وہ تو اللہ ہی کا نائب اور اس کا وجود معنوی ہے۔ پھر اس نے اپنی بڑائی اللہ عظمت کو کیوں دنیا کے ہزاروں میں نیلام پر اٹھا دیا ہے؟ میں چند لمحوں کے لئے پلٹ کر کھڑا ہو گیا اور بازار کی طرف باوجود ہر دھمکنے لگا

معا جیسے محسوس ہوا جیسے بازار کے اس شور و ہنگامے میں کوئی جیسے پکارتا ہے۔
 آواز مانوس سی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو فریڈا مسرت سے میری باجیس کھینٹیں۔
 ”بوہو بی! اتن عجیب آدمی ہوتی۔ ہم ادھر سارا شرک پر تم کو دیکھتی پر تم نظر آتی
 ۔۔۔ تمہارا ٹھکانہ معلوم ہوتی بوہو بی تو سامان ہم گھر پہنچا دیتی“

میں چند لمحوں تک حیران کھڑا اسے سر سے پاؤں تک دیکھتا ہوا پھر میری
 اُسل جو کو خوشی سے سینے کے ساتھ چمٹالیے کو چاہا۔ میں نے اس سے بو نہی
 تجسس کی خاطر بو چھپا ”تم یہاں مسجد میں کیا کر رہے تھے۔ کیا منہ اڑھنے چلے
 گئے تھے؟“

”ناہیں بوہو صاحب! ہم نماز پڑھنے نہیں جاتی“ اس نے حسبِ عادت
 پھر بیسی نکال دی۔ ہم تو ادھر سے محسوس پر بیٹھا تھا ہارا انتظار کرتی۔ تم نے بولانا
 بوہو کہ تم جمعہ صییت کے پاس رہتی“

میں رسل جو کو ساتھ لے کر مسجد کے سامنے والی گلی میں سر گیا۔ دروازے پر
 دنگ دیتے ہوئے میں نے سوچا کہ کل جب میں اپنے دوست شاعر سے ملوں گا
 تو مریت اور لحاظ کو بلائے طاق رکھ کر اسے کہوں گا کہ وہ زندگی کے بارے میں
 لکھ کرے۔ اس کی لفظ قوتوں، اس کی کثافتوں اور اس کی صداقتوں کے بارے
 میں۔ اپنی بے نیکی شاعری اور بے وقت کی راگنی کو چھوڑ کر اس کو ہستان فی مزدور کے
 متعلق کوئی عہد آفریں نظم لکھے۔ اس کی دیانت، اس کی معصومیت بھانکشی اور
 محنت کی عظمت کے سامنے اپنا سرنگوں کر دے۔ اس لازوال انسانیت کے بارے
 میں کچھ لکھے بلا لکینوں کے سائے میں بھی زندہ و تابندہ رہتی ہے اور ٹٹ لٹا کر

وطن سے دور اگر لوٹ کھسوٹ کے شکار معاشرے میں غربت کے دہ گزرنے پر بھی فنا نہیں ہوتی۔

ماں نے دھاندلہ کھول کر ایک نظر جیتھڑوں میں پٹے انسان پر ڈالی اور اچانک مصلے پر بیٹھ گئی۔ تسبیح کے مانوں کو روکتے ہوئے اس کا سپید بالوں والا سر نامعلوم انداز میں برابر ہٹا رہا۔

میں نے کتابوں کا ہنڈل رسل جو کے ہاتھ سے لے کر تپائی پر رکھ لیا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے گم سپاٹ چہرے پر بڑی معنی خیز قسم کی ایک مقدس سی چمک مسکراہٹ کا ادب دھار کر کچھ گھٹی اور اس نے فحی کے انداز میں گردن ہلا دی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی بالوسی ہوئی اور میں نے پھر آنے اور شامل کر کے رقم اس کی بخشش ہوئی واسکٹ کی اوپری جیب میں ڈال دی۔ وہ یہ رقم اپنی جیب سے نکال کر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا اور میں خفگی میں پیچھے ہٹ گیا۔

”ہم یہ ناچیں میں گا۔“ بارہ منہ نایا۔

”عجیب انسان ہے۔“ میں بڑبڑایا۔ کیا یہ کم ہیں؟ لیکن میں اب ایک میا بھی اور نہیں دوں گا۔ میری متانت بھری آواز کی کڑیاں تھکناہ انداز سے بھاہیں۔ وہ حسبِ عادت مسکرا دیا۔

ماں اس دوران مصلیٰ الپٹ کراٹھ چکی تھی۔ رسل جو نے سواروہ یا کتا بوں کے ہنڈل کے پاس تپائی پر رکھ دیا تو ماں نے جھنجھلا کر کہا: ”نہیں لیتا تو نہ لے تھیں کیا پتا میٹھے ہاں مزدوروں کی تنگیوں میں ہزاروں روپیہ جمع ہوتا ہے۔“ تسبیح کے

وانوں کو جلدی جلدی گھماتے ہوئے ماں نے اکٹھا کیا۔

پھر بھی مجھے ریل جو کی حالت زار پر ترس آ گیا۔ اچھا تو تم ڈیرھ دو پالے بغیر نہیں ملو گے۔ میں بڑی مستعدی کے ساتھ حجب سے چوٹی نکالتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

لیکن وہ اپنی اسی مسکراہٹ کے ساتھ معاکرے سے باہر نکلے ہوئے بلا "ناہیں بوبو بی! یہ بات ناہیں ہوتی۔ جب تم گریب کے ساتھ اتنا صبر بانی سے پیش آتی۔ اتنا اچھا سو لو کہ کرتی۔ تو ہم بھی ایسا ناہیں کریں گا۔ ہم پڑا ہرگز ناہیں لیں گے۔"

میں وہ ڈیرھ دو پالے کراس کے پیچھے تقریباً دوڑ پڑا لیکن وہ بڑی پھوٹی کے ساتھ رات کی سیاہیوں کو اُجھاتا ہوا، لگی کے موڑ پر غائب ہو گیا۔ میرے سر کبھی اُدا نہ ہو سکے والا قرض چھوڑ کر۔

"ننون" لاہور

مس عاصمہ حبیب

جس دن لمبے بالوں والی نامکمل سی عاصمہ حبیب کالج میں داخل ہونے آئی تھی۔ تو ایسے لگا جیسے کالج کے لمبے برآمدوں میں کوئی نسخی سی چڑیا چھدک آئی ہے۔ وہ اتنی چھوٹی اور دبلی تھی کہ اُس کے انسان ہونے پر مشکل یقین آتا تھا۔ پر خبر نہیں کیا بات تھی پہلے دن ہی سارا کالج اس سے مرعوب ہوا جاتا تھا۔ انتہائی خوب صورت ہنس و نقسے والی حقیر حقیر سی عاصمہ حبیب کو دیکھ کر خوشی اور مبہرہی کے جذبات بیک وقت اُبھرے پڑتے تھے۔ لگتا تھا خدا نے اپنا سارا کام بس گروں کے اوپر ہی اوپر کیا ہے۔ اس کا خوبصورت چہرہ اس کے حقیر بدن پر ڈیکوریشن میں لگتا تھا جیسے مٹی کے ٹوٹے چھوٹے گھمان میں تازہ اور خوبصورت پتھروں کا لگہرہ۔ نہ بدن پر کوئی بوٹی نہ کمر میں کوئی ٹھیک انیسوائٹ کے سارے آٹا مٹھے پٹھے اور چھٹے چھٹے۔ پر خبر نہیں کالج بھر کے لوگوں کو اس بے کس سی عاصمہ حبیب میں کیا نظر آتا کہ سارا دن مکھڑوں کی طرح اس پر بھنٹاتے اور بھرتے بھرتے بدنوں والی لڑکیاں یہ سب کچھ لکھتے

اور عورت سے دیکھتیں۔ یہ تو دوسرے تیسرے روز ہی پتا چل گیا کہ یہ نفی سی چڑیا بڑی ذہین ہے۔ ہر بات کا ایسا فر فر جواب کہ پروفیسر نیاں بغلیں جھانکنے لگتیں۔ بعض لڑکیاں تو اسے کوئی ماندائی مخلوق سمجھ کر گھٹنوں یا کتیں۔ لیکن آہستہ آہستہ جب اس کے سارے لپٹن ان کے سامنے آئے تو لڑکیاں اس سے شدید نفرت کرنے لگیں بعض اسے قابلِ رحم سمجھ کر نظر انداز کر دیتیں، لیکن بہر حال جو کچھ بھی تھا عاصمہ حبیب کالی کالی ایک ایسا نقطہ مرکزی بن کر رہ گئی تھی جس کے گرد کالج کا ہر وجود گھومتا تھا۔ وہ میری روم میٹ تھی اور آج بھی اچھی طرح یاد ہے اس نے کبھی کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیا تھا، وہ ہر ایک سے اتنے مجاز دار نکلا سے بولتی کہ دوسرا کچھ کچھ جاتا تھا۔ کوئی لڑکی بیمار ہوتی تو عاصمہ حبیب سب سے پہلے پہنچتی جس دن نمازِ فاطمہ کی ماں کی موت کی خبر آئی تھی عاصمہ ناز کے ساتھ گرات اس کے شہر گئی تھی اور سوڑ ویہ بھی اس کی چھوٹی بہن کو دے آئی تھی۔ جسے جنم دے کر اس کی ماں فوت ہوئی تھی اور وہ بچک وٹے میں اکیلی پڑی بد رہی تھی۔ دس بیس تو کتنی ہی لڑکیاں روزانہ قرض لے لیتی تھیں لیکن عاصمہ نے کسی اُن کا نام بھی یاد نہ رکھا۔ بلک شاپ پر بھی کتنی ہی لڑکیاں اس کے نام پر کھانیا لیتیں۔ اور اگر میں کبھی ان باتوں کی طرف اس کی توجہ مبذول کراتی تو ہمیشہ ہنس کر یہ کہہ دیتی: چھوٹو یا را اور بہت سی باتیں توجہ کے قابل ہیں۔ کھانے دو انہیں۔ خوشی بہت ہنگی چیز ہے بدست۔ اور اگر انہیں اس طرح خوشی ملتی ہے تو بخدا میں بہت خوش ہوں! وہ ہمیشہ ایسی باتوں سے مجھے لاجواب کر دیتی تھی۔ ہر دیکھنے والے کو عاصمہ حبیب سے شدید نفرت کے ساتھ شدید عبت

ہو جایا کرتی تھی۔ اور میری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ مجھے اُس کے بارے میں جو جراتیں معلوم ہوتیں اور میں نے خود جو کچھ دیکھا میرے دل میں اس کے لئے بے حساب نفرت تھی مگر معلوم نہیں کیا بات تھی میں سوچتی اگر مجھے عاصمہ حبیب کے کمرے سے نکال دیا گیا تو میں بے سانس ہو کر رہ جاؤں گی۔ میں ایک لمحہ بھی نہ جی سکوں گی۔ اپنے اند کے ان جذبات کا تو مجھے اس روز پتا چلا جس روز عاصمہ نے رات کو مجھے چاقو مار کر زخمی کر دیا تھا، لیکن جب لوگوں نے مجھے دوسرے کمرے میں شفٹ کرنے کے لئے میلا سامان اٹھوایا تو میں نے چیخ چیخ کر اُن کو یہ ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ عاصمہ رات کو ہمیشہ صرف اندر دیر پہنچنے تک دھڑکنگ سیات کرتی تھی۔ روز روز کا یہ معمول میری برداشت سے باہر ہو گیا، کیونکہ اسے اس حالت میں دیکھ کر میں زبانی طور پر اس قصد پریشان ہو جاتی تھی کہ ڈھنگ سے پڑھائی نہ ہو پائی تھی۔ اگلی صبح میرا رُوحہ تھا۔ عاصمہ اس حالت میں میرے ساتھ کسی پڑا کر پڑھنے لگی۔ میرا ذہن چکرانے لگا کیونکہ اس سے پہلے وہ کم از کم میرے قریب آ کر یوں بے تحاشی سے نہ بیٹھتی تھی۔ بات ناقابل برداشت تھی۔ میں نے سختی سے کہہ دیا کہ تمہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھ سے پڑھائی نہیں ہوتی۔ میں سوچ بگو نہیں سکتی تھی، عاصمہ اس بات کو اتنا محسوس کر لے گی وہ تیزی سے اُٹھی، اُٹھی سے چا تو نکالا اور چٹخ چڑھا کر کہہ کر ٹوٹ پڑی پھرت اور غم سے میوہ جتنی خشک ہو گیا وہ تو شکر مہربا بخود روم کا پھینکا دروازہ کھلا تھا۔ (دیکھیں عاصمہ کی چیخ و بیکار پر پانچ دہائیوں (وہ صفحے کے تحت ہمیشہ روز روز سے جھنجھتی تھی) انداس طرز میری جان بچ گئی۔ میری وہ انگلیاں

شدید ذہنی ہرجمیں۔ بات وارڈن تک نہ پہنچ سکی۔ کیونکہ عاصمہ نے دوسرے ہی لمحے دور دوڑ کر کچھ اس افسانے سے مجھ سے ملنے کی کوشش کی کہ اُنہیں اپنے آپ کو بھروسہ کچھ ملے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ حاضر حسیب کے متعلق روزِ فضا میں ایسی باتیں سننے میں آئیں کہ میرا ذہن تو اڑھ بگڑنے لگا گیا۔ اُس کا دن رات ہسٹلوں اور کھجوں میں گزرتا اور صبح کا لہجہ میں آکر لڑکے ایک دوسرے کو بتاتے۔ یار اپنا آپ دینے میں بڑی سخی ہے۔ رات تو جی بھر دیا عاصمہ نے۔ کالج کا ہر فرد بشریہ بائیں سُستا اور میں کڑوا کر مٹھ کر مرنے کو آجاتی پھل مانی وہ رات کو ہسٹل کی دیوار چاند کر آتی اور ساری رات کراہتی رہتی صبح چلے پر ہٹنگ خراب اُس کی آنکھوں میں آہستی رہتی۔ رات کو کبھی کبھی وہ اتنے زور سے کراہتی کہ لڑکیاں گھسٹوں کتابیں سامنے رکھے بیٹا دیکھتی رہتی اور ایک دن جب لڑکیاں چل کر وارڈن کے پاس یہ ساری بات پہنچانے گئیں تو وارڈن نے آگ بگولا ہونے کی بجائے جھجے جھجے میں کہا ہر ایک کا اپنے اپنا کیریئر ہوتا ہے یہیں اس کی کراہٹوں یا آواز گویوں پر ہاتھ ڈالنے کی کس نے اجازت دی ہے۔ تم جاسکتی ہو اور لڑکیاں بڑ بڑاتی لڑکھڑاتی واپس آگئیں۔ ہسٹل اور کالج کا کوئی قانون اور ضابطہ اسے قابو میں نہ کر سکتا تھا۔ لڑکیاں صاف صاف کہتی تھیں کہ وارڈن عاصمہ حسیب کی آواز گویوں پر پیدہ پوشی کر کے اُسے بربادوں کے کنارے پہنچا رہی ہے اور جب یہی جھنگ وارڈن کے کانوں تک پہنچی تو اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ یہ لڑکی بہت جلد مرنے والی ہے اور ہم اسے زیادہ دیر تک زندہ رکھ کر خوار نہیں کرنا چاہتے۔ اگر کوئی لڑکی اس پر فقرہ کس دیتی تو وہ بھرے کالج میں آنکھ مار کر کہہ دیتی۔ یادوں کے اُٹھناؤں

گی۔ سمجھیں۔ اور لڑکیاں ساری بات سمجھ کر جلدی سے کھسک جاتیں۔
 عاصمہ کے خلاف شکایات کا ایک انبار پرنسپل تک پہنچ چکا تھا اور وہ بھی سرنوٹش
 کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھی۔ لیکن اسی دنوں پر موشن ٹیٹ میں
 عاصمہ حبیب نے ساری کلاس کو شکست دے کر ساری پرنسپل کو کھجکا دیا۔
 عاصمہ کا پرجہ حیرت انگیز جنگ عرصہ تھا۔ اور اس طرح عاصمہ کے خلاف شکایات
 کا دفتر ایک بار پھر مقلقل کر دیا گیا۔ اور عاصمہ کی سرگرمیاں پھر تیز ہو گئیں۔ اب
 ایک نیا جنون شروع ہوا تھا۔ وہ ہر روز شام سونگ کاسیٹوں کا غنچہ پر ڈالے
 نیشنل ہوٹل کے سونگ پول میں نہانے جاتی اور ساتے میں کسی بھی گاڑی والے
 سے کہتی۔ اے۔ ڈیر ہیں نیشنل ہوٹل تک چھوڑ دو۔ ٹیکسی نہیں ملی رہی۔ اور ٹیکس
 کرکار میں بیٹھ جاتی۔ کاہنالا کوئی پسند آجاتا تو دوستی کر لی جاتی، نہیں تو اترتے تو
 وہ ٹیکس کا دھاکا کریوں بے نیازی سے گاڑی سے اتر جاتی جیسے کرایہ ادا کر دیا ہو۔
 سچ جی ہوں عاصمہ حبیب کو کوئی بچلا سکتا ہے۔ اور آج جب میری بڑی بیٹی چلتی
 مجھے آکر بتایا کہ پرنسپل مس خان نے کالج کے مٹی پر پڑھل کا نام دہمہ حبیب ہال رکھ دیا
 ہے تو میں سوچ رہی ہوں عاصمہ حبیب نے کونسا بڑا کام کیا ہے، وہ تو کالج کا
 ڈبوں میں مرفر دست تھی۔ پھر یہ اچانک مس خان نے کیا کر ڈالا ہے لیکن سوچتی
 ہوں اس مٹی پھر مٹی نے ضرور کوئی بڑا کام کیا ہو گا۔ مجھے ملے تو اسے بیس سال
 ہو گئے ہیں، خبر نہیں عاصمہ حبیب نے ان بیس سالوں میں زمانے بھر کیا کیا ستم
 توڑے ہوں گے۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ عاصمہ حبیب نے ایک شام بڑی پریشانی
 میں مجھے بتایا تھا کہ کل چائینر ہوٹل میں مس خان نے مجھے سعید چاؤلہ کے ساتھ

حال میں دیکھا کہ اس کا ایک ہاتھ میری کمر میں تھا اور دوسرا ہاتھ میری ران پر تھا۔ عاصم حبیب نے یہ ساری بات اتنے ہلکے ہلکے ہو کر بتادی کہ چند لمحوں تک میری قوت گویائی ختم ہو کر رہ گئی۔ لیکن وہ یہ ساری بات مجھے بتا کر یوں ہلکی ہو کر تنگی بجاتی سگریٹ سلگانے بیٹھ گئی جیسے یہ سارا جرم میں نے کیا ہے اور دوسرے دن کا وہ طوفان بھی مجھے یاد ہے کہ میں خان نے ہال میں تمام ڈاکوں اور ڈکریوں کے سامنے آگ بگولا ہو کر عاصم حبیب کو ڈانٹا تھا۔ اور عاصم نے میں خان کو جو جواب دیا وہ کالٹی کی تاریخ کا سب سے پہلا اور شاید آخری حادثہ تھا جس نے خان کی ڈانٹ کے جواب میں عاصم حبیب بڑے سکون سے اٹھی تھی اور بڑی گستاخی سے کہا تھا۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں اپنے ذاتی معاملات میں آپ کو تو کیا خدا کو بھی دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ کو مجھے روکنے کا کوئی حق نہیں اور یہ کہہ کر عاصم حبیب خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی اور میں نے دیکھا میں خان اس وقت کچھ اس انداز سے مسکراتی تھیں جس کو کبھی بھی کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ ن مسکرا کر اور در در کر میز کا سہارا لے کر بیٹھ گئی تھیں۔ ہال میں موجود ہر ذی روح نے سانس روک لی تھی۔ لگتا تھا جیسے ساری کائنات میں سب کچھ مر گیا ہے۔ اور کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اور ایک دن میں خان نے مجھے دفتر میں بلھا کر عاصم حبیب کے والدین کے نام ایک خط لکھوایا۔ جس میں اس کی ساری کدوستانیوں کی مندرجہ ذیل تھی۔ یہ سب کچھ لکھتے وقت میرے ہاتھ لپکا رہے تھے اور میں سچ رہی تھی میں خان کا یہ خط عاصم کے والدین پر کیسے بھروسہ کرتے گا۔ اور وہ جواب میں شاید۔ عاصم حبیب کو اس تعلیم سے بھی محروم کر دیا

جس میں اس کا مستقبل اب بھی چاند کی طرح روشنی نظر آ رہا ہے۔ میں خانیہ خط مجھ سے لکھا کر شاید عامر حبیب کو بھی مطلع کرنا چاہتی تھی۔ وہ میری روم میٹ تھی اور میں خانیہ کا خیال تھا۔ میں اس خط کا ذکر ضرور عامر حبیب سے کروں گی۔ میں نے تو ذکر کیا یا نہ کیا بہر حال مجھے یاد ہے پانچویں روز عامر حبیب کے باپ کا آگیا تھا جسے میں خانیہ نے مجھے اور عامر حبیب کو پڑھ کر سنایا عامر کے باپ نے لکھا تھا "عامر اپنے قول و فعل کی خود مالک ہے اور اگر وہ یہی کچھ چاہتی ہے جو وہ کر رہی ہے تو ہم اُسے روکنا نہیں چاہتے اور نہ ہی آپ کو اُسے روکنے کی اجازت دیتے ہیں۔" اس سے آگے کی سطور مجھے یاد نہیں بس اتنا یاد ہے اس وقت میں خانیہ زور سے مسلسل اپنی کینٹھ پر غنسل بجا رہی تھی۔ اور میں سوچ رہی تھی۔ عامر حبیب اُس ملک کا سب سے اہم اور سب سے دلچسپ نفسیاتی کیس ہے۔ میں خانیہ کے کہنے پر دوسرے دن عامر حبیب کا نفسیاتی کیس سوشل ورک فورسٹائر کی دو لڑکیوں شوکت اور ثریا اجمل کے سپرد کر دیا گیا۔ شوکت اور ثریا اجمل اب سائے کی طرح عامر کے اور اگر وہ اس انداز سے منہ لاتی رہیں کہ اسے خبر بھی نہ ہوتی۔ ثریا اجمل نے تو اپنی تحقیق میں عامر حبیب کی سات پشتیں کھنگالیں لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ثریا اجمل اپنی رپورٹ کی تیاری میں اتنی اچانک عامر کے قریب آ گئی کہ کوئی یقین نہ کر سکتا تھا وہ عامر حبیب کا ہاتھ تھا۔ اسی کی روشنیوں پر اتنی تیزی اور اتنی خوبصورتی سے کود آتی تھی کہ خود عامر کو بھی یہ قطعی احساس نہ ہو سکا کہ اس کے ساتھ غنیشلی ہوٹل کے سوئنگ پول میں نہانے والی ثریا اجمل دراصل اس کے اندر کی خواہی کر رہی ہے اور رات کو چائیر ہوٹل

میں اس کے ساتھ کھانا کھانے والی ثریا اجل وہ سب کچھ دیکھنا چاہتی ہے جو عاصمہ ہوشل اور کالجی میں نہیں دکھا سکتی تھی۔ یہاں سعید چاولہ، عابدیہ انجم اور اس طرح کے دوسرے دوستوں کے ساتھ وہ جو کچھ کر سکتی تھی۔ وہ وہاں تو نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ عاصمہ حبیب کو اندر باہر سے نگار دیکھنے کے لئے ثریا اجل اس کی خلوت اور جلوت میں سایہ بن کر گھس گئی تھی۔ عاصمہ بھی ایک دوست پا کر خوش تھی۔ ادھی تو وہ باتیں تھیں جو اسے عزیز بنائے ہوئے تھیں۔ میں سمجھتی تھی عاصمہ ثریا اجل کے ساتھ رہ کر اپنی روم میٹ کے آداب اور دھکے سب کچھ بھول جائے گی۔ اور اگر وہ ایسا کر لیتی تو میں اسے ایک عام سی لڑکی سمجھ کر بھول بھی جاتی۔ لیکن اس نے کبھی بھی میری توقعات کے مطابق کوئی بھی کام تو نہیں کیا تھا۔ میں چاہتی تھی وہ مجھے ثریا اجل کے سامنے نظر انداز کر دے اور قطعاً سبلا دے کہ میرا اور اس کا ساتھ ایک ہی کمرے میں بہت دیر سے ہے اور یہ کہ ہم دو اصل ایک دوسرے کی بہت عزت کرتی ہیں اور وہ تمام آداب نبھاتی ہیں جو دو انسان ساتھ رہنے کی وجہ سے نبھاتے ہیں۔ میں یہی سب کچھ چاہ کر عاصمہ حبیب کو اپنے دل و دماغ کے اندر عام کر دینا چاہتی تھی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح وہ اس موقع پر بھی میرے اندر اسی مقام پر کھڑی رہی جو بہت اونچا تھا۔ اور جسے گرانے کے لئے میں ہر لچہ کوشاں رہی۔ وہ ہر لچہ ثریا اجل کے ساتھ رہتے ہوئے بھی میرے ساتھ تھی۔ میرے ساتھ احترام اور محبت کا وہی اظہار۔ میری ہلکی سی تکلیف پر جاگ جاگ کر میری خدمت، میری ضروریات کی پُرکمال۔ میرے جذبات کا احترام۔ اور پھر لڑائی کا بھی وہی شدید انداز جس

کی اتنا سبب کسی ملک پوٹ پر ہوتی۔ عاصم حبیب مجھے پورا ہی رخصی روٹوں پر نظر آتی جہاں میں اُسے قطعاً نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں سمجھتی تھی ثریا اہل اسے یقیناً اپنی راہوں پر لے جائے گی جہاں وہ مجھے الگ کھڑی نظر نہ آئے گی۔ وہ مجھے لوگوں کے ہجوم میں انہی کے انداز میں بالکل عام سی لگے گی۔ اور اس طرح میں اپنے اندر عظمت کے اس مینار کو گرانے میں کامیاب ہو جاؤں گی جس کے ہر انیٹ روڑے پر عاصم حبیب قدم جمائے کھڑی تھیں۔ میں سمجھتی تھی ہم دونوں کے درمیان خرابیاں اہل کی یہ اچانک آمد میرے اندر نفرت کی وہ طاقت ضرور پیدا کر دے گی جس سے میں عاصم کو دھکا دے سکوں گی اور اس طرح میرے سینے پر پڑی وہ ہل کھسک جائے گی جس نے میری ساری طالب علمانہ زندگی تکیہ کر رکھی تھی۔ سب یہ ساری باتیں کتنی بھلی اور بے معنی لگتی ہیں۔ بیس سال کے ڈیڑھ ساڑھے وقتوں نے عاصم حبیب کو پاؤں پکڑ کر میرے اندر سے فرہار کر اتنی دور بھینک دیا کہ وہ اس مرحلے میں مجھے کبھی یاد نہیں آئی۔ لیکن سوچتی ہوں آج وہ اتنی بے حساب یاد آئی ہے کہ مجھے لگتا ہے میں اب اس سالوں کے ہر لمحے میں اسے یاد کرتی رہی ہوں۔ صرف اسے۔ اور آج بیٹھی اپنی شکست پر رو رہی ہوں۔ عاصم حبیب کبھی بھی میری دوست نہیں تھی۔ پھر میں نے زندگی کے ہر لمحے میں اسے کیوں یاد رکھا ہے۔ ثریا اہل تو چند دنوں کے لئے اس کے قریب آئی اور وہ سب کچھ پرچہ کر چکی تھی جو عاصم حبیب نے مجھے کبھی بھی نہ بتایا تھا۔ میں ننگی عاصم حبیب کے باہر کے خدو خال دیکھتی رہی اور الجھتی رہی۔ اور ثریا اہل تو اس کے اندر کرا آئی تھی۔ اس کے اندر اسب کچھ دیکھ آئی تھی۔ عاصم حبیب مجھے کتنی دیر دھکا

ہیں رکھے رہی تھی مجھے ہمیشہ دوست کتنی رہی۔ پھر یہ کیسی دوستی تھی۔ بہر حال شاید
 نے عاصمہ کیس کی بڑی طویل اور بڑی دلچسپ رپورٹ پیش کی تھی اور اس میں وہ
 باتیں بھی تھیں جو خود عاصمہ نے ثریا اہل کو بتائی تھیں۔ ثریا اہل کی رپورٹ کے
 بعد پتہ چلا تھا کہ عاصمہ حبیب کی ماں کسی سیکرٹریس کی داشتہ تھی لیکن جس ملک
 کے بعد وہ کراچی آباد ہو گئیں اور وہاں خیرات کی زندگی گزارنے کے لئے ایک ہوٹل
 میں خانہ داری کا مضمون پڑھانے لگیں کیونکہ وہ کھانے پکانے میں بہت ماہر تھیں۔
 بعد میں انہوں نے ایک معمولی ہوٹل کے مالک ایک شخص خدا بخش حبیب سے
 شادی کر لی۔ یہیں کچھ عرصے بعد عاصمہ حبیب پیدا ہوئی۔ زندگی بڑی پرسکون اور
 محبت سے بھری بھری گزر رہی تھی۔ لیکن عاصمہ ابھی تین سال کی بھی نہیں ہوئی
 تھی کہ خدا بخش حبیب کو ممتاز بیگم کے ماضی کا پتہ چل گیا اور پھر باقی عرصہ کچھ یوں
 گزرا کہ خدا بخش حبیب انکارہ بن کر جے ممتاز بیگم کی محبت سینے اور خیرات کا
 کوئی چھینٹا اس آگ کر کھجا دسکا۔ البتہ یہ تھا کہ خدا بخش ممتاز بیگم کو الگ بھی نہ
 کرتے تھے گویا شدید نفرت کے ساتھ شدید محبت بھی تھی۔ عاصمہ اسی حالات
 میں جوان ہوئی لیکن عاصمہ کی خیر جو انی بھی خدا بخش پر قیامت بن کر ٹوٹ۔ عاصمہ
 حبیب تو وہ تھی۔ جو وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ وہ ماں کو پٹے دیکھ کر باپ کو اتنی
 غلیظ گالیاں دیتیں کہ خدا بخش حبیب بچوں کی طرح چیخ مچھ کر اپنا گلا پھاڑا کرتے۔
 ننھا سا وہ پرسکون گھر اب حشر کا میدان تھا جہاں ہر لمحہ دھینگا مٹتی۔ گالیاں
 ہوتیں۔ لیکن یہ دھینگا مٹتی صرف باپ بیٹی کے درمیان ہوتی۔ وہ دونوں بچوں کی
 طرح ایک دوسرے کو نوچتے کھوٹتے کپڑے پھاڑتے اور ممتاز بیگم منہ پھوٹتے

کا پتھر رکھے زار و قطار روتی یا پھر ساری رات جاگ جاگ کر دونوں کی ذمہ داری اور جسمانی صحت و سلامتی کی دعا مانگتی۔ ایک دن عاصمہ نے بتایا تھا کہ اس نے اپنی کچھ سیلیوں کو کھانے پر مدعو کیا تھا لیکن جب وہ لوگ میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے تو میں اس وقت بابا آئے اور مجھے بلا وچکس کر منہ پر چاٹا مار دیا غصے اور غم سے میرا وہ حال تھا کہ میں نے اندھا دھند لاتوں اور رکوں سے بابا کو مارنا شروع کر دیا۔ یہ مجھے خود بھی پتا نہیں اس وقت میرے اندر کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی۔ بابا نے بھی اُس دن مجھے بہت مارا تھا اور میرے سامنے کے دو دانت توڑ دیئے تھے اور پھر اُس دن کے بعد میرا ہاتھ کھل گیا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کو پٹیا کرتے تھے لیکن ان حالات میں اگر میں کبھی کسی سیلی کی پٹیاں چھپ جاتی تھی تو بابا باؤلا ہو جاتا تھا وہ مات کو اٹھ اٹھ کر دیوانہ وار روتا میرے نام کی چھین گٹا میری ماں کے پاؤں پر کر میلاتا پوچھتا اور پھر دن کو میری ماں کو اتار دیتا کہ وہ سوچ کر خلی ہو جاتی۔ مجھ پر اُٹھ کر بڑا کرتا۔ جس دن ماحم حبیب گھر سے روٹ کر ہسپتال آئی تھی تو میں ماؤ تک باپ کو اپنا کھوج نہ دیا تھا اور مجھے یاد ہے وہ باؤلی شکل کا خدا بخش حبیب جب عاصمہ کو کھوجتا ہوا ہسپتال آیا تھا اُو عاصمہ سے ملی تھی تو وہ پاگوں کی طرح پیچ پیچ کر عاصمہ حبیب کو پیار کر دے ہر سقا۔ اُسے چھ سو روپے نقد دیئے جو اس نے اسی رات اپنے دوستوں کو کاکٹیل پارٹی دے کر خرچ کر ڈالے تھے اور بچوں کی طرح خوش ہو کر گھر چلا گیا لیکن دوسرے دن جب وہ ہسپتال میں عاصمہ کو ملنے آیا تو اس نے ساری رکاوٹوں کے سامنے اُسے اتنی گندی گندی گالیاں دیں کہ عاصمہ نے اسے دھکا دے کر ہسپتال کا گیٹ بند

کر دیا تھا اور وہ چیتا ہوا واپس چلا گیا تھا۔ باقی کا سارا وقت کچھ یوں گزرا کہ کبھی کبھی عاصمہ کے لئے مستحاثی کے ڈبے کپڑوں کے ڈھیر اور پھلوں کی ٹوکریاں لانا اور کبھی کبھی اُسے ساری لڑکیوں کے سامنے چھڑا کر لگایاں دیتا ہوا چلا جاتا۔ اور اسی لئے عاصمہ نے اپنے اوقات کا زیادہ حصہ باہر گزارنا شروع کر دیا تھا۔ اور اگر کبھی کبھی وہ ہوسٹل میں موجود ہوتی بھی اور اس کا باپ اُسے منے آجاتا تو وہ کھلوا دیتی وہ ہوسٹل میں موجود نہیں۔ عاصمہ ہوسٹل کا انتہا پسپ کر دار بن گئی تھی اگر عاصمہ حبیب اس ہوسٹل اور کالج سے چلی گئی تو اس کالج کے سارے سٹوڈنٹس جھوک ہڑتال کر دیں گے اور پڑھائی کو کھپ کر کے گھروں میں بیٹھ جائیں گے۔ اور ایک دن واقعی عاصمہ حبیب چلی گئی میرے کمرے سے میرے کالج سے اور میرے ہوسٹل سے۔ اور میں سوچتی تھی کہ کالج میں ہڑتال ہو جائے گی سٹوڈنٹس ہڑتال رکھیں گے اور عاصمہ حبیب واپس آنے پر مجبور ہو جائے گی۔ واقعی یہ سب کچھ ہوا جس دن عاصمہ حبیب اچانک سفید پتوں والی سفید کاری ڈگی میں اپنا سامان بھر کر چلی گئی تو لڑکیوں اور لڑکوں نے ہاتھ باندھ باندھ کر عاصمہ حبیب کو روکا اور رو کر اپنی آنکھیں پوچھیں اور ہوسٹل کے کھانوں کے میچے آٹ دینے لیکن سب سے حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جب صبح کو وارڈن نے میں عاصمہ حبیب کے چلے جانے کی اطلاع دی تو میں خان نے وارڈن کو فوراً محفل کر کے سٹوڈنٹ کے ساتھ انتخابی ہمدردی کا اظہار کیا۔ دوسرے دن جب میں خان نے مجھے دفتر میں بلایا تو مجھے محسوس ہوا میرے اندر باہر اتنے آسٹوٹس ہو گئے ہیں کہ اگر میں خان نے ایک دفعہ بھی عاصمہ حبیب کا نام لیا تو میں گھبل جاؤں گی۔ باگل ہو جاؤں گی اور مجھے کوئی

بات بھی نہ ہو پائے گی میں خانہ بھی بھی مینہ برسر رکھے پڑنی تھیں۔ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں اُن کے رخسار انگارہ ہو رہے تھے۔ وہ مجھ سے شاید عامر کے اچانک جانے کی وجہ پوچھنا بچا ہتی تھیں۔ لیکن اُن سے کچھ بھی نہ بولا گیا، وہ تھوڑی دیر تک میری طرف دیکھتی رہیں۔ اور میں سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کوئی جواب نہ دے سکی اور پھر اچانک ہی اُنہوں نے کہہ دیا۔ تم جاسکتی ہو۔ ذہن۔ لیکن اب سوچنا ہوں، میں خانہ کے لئے تو میرے پاس اس وقت بھی کوئی جواب نہیں تھا اور نہ آج کوئی جواب ہے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ عامر نے یوہ میں رسالوں سے غور کرنے کی بہت ساری ننگی تصویریں کاٹ کاٹ کر اپٹ کرے کی چاروں دیواروں پر چپکا رکھی تھیں۔ وہ رات کو ان تصویروں پر مانتے پھرتی پھرتی سو جاتی۔ میں اکثر دن کو غصہ بڑھنے کا احتیاط سے اتار دیتی تھی اور رات کو اس کے آنے سے تصویریں پہلے اسی طرح چپکا دیتی تھیں۔ اس طرح یہ بات وارڈن جیسے چھپی رہی، لیکن میں نے روز روز کی اس تکلیف سے تنگ اگر تصویریں اتارنا چھوڑ دیں۔ ویسے بھی اُن دنوں وارڈن کچھ بیمار تھیں۔ اور اس کا راونڈ متوقع نہیں تھا۔ لیکن اُس رات اچانک وارڈن راونڈ پر آگئی کرے کی ساری دیواریں ہلکی منتقل دیکھ کر وارڈن کو غصہ آگیا۔ لیکن وارڈن نے حسب معمول عامر حبیب کو کچھ کہنے کی بجائے تصویریں پھاڑ پھاڑ کر کمبزنوں کی طرح اڑانا شروع کر دیں۔ بجلی بند تھی، عامر کو غصہ آگیا۔ وہی مہلک غصہ جس کا شکار اکثر میں ہوتی تھی۔ عامر نے جلتی ہوئی تنگ سا نرسروم تہی اُٹھا کر وارڈن کے سینے میں گھسیٹ کر دی مجھے یاد ہے اس کی ایک چھاتی بڑی طرح جل گئی تھی۔ وارڈن نے اُسے عدالت میں گھسیٹنے کی دھمکی دی تھی۔ سوچتی ہوں عامر ڈرنے والی حرکت

نہیں تھی۔ پھر وہ کیوں چلی گئی۔ لیکن اس کی بے خبری تو اس خط سے پتہ چل گئی جو دوسرے دن اس نے وارڈن کے نام کسی نامعلوم جگہ سے بھیجا تھا۔ اُس نے لکھا تھا غصہ میرے ہاتھوں نے آپ کے ساتھ جو کتاخی کر ڈالی ہے۔ وہ چپچپ مجھے نہ بخیندتی ہے نہ مرنے دیتی ہے۔ اے لاش میں بٹ مجھے عدالت میں کوئی سزا دلوا کر اس اذیت سے نجات دلادیں۔ میں نے بہت بڑا کرگیا ہے میں بٹ۔ اور یہ زندگی میں پہلی بار مجھے احسا ہوا ہے کہ میں نے واقعی بہت بڑی حرکت کی ہے جو کس طرح بھی قابلِ معافی نہیں۔ میں نے وہ خط میں خان کو دے دیا میں خان اُس خط کو لے لئے لو کہڑاتی پھر رہی تھی اور مجھے گتا تھا عاصم عجیب کا نسخہ سادہ جو میں خان کی ہر سوچ اور ہر احساس پتو ل کر رہ گیا ہے۔ عاصم عجیب کا یہ خط اس سلسلے کی وہ آخری بیڑی تھی جس نے میرا دل کی پوری شخصیت کو جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور آج جب بیس سال بعد عاصم عجیب کا ہر بات اور ہر لمحہ مجھے یاد آ رہا ہے تو میں وہ بات بھی کیوں نہ لکھ دوں جو صرف عاصم اور میرے درمیان ہوتی تھی۔ وہ بات جو آج سے کچھ سال پہلے مجھے بالکل بکواس لگی تھی۔ لیکن جو آج مجھے حیرت زدہ اور دکھی کئے جا رہی ہے جس شام اچانک عاصم نے ہسٹل چھوڑنے کا پرہ گرام بنالیا تھا۔ مجھے اُس دن پہلی بار احساس ہوا تھا کہ سادہ عاصم عجیب سے مجھے کتنی شدید محبت تھی۔ وہ محبت جو بے غرض اور سادگی ہوتی ہے۔ یا خبر نہیں وہ محبت میرا جذباتی بن تھا۔ لیکن مجھے گتا ہے میرے دل میں عاصم کے لئے اب بھی وہ محبت ہے جس نے مجھے اُس کے جانے والے دن خود کشی پر مجبور کر دیا تھا۔ حالانکہ اس کے وجود سے مجھے ہزاروں پریشانیوں اور تکلیفیں تھیں جس دن شام کو سفید گاڑی میں اپنا سامان لیے آئی اور مجھے جاتے ہوئے خدا حافظ کہا تو اُس لمحے

مجھے محسوس ہوا تھا میری روح اچانک میرے اندر سے نکل کر بیس کہیں فرشتہ برگر گئی ہے۔ میں نے اُسے دکھا کر اس کے سامنے نیلی سیاہی کی پوری بھری چوٹی شیشی اپنے حلق میں اُنڈیل لی تھی لیکن عاصم نے یہ سب کچھ دیکھ کر بچکے سے میرا گل تھپتھپایا اور ٹھکرائی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ اور اس وقت مجھے عاصم سے اتنی شدید نفرت ہو گئی تھی کہ میں نے بیس سال تک ایک لمحے کے لئے بھی اُسے یاد نہیں کیا تھا۔ لیکن آج جب میری بیٹی نے مجھے اگر بتایا ہے کہ میں خانہ تے اُن کے کالی کے مٹی پر پڑا ہوا کلاما مہا ہاں رکھ دیا ہے اور ڈھیرا جمل کی پورٹ کو اپنے تاثرات کے ساتھ کتاب کی صورت میں بچھوایا ہے۔ تو سچی جوں دراصل عاصم صیب ہیں کتنی یاد ہے۔ اور آج مجھے بس خانہ نے عاصم صیب پر لکھی ہوئی وہ کتاب بھجوائی ہے۔ کتاب کا صرف آخری باب پڑھوں گی۔ اس سے پہلے کا تو عاصم صیب کا ایک ایک لمحہ میرے قلم میں ہے۔ میں خانہ نے کتاب کے آخری باب میں لکھا ہے۔ عاصم صیب آج کل لوگوں کی کسی جہاز ساز کمپنی میں مینیجر ہے۔ - اور بی بی سی اپنے کسی پمڈ گرام میں عاصم صیب کی انگریزی فلموں کا ایک سلسلہ ہر روز کسی فرضی نام سے نشر کرتی ہے۔ میں خانہ نے مجھے اپنے خط میں لکھا ہے کہ وہ دواہ کی رخصت پڑھ کر جو جارہی ہے، اس دواہ کا ہر لمحہ وہ صرف عاصم صیب کے پاس گزارے گی۔ میں خانہ نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی ہے۔ لیکن سچی جوں عاصم صیب نے اتنے بڑے دُخ کے سامنے اپنے اس حقیر وجود کو کیسے سنبھال سکوں گی۔ عاصم صیب اب بھی میرے اندر بڑی ادنیائوں پر کھڑی ہے۔ لیکن میں سے مجھے نفرت ہے۔

سی، ایل کاوش

اُس بازار سے

میرے ہاتھ میں بندھی ہوئی راکھی کو دیکھ کر حفیظ قندھاری نے کہا: ”ٹوٹا گل ہوا
عورت ماں ہوتی ہے۔ نہ بہن نہ بیٹی۔ اس کا مرد سے صرف ایک ہی رشتہ ہوتا ہے۔
جنس رشتہ، مرد جس جس کا پیکر ہے اس نے اسے پیٹ کی جھوک سے زیادہ جنسی
جھوک پر نشان کرتی ہے۔ سماج کے بندھنوں کی وجہ سے وہ کچھ عورتوں کا لحاظ منروہ
کرتا ہے لیکن جس طرح فاقے کے عالم میں وہ کبھی کبھی روٹی چھین کر یا چڑا کر کھا جاتا ہے
اسی طرح جنسی تشکیں کے لئے رشتوں کی بے حرمتی کر سکتا ہے۔“

سید یزدانی جالندھری نے میرے ہاتھ سے مسٹائی کا ڈبہ چھین کر کھولا اور اسے
حفیظ کے سامنے بڑھا کر کہا۔

”وہ مسٹائی کھاؤ۔“

سید یزدانی نے اس گلا حفیظ کے مونہ میں رکھ کر اس کا مونہ بند کر دیا
چاہا۔ حفیظ اسے کھاتے ہوئے میری طرف گھورتا رہا۔

ان دونوں لاہور کی ایک مشہور ایکٹرس میرے راکھی بانڈھا کرتی تھی۔ میں ہندو وہ مسلمان ہم دونوں ایک دوسرے کو بھائی بہن مانتے تھے۔ حفیظ اس رشتے کے مخالف تھے۔ سینڈیز ترمذی کو اس بات سے توافق تھا کہ عورت بہن ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ ایک ایکٹرس بہن ہو سکتی ہے۔

سید بردانی جالندھری کا خیال تھا کہ یہ بحث سراسر فضول ہے۔ سب رشتے بننے اور بھانے کی بات ہے۔ آج کے آدمی کی مشکل یہ ہے کہ وہ کتنا کچھ ہے اور کتنا کچھ ہے اور اصل کسی اور ہی بات پر گر ڈالتا ہے۔ حفیظ قندھاری نے کہا،

”یہ کلیہ عورت اور مرد کے رشتے پر کھرا نہیں اُترتا۔“ اتنا کہہ کر اُس نے عورت کی بیالوجی بیان کر ڈالی۔ اور پھر عورت کی نفسیات کو سمجھاتے ہوئے فرائیڈ کی قبر کو دفن شروع کی۔ اور کام موثر، کاحوالہ دیتے ہوئے رشی دانساؤں کی چٹا کریدنے لگا۔

حفیظ قندھاری زندگی میں ٹھیکہ اور بحث میں نوکیلا تھا۔ بحث میں کسی ہار نہیں اور زندگی میں کبھی جیتا نہیں۔ اُردو زبان وہ لکھنوی انداز میں بولتا تھا چشتو دہائی پٹھانوں کی طرح فارسی ایرانیوں کی مانند اور پنجابی تو اس کی مادری زبان تھی۔ نام تھا عبدالحفیظ کہلاتا تھا حفیظ قندھاری۔

تین مسلمان ایک ہندو، ہم چاروں دوست اکٹھے رہتے تھے۔ لاہور میں چوچی دھواڑے کے باہر گھائی اترتے ہی ہمارا مکان تھا۔ مکان کا کرایہ ہندو جانی بھڑا اور ترمذی دیتے تھے۔ گھائی کے اس طرف منزل ہوٹل تھا۔ وہاں ہم لوگ کھانا کھاتے تھے ہوٹل کا بل حفیظ کے ذمہ تھا اور وہیں تو ہندو تھا۔

ان دونوں منزل ہوٹل اور عرب ہوٹل اُردو ادیبوں کے دو ٹھکانے تھے۔ اُردو

سب کا دفتر بھی منزل ہوٹل میں تھا۔ اُردو کے بڑے بڑے استاد شمس العلماء
تاجور نجیب آبادی سر لانا صلاح الدین احمد، احسان دانش، اختر شیرانی پورا میں
حسرت قمر جلال آبادی، عاشور دشت کاغییری، ساحر دھیانوی سب وہاں اکٹھے ہوتے۔
اُردو ادب پر بحثیں ہوتیں۔ زندگی کے روز اور شامی کے نکات پر کھے جاتے۔ یا
لوگ تنقید میں استاد علی کی ٹوپیاں اُچھال دیتے۔ اور کبھی کبھی لونڈوں کے سر پر ٹریاں
باندھ دیتے۔ حفیظ قندھاری ان مجلسوں کے اچھے مانے جاتے تھے۔

حفیظ قندھاری نے زندگی میں ہمیشہ کام کی تلاش کی، مگر کبھی نام یہ نہیں بیٹھا
کے والد قندھار (افغانستان) میں ڈاکٹر تھے جب ہم لوگوں کے مالی حالات خراب
ہوتے تو حفیظ قندھاری چلے جاتے اور اپنے والد سے روپیے لاتے، اس روپے
کے آتے ہی ہم سب دوست ایک ساتھ مال دلوں جاتے تھے گھر میں دنگ و دھن
ہوتا۔ فریج بدلتا۔ یاروں کے سوٹ بدلنے لگتے۔ حفیظ قندھاری منزل ہوٹل کے باہر کبھی
کھانا کھاتے اور کبھی بھیلے آدمی کو ہوٹل میں کھینچ کر کھانے کی میز پر بٹھادیے
عرب ہوٹل سے کباب منگاتے جاتے تو گینگ بکری انارکلی سے پیسٹری، کیک، یا رولز
خوب سیر ہو کر کھاتے۔ حفیظ کے خلوص کی تعریف کرتے۔ اس کی بحث اور تنقید کا پٹھلا
لیتے اور ”زندہ باد“ کا نعرہ لگا کر چلے جاتے۔

ایک بار کا ذکر ہے حفیظ قندھاری نئے نئے قندھار سے مال دار ہو کر آئے تھے،
دھڑیں چوری نہیں۔ یا رباشی کے مزے آرہے تھے۔ ایک شام کو ہم رگ منزل ہوٹل
میں اکٹھے ہوئے تو حفیظ قندھاری نہیں تھے۔ کہاں گئے تھے کچھ پتہ نہیں گیا۔ بجے
تک انتظار کیا۔ پھر کھانا کھایا۔ لیکن کھانا بے مزہ رہا۔ حفیظ کی باتوں کی چٹنی دھڑکی

پرنہ ہونو کھانا کیسا۔! بس کسی طرح پیٹ بھر لیا اور جا کر سو گئے۔

رات کو دو بجے حفیظ قندھاری نے دو دھارے پروٹنگ دی۔ میں نے دھارہ کھولا تو وہ جھرمٹے نظر آئے۔

”کہاں تھے تم؟“ میں نے پوچھا۔

”قیامت کی گود میں“ حفیظ نے لڑکھڑاتے قدموں سے دبلیز کے اندر داخل ہو کر کہا۔

”قیامت کی گود میں؟ میں حیران ہوا۔

”یاد تھو میں تو گود ہی تھی۔ لیکن حقیقت میں۔ میرے سامنے یہی تھی؟“

”یہ شراب اسی نے چلائی ہے کیا؟“

”نہیں میں نے چلائی ہے۔“

”قیامت کو؟“

”نہیں، جس کے پاس وہ رہتی ہے اُس کو۔“

”کس کے پاس رہتی ہے؟“

”میرا مٹھی گتے تھے تم؟“

”ہاں میرا مٹھی میں ہی رہتی ہے وہ۔“

”لاہور کی طوائف ہے؟“

”نہیں میرا ست سوات کے کسی گاؤں کی گورن ہے۔ جبری معصوم بھائی ہے۔“

سوائے خشتو کے دوسری زبان نہیں جانتی۔ لگن نہای سیکھ لے اور فلم کے پردے پر

آجائے تو سب میری نہیں مات ہو جائیں؟

”تم اسے ایکٹریس بنانا چاہتے ہو؟“

نیزوانی نے کروٹ بدل کر تیز آواز میں کہا۔

”سوئے بھی دو گے؟“ پھر وہ بیک کراٹھے اور تہی بھجا کر ستر میں گھس گئے۔

حفیظ قندھاری نے چھپسپاتے ہوئے کہا۔

”لو کی کا نام انور ہے۔ خوب صورت جوان۔ ایمان کی نظر پڑ جاتے تو سینہ آجاتے۔“

جس کے پاس ہے اس کا نام ہے اللہ دیا۔ اس کے مکان پر لوگ آتے ہیں،

بیٹھتے ہیں لیکن صرف شراب پیتے ہیں۔ اور پھر عالی ماتہ چلے جاتے ہیں۔ پیسے میں

ترجہ راء ہیں نے لقمہ دیا۔

حفیظ نے کہا: اللہ دیا تو یہی کہتا ہے حضور میں خود اس سے نکاح کرنے

والا ہوں۔ ہم کبھی نہیں لیکن ہماری بھی عزت ہوتی ہے۔ ہماری بہنیں اور بیٹیاں تو

پہننے پر بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن یہودی میں پردے میں رہتی ہیں۔ ستارے بھی بغیر نہیں

چھو سکتے۔ وہ تو صرف آنکھ بھولی کھیلتے ہیں۔ تمہاری نظر میں انور کو ٹھیراتی ہیں۔

لوگوں کے ماتہ بھی چھو چکے ہوں گے۔“

”نامکون؟“ حفیظ قندھاری بدک کر پورا بچکان ہو گیا۔

”میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ ابھی تک وہ پاک دامن ہے۔ سوات کی کنواری

کلی ہے انور!“

میں نہیں پڑا۔ لاہور سے پشاور تین میل دور ہے۔ پشاور سے سو میل دور

مردان ہے وہاں سے شرمیل آ کے ریاست سوات کا دار الحکومت منگروہ ہے۔

اور اس سے آگے انور کس گاؤں سے آئی ہے اتنے لمبے سفر میں کلی کیا بھول بھی

مرجھا جائے۔۔۔۔۔ مرد کے ہاتھ پکھڑیوں کو نوچ کر ہوس کی بھونکوں سے ڈرا دیتے ہیں ادویوں بھی بقول تمہارے عورت اور مرد کا رشتہ صرف ایک ہی ہے۔ اس لئے اب سو جاؤ رات گری ہو گئی ہے۔“

حفیظ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے جی جلاوی۔ میں نے لحاف میں منہ چھپا لیا۔ کان بھی لپیٹ لئے حفیظ نے لحاف اتار پھینکا وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ اور لاکھوں کی مسروری کا احساس بھی غائب ہو چکا تھا۔

دوسرے دن ہم ہیرا منڈی میں تھے۔ ہمارے سامنے سوات ریاست کا دل کش شباب تھا۔ گداز بدلی، تیکھے نقش، گورے رنگ میں گلاب کی سُرخ گھٹلی تھی۔ لو کی کیا تھی اک سر پہ جلوہ۔ اس کے لبوں میں ہشامیت اور انداز میں فسائیت تھی۔ ہاں اُردو بولتے تو تذکیر و تائیت کے فرق کو مشاویجی۔ اس پر بھی آدمی کا دل آواز کے آثار چڑھاؤ پر لہریا لیتا رہتا۔ اٹھ دیا پاس بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ ہم آنکھیں سینک رہے تھے۔ حفیظ نے ایک سو روپے کا نوٹ نکالا اور کہا۔

”فدا ناشے کا بندوبست کرنا۔“

”اٹھو یا نوٹ لے کر کھلے کوڑے سے باہر نکل گیا۔ دروازے کا پروہ ہتارہ گیا۔ میں نے پشتوں پر چھپا۔

”تہ پختوئے؟“ (تم پشٹانی ہو؟)

”آہوا“ (ہاں ہی) اور نے جواب دیا۔

”تے سنگھا پختوئے؟“ (تم کیسی پشٹانی ہو؟)

اب اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خرمندی کا وضہ لگا

پھیل گیا۔ گالوں کی سُرخی غائب ہو گئی۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی مگرے میں کچھ شراب کی خالی بوتلیں، کچھ خالی گلاس اور سگریٹوں سے اٹے ہوئے ایش ٹرے رکھائی دے رہی تھیں۔ افند کی نظریں ان سب چیزوں پر سے گزرتی رہیں۔ وہ دیر سے بولی۔

”واہاں قسمت دینی؟“ ”یہ میری قسمت ہے۔“

حفیظ افند کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

میں نے حفیظ سے کہا۔

”مشرق والوں کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ہر بُرائی کو قسمت کے ماتھے مندرجہ تھیں۔“

حفیظ نے جواب میں مجھے گھور کر دیکھا مگر بولا نہیں۔ اور خالی بوتلیں میٹ کر

اندھ چلی گئی۔ حفیظ کی نظریں بھی اس کے پیچھے بھیجے چلنے لگیں۔ دل تو پہلے ہی تعاقب

کر رہا تھا، روح کا پتہ نہیں۔

میں نے حفیظ کو مخاطب کیا۔

”یہ جتنی خالی بوتلیں اٹھا کر لے گئی ہے اتنے ہی آدمی رات کو اس گھر میں آتے

ہوں گے۔“

”تو متعجب ہے!“ حفیظ کے جڑے کلن گئے۔

”تو نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے؟ میں نے کہا۔“

اتنے میں اشد ویا حلال کئے ہوئے چار پارچ مرچے اور بہت سا سامان اٹھا کر

لے آیا اور انور کو پکار کر کہا: ”ان کو پکا دے۔“ اور پھر وہ آگیشی کے سامنے بیٹھ کر

ناپنے لگا۔ باہر آگن میں دھوپ نہیں تھی۔ آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔

ماحول کھلا گیا تھا۔

”ہیں، کاسے پتے میں، انگلیشی دروازے کے آگے رکھ لیا، اتنا کہ کر حقیقت نے انور سے پشتو میں کچھ کہنا شروع کیا۔

اللہ دیا، مہم بھاڑے دیکھنے لگا۔ پھر جھٹکا کر بولا: ”ایتھے آ کے سیدھی سی پی ڈی دیں گی، کیتا کر دیا ہو صاحب! اے دغا راؤ، ڈا نہیں چلے گی۔“ اتنا کہ کر اس نے فلور کے نیچے سے کمانی وار چا تو نکالا۔ اور مرغوں کے ٹکڑے کرنے لگا۔ اس کے تیرہ ایک ایسے دلال کے سے تھے جسے دو پارٹیوں کے آپس میں مل جانے کا دھڑکا رہتا ہو جس میں اس کی اپنی دلالی ڈوبتی نظر آئے۔

مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے اللہ دیا کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر کہا: ”ہوہ پشتو میں صرف یہ کہہ رہا ہے کہ آج ذرا پٹھانی انداز میں کھانا کھلاؤ۔! اچھے کابل یاد آرہا ہے، رنگورا میں اس نے ایک دعوت کھائی تھی۔ اس کا فائدہ آج تک اس کی زبان نہیں بھولی۔“

انور آہرچی: ”کہہ کر ڈیجی انگلیش پر رکھنے لگی۔ میں پیاز چھیننے لگا۔ بظاہر سب کام میں مصروف تھے، سب خاموش تھے، لیکن ہر ایک کے دل میں طرح طرح کے سوال سر اٹھا رہے تھے۔

پھر جانے حقیقت کو کیا سمجھی، اس نے اپنا کیمرا اٹھایا اور دلش گن تیار کرنے لگا۔ اللہ دیا نے دیکھ کر پوچھا: ”کیا پھر ٹوڑے؟“

”ہاں، ایک اخبار کے لئے انور کا فوٹو لوں گا، اور نیچے لکھوں گا۔“ بے نام فلم کی سیرس۔ ”نیا چہرہ۔“ اودھ کھلی گئی۔ ”پھر پنجاب کی ساری فلم انڈسٹری اس کی تھا

میں ماری ماری پھرے گی۔“

اشد ریائے افسد کی طرف دیکھا پھر میری طرف دیکھ کر کہا: یہ گانا نہیں جانتی،
ناجنا نہیں جانتی۔ زبان نہیں جانتی یہ کیا ایسی کی تھی میری دس بنے گی؟
”..... اور ساتھ میں تمہاری بھی؟ میں نے لقمہ دیا۔

اشد دیا پہلے حفیظ کو تکتا رہا۔ پھر انور کو گھورتے لگا۔ اس کے بعد بولا: ہر تو
سکتا ہے لیکن تم اخبار والوں سے ڈر گتا ہے۔ بڑے بگڑی ہوئے ہیں خبر کچھ ہوتی
ہے چھاپتے کچھا دو ہیں؟

میں نے کہا: کچھ ایمان دار بھی ہوتے ہیں میاں؟

”لوہی کے معاملے میں سب بے ایمان ہیں۔ بابو صاحب! اور آپ شاید

بھولتے ہیں۔ یہ میری بیوی ہے۔“

”تو پردے میں بٹھاؤ!“ میں نے تنگ کر کہا۔

”ابھی نکاح نہیں کیا ہے۔ پر کچھ رہا ہوں کسال! اور پھر ہے یا نکاح وہیں کیڑا

بن جائے گی تو اس کی زندگی سفور جائے گی؟“

حفیظ نے دلال کے دل میں لالچ بھروا دیا تھا۔ اب وہ بڑے کاروبار کے خواب
دیکھنے لگا تھا۔ حفیظ نے انور کو چھوٹے بغیر اس کے تین چار نوٹ کیسے اور بات
کراگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

ایکٹرس بننے کے بعد اگر تم شادی کرو گے تو تمہاری تصویریں بھی چھپیں

گی، پروڈیوسر پارٹیوں میں بلائیں گے؟

”ایکٹرس شادی کہاں کرتی ہے صاحب! وہ تو ایک قانونی بھڑواہل

لیتی ہے۔ ”اٹھ دیا کے اندک انسان بول پڑا۔ اور ہم لوگ پھر دسے نہیں کنج رہیں۔ عزت کی روٹی کھاتے ہیں۔ اپنے پیشے کے بار نہیں جھانکتے اب متا ز شانتی کو دیکھ لو، ایکٹرس بن گئی... لیکن....“

حفیظ نے بات کاٹ کر کہا: وہ بھی تو ولی سے شادی کرنے والی ہے۔“

میں بولا: ”ولی بھی شاید ابھی اسے پرکھ رہا ہے۔“

اٹھ دیا نے کہا: ”نظامی کی وجہ سے شادی نہیں ہو سکتی۔“

”نہیں یاد رہ آج کل گیتا کو ٹریننگ دے رہا ہے۔ حفیظ راز بتانے لگا۔

”گیتا کی ٹریننگ کے لئے اس نے ڈانسنگ کمپنی کھول رکھی ہے۔ متا ز شانتی کے

نام پر روپیہ بٹور رہا ہے۔ گیتا جب تیار ہو جائے گی اور متا ز شانتی ولی کی بیوی بن

جائے گی۔ تو گیتا کی کسائی نظامی کے بڑھاپے کا سہارا بن جائے گی۔“ پھر حفیظ نے

پہلو بدل کر یہ تجویز رکھی کہ متا ز شانتی کی ڈانسنگ کمپنی میں انور کو شامل کر اسے

دیتے ہیں۔ وہاں ناچ بھی سیکھ جائے گی زبان بھی اور ایکٹرس بھی بن جائے گی۔

چیمہ کتنا طے گا؟“ اٹھ دیا نے پوچھا۔

”تین سو روپے تو متا ز شانتی سے کہہ کر میں دلوادوں گا۔“ حفیظ نے بڑکیا۔

”تین سو؟“ اٹھ دیا حفیظ کے سہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے چاقو بند

کر کے نیچے میں رکھ لیا۔

میں نے کہا: ”حفیظ کی بات کو نہ متا ز شانتی ٹال سکتی ہے۔ نہ نظامی ٹال

سکتا ہے۔“

”تو معاملہ پکا کر دیجئے۔“

اگلے دن ہم لوگ اللہ دیا کو لے کر متناز شانتی کے یہاں پہنچے، نظامی نے ہمیں سو روپے کے نوٹ لگ کر اللہ دیا کے ہاتھ میں رکھ دیئے، اور کہا: ”ہم لوگ حیدر پشاور جا رہے ہیں انور ہمارے ساتھ جائے گی۔“

”وہ بے چاری اکیلی کیسے جائے گی؟ میں بھی ساتھ چلوں گا؟“ اللہ دیا نے اڑچھن ٹوٹی۔

”ہم پر اعتبار نہیں ہے؟“ نظامی نے پوچھا۔

”اعتبار کی بات نہیں ہے۔ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔“

نظامی نے حفیظ کی طرف دیکھا۔ حفیظ نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ نظامی نے اللہ دیا کی بات مان لی۔ ”تم بھی چلو، لیکن تمہارا کرایہ....؟“

حفیظ نے کہا: ”کمپنی دے گی۔“

متناز شانتی بولی ”کمپنی دے گی؟“

معاہدے ہو گیا۔ میرسل شروع ہو گئی۔ حفیظ قندھاری نے دوسرے دن بینک سے پانچ سو روپے نکلوائے۔ وہ روپے حفیظ نے کہاں خرچ کئے کسی دست کو پتہ نہ چلا۔

شام کو میں نے منزل ہوٹل میں حفیظ سے پوچھا: ”تم بھی پشاور جاؤ گے؟“

”نہیں ابھی نہیں۔“

”میں نے پھر کہا؟“ اللہ دیا کا عشق سچا معلوم ہوتا ہے۔ پشاور تک اور کہا کرتے ہیں جانے دیتا۔“

”عشق کس کا سچا ہے یہ بات ابھی تم لوگ نہیں جانی سکتے۔“

”لیکن تم تو عشق کے قائل ہی نہیں، صرن یکس کے قائل ہو؟“
 ”میں اسے بیری بنانا چاہتا ہوں۔ رشتہ وہی ہے لیکن دنیا کی نظروں میں
 ذرا قانونی ہو جاتا ہے۔“

”اٹھ دیا بھی وہی بنانا چاہتا ہے۔“ میں نے چوٹ کی حقیقت نے اس بات
 پر دودھ بھری نظروں سے بیری طرف دیکھا۔
 مستانِ شہنشاہ کی ڈانگ پارتی تو رہ چکی تھی۔ اور حقیقتِ قندھاری آپس بھرتے
 رہ گئے۔

حیدر سے دودھ پیتے اور نے حقیقت کے نام خط بھیجا۔ پشتو میں گل ایک جلد
 لکھا تھا: اختر رافیلے تے رائے۔ (حیدر آگئی۔ تم نہ آئے)
 خط ملتے ہی حقیقت پشاور روانہ ہو گیا۔

ہم لوگوں نے سمجھ لیا کہ اب حقیقت لاہور واپس نہیں آئے گا۔ وہ انور کو لے کر
 قندھار یا کہیں دُور مہاجک سبائے گا۔ مہاجر لوگ ابھی تباہ اور آئیاں ہی کر رہے تھے
 کہ ایک دن صبح کی اذان کے ساتھ ہی ہمارے دروازے پر اٹھ دیا نے آکر بانگ دو
 وہ آکھٹا تھا۔ اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ قربانی دے کر نرغہ
 ہو کر آیا ہو۔

میں نے اسے چائے پیش کی۔ تربذی نے ٹوٹا۔
 ”انور کب آرہی ہے؟“

یزدانی نے پوچھا: حقیقت کہاں ہے؟

اٹھ دیا نے کسی بات کا جواب نہ دیا۔ چائے کی چپکی لے کر بولا:

بابو صاحب آزاد نفس کا پتھری شہر میں آکر اڑان بھولی گیا تھا۔ آپ جاننے میں
 بہرہی تو رہیں میں بھی چوڑی بھرتی ہے پھرے میں کتنے دن جے گی۔ میں نے اسے آزاد
 کر دیا۔ قندھاری صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا۔ جسے پیار کرے اسے قید کریں
 رکھے۔ محل میں تمہارے عشق میں خود غرضی کا زہر ملا ہے۔ بابو صاحب! حفیظ صاحب
 کھرے آدمی ہیں انھوں نے میرے اندھ جو آدمی سو رہا تھا اس کو جگا دید میں سوچ
 میں پڑ گیا۔ شریف لوگوں کے لئے بیٹی کو وداع کرنا آسان کام ہے۔ لیکن میں نے
 اپنی بیوی وداع کر دی حفیظ صاحب سے کہا: آپ تو اس علاقے کی زبان جانتے
 ہیں جہاں کا بیٹھنچہ ہے۔ اسی علاقے میں جاکر چھوڑ آئیے، وہ ماں گئے اور میں لوٹ
 آیا۔ اتنا کہہ کر اس نے حفیظ قندھاری کا خط دیا اور سلام کر کے چلا گیا۔
 خط میں لکھا تھا: میں مردان جبار ہوں۔ سوات سے لوٹ کر آ گیا تو خط
 کھوں گا۔ ورنہ خدا حافظ!

اندھ دیا کے جانے کے بعد ہم لوگ خوب بنے حفیظ نے اندھ دیا کی بیگ کاٹ
 ڈالی تھی۔ اب اس کا جی چاہے تو سوات جائے، قندھار جائے یا پشاور کے کسی
 ہوٹل میں ٹھہرا رہے حفیظ کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔
 چار دن کے بعد حفیظ بھی لوٹ آیا۔ اسے دیکھ کر میں حیران ہو گیا۔
 ”تم تو سوات گئے تھے۔“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں مردان سے لوٹ آیا۔“

”اندھ کہاں ہے؟“

”منزل ہوٹل میں۔“

”یہاں کیوں نہیں لائے اسے؟“

”اٹھ دیا کو خبر ہو گئی تو ڈرامہ ہو جائے گا؟“

”اب ارادہ کیا ہے؟“

”ارادہ وہی ہے نکاح کدوں کا؟“

”اتنے دن مردان میں نکاح کے بغیر کیا کرتے رہے؟“

”انہ تو پانچوں وقت نماز پڑھتی رہی، وظیفہ کرتی رہی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔“

وظیفے کے بعد وہ اٹھ سے دھما گئی کہ خدا مجھے سکون دے اور ایک نیک انسان بنے۔“

”اور تم پہلے ہی نیک آدمی بن گئے۔“

”نہیں میں تو جیسا تھا ویسا ہی ہوں، میں نے انہ سے کہا چلو تمہیں گادوں

چھوڑ آؤں۔ وہ نہیں مانی، اس نے کہا میرے قبیلے کے لوگ کسی دھوکے میں نہیں

قتل کروالیں گے۔ مجھے زندہ چھوڑنے والے نہیں۔ میں تو اس نے جبار ہی ہوں کہ

اب اس زندگی کو ختم کر دینا چاہئے۔ نکاح کے لئے وہ راضی نہیں ہوتی تھی۔ کہتی

تھی تم میرے لائق نہیں ہو۔ اور پھر ہنس دیتی۔ آخر میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکا۔

ساتھ لے آیا۔“

تھوڑی دیر بعد ہم سب منزل ہوٹل پہنچ گئے۔ انہ وہاں موجود تھی۔ اتنے

میں نہ جانے اٹھ دیا کہ بھی کیسے معلوم ہو گیا۔ وہ سیدھا منزل ہوٹل آدھنکا۔ اور

آتے ہی بولا۔ سلام بابو صاحب! میں عاقبتاً تھا ایک بار گھوڑے سے بھاگتا تھا۔

دوبارہ گھوڑے میں نہیں جاتا۔ اس نے تمہارے سپرد کر دیا تھا۔ اب مال میرا ہے۔

میں لئے جاتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر اس نے انور سے کہا: ”چلو گھر چلیں“

انور بولی: ”میں نہیں جاؤں گی“

”میں تیری ناک کاٹ ڈالوں گا۔“ دلال نے آخری دھمکی دی۔ اور ہاتھ پکڑنے

کے لئے آگے بڑھا۔ انور نے ہاتھ جھٹک دیا۔

”پریدا“ (دفع ہو) اس نے پشتوں میں ڈانٹا۔

”سرام زادی“ اللہ دیا غصے میں آنکھیں نکال کر آگے بڑھا۔ حنیف نے

اسے روکا۔ یزدانی نے ٹوکا۔ ترمذی اور میں کھڑے ہو گئے۔ اللہ دیا ٹھنڈا چڑ گیا۔

اس نے یزدانی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”مختصروں میں کتنا متفان۔ اخبار رولے خبر کچھ مہوتی ہے۔ چھاپتے کچھ اوٹیں۔

لیکن ہم بھی کبھی ہیں“

اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ یزدانی نے حنیف سے پوچھا۔

”یہ کیا کرے گا؟“

”کیا کرے گا؟ کرم ہی کیا سکتا ہے؟“

ترمذی نے جواب دیا۔ ”ہیرا منڈی کے غنڈوں کو لا سکتا ہے“

”ہم پولیس کو بلا سکتے ہیں“ حنیف نے فوراً کہا۔

یزدانی بولا پہلے اس لڑکی کو یہاں سے کہیں اور بھجوا دینا چاہئے“

حنیف نے میری طرف دیکھا: ”تمہاری ایکٹرس ہیں کے گھر؟“

”وہ تو باہر گئی ہے۔ لاہور میں نہیں ہے۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

حنیف نے فون اٹھایا اور سیلو کے بعد حنیف فارسی بولنے لگا تھڑی۔

بعد ”بے صاحب!“ کہہ کر حفیظ نے فون رکھ دیا اور اس نے کوہ قح پہنا کر تانگوں میں بٹھا کر چلا گیا۔ میں نے پوچھا ”کس لئے جائے گا اسے؟“ ترمذی نے جواب دیا ”آتا زراحد کے گھر“

یزدانی بولا ”وہ سفیر افغانستان کا خاص آدمی ہے؟“
 خاص آدمی کیا نائب سفیر مقیم لاہور کہو؟“ ترمذی نے اس کا تعارف کرایا۔
 میں نے کہا ”یہ کہانی تو سوشل سے ایک دم سیاسی ہوتی جا رہی ہے“
 ”ہو جانے دو۔۔۔ حفیظ چوکھا آدمی ہے۔ وہ نمٹ لے گا“

اسی شام کو منزل ہوٹل کے سامنے تین چار تانگے آکر ٹک گئے۔ میری مٹی کے بد معاش، غنڈے اور پہلوان اتر کر زندنا تے ہوئے ہوٹل کے اندر گھس گئے۔
 ہوٹل کے مالک ظفر زبیری اور امیر پہلوان کالڑ کا فضل الہی حفیظ کے ساتھ بیٹھے ٹپ لڑا رہے تھے۔

آتے ہی ایک غنڈے نے حفیظ کو گھسیٹ لیا۔ حفیظ دھماں یاں آدمی جھلک کر فرش پر آگرا۔ اٹھو یا چلا یا! کہاں ہے انور؟“
 ”حفیظ اٹھ کر کھڑا ہوا اور تانویں بولا ”تم انور کے کیا لگتے ہو؟“

ایک پہلوان نے آگے بڑھ کر کہا ”جانی بچا نا چاہتے ہو تو انور کو ہمارے حوالہ کرو“
 فضل الہی پہلوان پہلے تو بکا بکا دیکھتے رہے پھر یکایک جھڑک اٹھے۔ اور
 سب سے مضبوط پہلوان کے ایک سگٹ مارا۔ وہ ٹکا بازی کہا کر مین پر آگرا پھر فضل الہی
 نے میز اٹھائی تو وہ جیت زمیں پر جا پڑا۔ باقی پہلوان کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔
 فضل الہی نے سب کو گھور کر کہا ”کس کو چاہئے انور؟“

حفیظ قندھاری نے اللہ دیا کو دکھا کر کہا: ”یہ ہے وہ بھڑوا۔“ اللہ دیا۔
اس کو چاہتے انور۔“

فضل الہی کو سب دانتے تھے۔ اس کے باپ امیر پہلوان کے اکھاڑے کی
مشق بھانک کر یہ سب جوان ہوئے تھے اور پہلوان بنے تھے۔ وہ سب اللہ دیا کی
طرف دیکھنے لگے۔

اس نے ہاتھ جوڑ دیتے۔ عاشق نام کے ایک پہلوان نے کہا:
”پاؤ جی۔ (بھائی صاحب) ہمیں کیا معلوم تھا کہ آپ کے پاس ہے ہم
کبھی آئے ہی نہیں۔“

ایک کچھ پہلوان بولا۔ ہم اس کا فیصلہ استام امیر پہلوان کے سامنے کریں
گئے۔ اتنا کہہ کر وہ سب کو لے کر چلا گیا۔

ان کے جانے کے بعد فضل الہی کو خطرے کا احساس ہونے لگا۔
اس نے حفیظ سے کہا۔ یار بابا جان تو مار ڈالیں گے۔ وہ ہمیشہ پھری کرے
باندھے رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ اب میری کمزور چلے گی۔“

حفیظ قندھاری نے کہا: ”گھبراؤ نہیں“ میں پہلوان صاحب سے خود بات
کر لوں گا۔“

دوسرے دن امیر پہلوان کے حجرے میں بیٹھ کر حفیظ نے اللہ دیا کے سامنے
کہا: ”جی جی! یہ معاملہ بڑا سیریس ہے۔ انور غیر علاقے کی لڑکی ہے۔ یہ اس کو
اڑا کر لے آیا ہے اب حکومت افغانستان نے انگریزی سرکار سے پوچھا ہے کہ یہ
لڑکی لاہور میں کیسے پہنچ گئی۔ اور اس وقت وہ افغانستان کے بغیر کے قبضے میں ہے۔“

اللہ دیا نے کہا: اس کا باپ خود نکاح پڑھا کر اسے میرے پاس بھیج دیا گیا ہے۔

وہ میری بیوی ہے۔“

امیر پہلوان سیدھے سارے جہدگ آدمی تھے۔ یہ سب گو رکھ دھندھا جس کو انہیں میں پڑ گئے۔ نکاح، حکومت افغانستان، انگریزی سرکار، فضل اللہی نے جینا کی حمایت کی تو وہ بولے: میان میرا لڑکا تمہاری حمایت کر رہا ہے۔ اس لئے میں تو اس کا فیصلہ کروں گا نہیں کسی اندک بچے بنا دیتا ہوں اور آقا نور احمد چچا آدمی ہے۔ اس کو بھی بلا لیتا ہوں۔ اس معاملے کو سیاسی کہیں بنا رہے ہو۔ اگر وہ اللہ دیا کی بیوی ہے اور اس کے پاس رہنا چاہتی ہے تو کوئی حکومت اسے روک نہیں سکتی۔ اور اگر نہیں رہنا چاہتی تو کوئی قانون رکھ نہیں سکتا۔“

یزدانی صاحب نے کہا: مولانا سلطان محمود کے پاس مسئلے کو بھیج دیجئے؟ سب نے کہا: ہاں وہ نیک آدمی ہیں اور بے لوث ہیں۔ دوسرے دن آقا نور محمد گھر میں مستقل لشکری حفیظ قندھاری کے ساتھ انور کو لے کر مولانا سلطان محمود کے مکان پر آ پہنچے۔ ایک طرف کھڑے بیٹھے۔ اللہ دیا ان کے آگے تھا ہم دوسری طرف بیٹھے۔ حفیظ قندھاری ہمارے سامنے تھا۔ بیچ میں انور بیٹھ گئی۔ مولانا نے پوچھا۔

”بڑی تیرا نام کیا ہے؟“

”انور۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“ انہوں نے اللہ دیا سے سوال کیا۔

”جی، اللہ دیا۔“

”کام کیا کرتے ہو؟“ مولانا نے پوچھا۔

”کام۔؟ جی ہم بھاٹ ہوتے ہیں“ اللہ ربانے جواب دیا۔
 ”میں نے پوچھا ہے کام کیا کرتے ہو؟“ آدمی نے قد کے کڑنگی تھی۔ اللہ ربانے
 نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”جی پہلے میری بہنیں مجھ کو کئی نفیس‘ اب تو حج کرائی ہیں“
 ”سنا تھا چچا گید مولانا نے پہلو بدل کر بیٹھے ہوئے کہا“ تو کیا چاہتا ہے؟“
 اللہ ربانے بولا“ یہ میری بیوی ہے، مجھے ملنی چاہئے“
 ”کیوں بی بی یہ تیرا خاوند ہے؟“ مولانا نے انور سے پوچھا۔
 انور نے جسے زور سے انکار میں سر ہلا کر کہا“ یہ جھوٹ بوقت، ہمارا شادی نہیں ہوئی
 پھر سنا چچا گیا حقیقت نے خوش ہو کھینچ کر طرف دیکھا۔
 مولانا نے پھر پوچھا“ تو اللہ ربانے کے پاس رہنا چاہتی ہے؟“
 انور نے پھر سر ہلا کر کہا“ ہم نہیں رہتا“
 مولانا تنقوڑی دی سب چہروں کو دیکھتے رہے۔ پھر بولے ”اچھا تو کس کے
 پاس رہنا چاہتی ہے؟“

انور نے جھٹ جواب دیا“ حقیقت کے پاس“
 ”حقیقت کون؟“ مولانا نے آغا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
 ”تندھاری نے مسکرا کر کہا“ جی میرا نام حقیقت ہے“
 مولانا نے حقیقت سے پوچھا“ یہ تیری کون ہے۔؟“
 حقیقت“ جی یہ میری.... جی میری....“ کہہ کر لا جواب سا ہو گیا۔ اللہ ربانے
 ہنس پڑا۔ حقیقت نے انور کی طرف دیکھا۔

مولانا نے کہا: بھئی میں یہ جانتا تھا بتا ہوں کہ یہ تیرے پاس کس رشتے سے رہنا چاہیے؟
حفیظ رشتہ کیا بتاتا۔ وہ آج تک تو ایک ہی رشتے کا قائل تھا۔

مولانا نے انور کو مخاطب کر کے کہا: یہ تیرا کوئی لگتا ہے؟

انور نے ایک سانس لیا، پہلو بدلا، اور بولی: یہ حفیظ میرا بھائی لگتا ہے۔

”بھائی!“ میں یزدانی اور ترندی چمک اُٹھے۔

”آہوجی۔۔۔ وازماں دور سے“

مولانا نے کہا: یہ کیا بولتی ہے؟

میں نے پشتو کا ترجمہ کر کے کہا: کتنی ہے۔ ہاں جی! یہ میرا بھائی ہے؟

مولانا نے کہا: تو تو اپنے بھائی کے ساتھ جاسکتی ہے۔ اس کے پاس رہ سکتی

ہے۔ کوئی قانون تجھے نہیں روک سکتا۔ بہن بھائی سے زیادہ پاک مقدس رشتہ کوئی نہیں ہے۔

حفیظ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے انور کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا: رازا کو رتالا ڈھوا،

خود سے (مراؤ نہیں گھر چلیں) اور وہ دونوں باہر اندھیری گلی میں نکل گئے۔

حفیظ قندھاری کہاں گیا؟ انور کہاں ہے؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔ آٹھ دن تک

ہم لوگ سوچتے رہے کہ حفیظ قندھاری صرف ایک رشتے کو ماننے والا آدمی نہیں کہہ کر

مقدمہ جیت کر اور لڑکی لے کر چلا گیا۔ ترندی نے کہا: حفیظ پڑھا لکھا آدمی ہے اور

انگریزی کی اس کماوت کو خوب جانتا ہے۔ ”جنگ اور محبت میں سب کچھ جانتا ہے۔“

یزدانی کہتے: ”لیکن وہ ہندوستانی ہے مسلمان ہے۔“ قول نبیانا جانتا ہے؟

اور میں بالکل ہی الجھن میں پڑ گیا۔ حفیظ قندھاری کے کردار سے ایک طرح کی نفرت ہوئی۔

ایک دن صبح موندہ اندھیرے گھر کے نیچے ایک ٹرک آکر رکا۔ حفیظ قندھاری

ایک بُتِ قلع پوش لڑکی کے ساتھ اور پرکاش لڑکی اندر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تنہا لڑکی نے کہا نیچے لڑکی میں سامان رکھا ہے میرے ساتھ چلو، سامان اُتار کر اوپر لائیں؟

”سامان کیسا؟“

”جینز ہے“ حنیف نے کہا۔

”جینز؟“

”کہاں سے لائے؟“

”بازار سے خرید کر لایا ہوں۔ آج شام کو نکاح ہے۔ چار بجے برات آئے گی منزل ہوٹل میں دعوت کا انتظام کر دیا ہے؟“

برات آئے گی کہ جائے گی؟“ میں نے سوال کیا۔

حنیف نے کہا: ”آئے گی ہمارے گھر اور میری بہن کی شادی ہوگی اس گھر میں“

”متنہادی بہن؟“ میں نے پوچھا۔

”انور۔ میری بہن“ حنیف نے سنجیدگی سے کہا۔

یزدانی نے میری طرف دیکھا۔ میں فروغ پر سر کچا کر بیٹھ گیا۔

”خود ہی نے کہا؟ لڑکا کون ہے میاں؟“

”ابراہیم پیلوان؟“

”وہ جو ریلوے میں نوکر ہے؟ فضل الملکی کا منہ نہ ہر لہجائی خوب صورت جوان آدمی؟“

جواہر پیلوان کے گھر میں ہی رہتا ہے؟

”ہاں۔“ آتا کہہ کر حنیف نیچے چلا گیا، اور جینز کا سامان اُتارنے لگا۔

”شمع“ دہلی